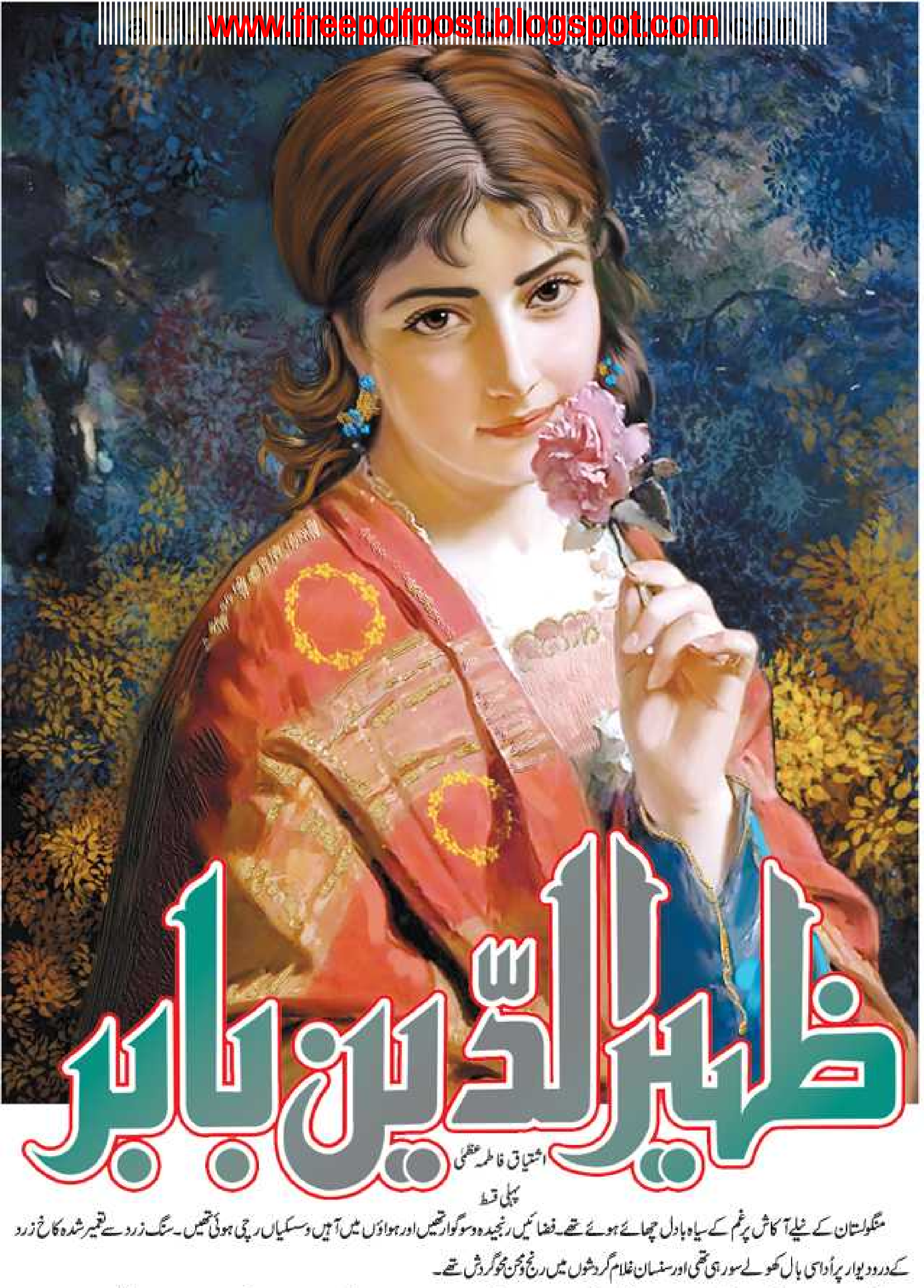

ظہیر الدین بابر

اشتیاق فاطمہ عظمیٰ

پہلی قسط

منگولستان کے نیلے آکاش پر غم کے سیاہ بادل چھائے ہوئے تھے۔ فضائیں رنجیدہ و سوگوار تھیں اور ہواؤں میں آہیں و سسکیاں رچی ہوئی تھیں۔ سنگ زرد سے تعمیر شدہ کاخ زرد کے درودیوار پر اُداسی بال کھولے سو رہی تھی اور سنسان غلام گردشوں میں رنج و محن محو گردش تھے۔

منگولستان کا خاقان، یونس خان محل کی نشست گاہ میں مخملی گاؤ تکیوں کے سہارے پشم کے نمدے پر بیٹھا تھا۔ اس کی بڑی بڑی ذہین آنکھوں سے وحشت ہویدا تھی اور پُر جلال چہرے پر ملال کے سائے لرزاں تھے۔ اس کے مقابل ریشمی توشکوں پر چند درباری امیر اور اس کا مشیر خاص خدا بیردی تیمور تاش سر جھکائے افسردہ و دل گرفتہ سا بیٹھا تھا۔ یہ سب لوگ خاقان یونس خان کو اس کے عزیز دوست ہمدم و محسن تیموری حکمران سلطان ابو سعید مرزا کی ''تباہی عراق'' کے سانحے میں مقتول ہونے پر تعزیت کے لئے آئے تھے۔

سلطان ابو سعید مرزا نے کئی معرکوں میں زک اٹھانے کے بعد آخر کار ماوراءالنہر فتح کرنے میں کامیابی حاصل کر لی تھی جو اس کے چچا کی ملکیت تھا۔ پھر خراسان کو فتح کر کے مکران اور سندھ تک اپنی سلطنت کی توسیع کر لی۔ اس کی حکمرانی ہرات تک تھی اور پچھلے بیس سالوں سے وہ اپنی اس وسیع سلطنت پر بڑی کامیابی اور مطلق العنانی سے حکومت کر رہا تھا کہ اس علاقے کے دو ترکمان قبیلوں کے ایک جھگڑے کو طے کرنے کی غرض سے اس نے صوبہ آذربائیجان میں داخل ہونے کے لئے ایک خطرناک راستے کا انتخاب کیا اور اپنے پورے لشکر کے ساتھ اردبیل کی تنگ گھاٹی میں پھنس گیا اور نہ صرف وہ خود جان سے گیا بلکہ اس کا بڑا لشکر بھی موت کے گھاٹ اترا۔ صرف چند لوگ یہ اندوہناک خبر سنانے کے لئے زندہ واپس لوٹ سکے۔

''سنا ہے کہ اس گھاٹی میں موت کا ایسا کھیل کھیلا گیا کہ......'' ایک بوڑھا سردار بات مکمل کئے بغیر دہل کر چپ ہو گیا۔

''ہاں۔'' یونس خان نے کرب بھرے انداز میں سر ہلایا۔ ''موت کا ایسا ڈراؤنا کھیل، ایسا قتل عام کہ یہ دن طویل عرصے تک بھلایا نہ جا سکے گا۔ ماوراءالنہر میں یہ ایک ایسا نقطہ زمانی ٹھہرے گا کہ جس سے دیگر تاریخوں کا شمار کیا جائے گا۔''

''آپ کے بھائی جیسے دوست اور مربی کی اس حادثاتی موت پر افسوس ہے۔'' خدا بیردی تیمور تاش نے دھیمی آواز میں اپنے احساسات کا اظہار کیا۔ ''اب سلطان کی وسیع سلطنت اس کے بیٹوں میں بٹ جائے گی۔''

''ہوں۔'' یونس خان نے پُر سوچ انداز میں کہا۔

''سردار۔'' تیمور تاش نے ایک ذرا توقف کے بعد کہنا شروع کیا۔ ''آپ سلطان ابو سعید سے دوستی اور محبت کا تعلق رکھتے تھے، ان کے بیٹے بھی آپ کی بے حد عزت کرتے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ اس مشکل وقت میں آپ ان کے لئے بہت کچھ کر سکتے ہیں۔''

''میں جو بھی کر سکا، ضرور کروں گا۔'' یونس خان نے دکھ بھرے لہجے میں کہا۔ ''سلطان میرا مربی، دوست اور محسن تھا۔ اگر اس کی حمایت اور محبت میرے ساتھ نہ ہوتی تو یقیناً میں آج بھی بدخشاں کے خان عبداللہ مرزا کی چاکری میں ہوتا۔ سترہ سال میں نے وہاں غریب الوطنی میں بتائے۔''

یونس خان کی اداس آنکھوں کی افسردگی ماضی کی یادوں میں گھل کر کچھ اور گہری ہو گئی تھی۔ گزرے وقت کی پرچھائیاں اس کے ذہن کے پردے پر لرزاں تھیں اور وہ نیم وا آنکھوں سے ماضی کے گورستان میں یادوں کے کتبے تلاش کر رہا تھا۔

وہ اس وقت صرف سترہ سال کا تھا جب اس کے باپ ویس خان کا انتقال ہوا۔ ویس خان منگولستان کا خاقان تھا۔ بڑا بیٹا ہونے کے ناتے تخت و تاج پر اسی کا حق تھا۔ مگر کچھ ابن الوقت قسم کے سرداروں نے اس کے چھوٹے بھائی بوغا خان کو خاقان بنانے کی سازش شروع کر دی تھی۔ اس طرح پورا منگولستان دو بڑے گروہوں میں بٹ گیا تھا۔ اس کے حق میں جو گروہ تھا، اس کی تعداد بہت کم تھی۔

یونس خان کی ماں ترک تھی اور اس کا باپ امیر تیمور کا ایک قابل احترام سردار تھا۔ وہ ایک نیک اور محبت کرنے والی عورت تھی اور اپنے بیٹے یونس خان سے وہ بے پناہ محبت کرتی تھی۔ اسی کے کہنے پر وہ اپنے حامیوں کو لے کر خان الغ بیگ مرزا کے پاس حصول انصاف کی غرض سے گیا تھا۔

''او...... تو تم ویس خان مرحوم کے بڑے بیٹے ہو؟'' الغ بیگ مرزا نے اپنی شاطر آنکھیں اس کے چہرے پر جماتے ہوئے پوچھا۔ وہ ایک بے حد موٹا، سرخ و سفید اور چاق و چوبند انسان تھا۔ اس وقت وہ کسی فربہ دنبے کی طرح عنابی رنگ کے اونی نمدے پر نیم دراز تھا۔

''یہ بات روز روشن کی طرح عیاں ہے اور خان الغ بیگ اس بات سے ناواقف نہیں۔'' یونس خان نے اپنا غصہ ضبط کرتے ہوئے جواب دیا۔ ''بڑا بیٹا ہونے کے ناتے مملکت کے تخت و تاج پر میرا حق فائق ہے۔ اس لئے میری آپ سے گزارش ہے کہ مجھے میرا حق دلانے میں میری مدد فرمائیں۔''

''میں تو اتنا جانتا ہوں۔'' الغ خان نے اپنا تھل تھل کرتا پُر گوشت بازو ہوا میں لہراتے ہوئے کہا۔ ''جو گھوڑے کی پشت پر سوار ہو کر اسے قابو کر لے گھوڑا اسی کا ہے۔''

''گویا آپ ابو بوغا خان کی حرکت کو درست قرار دے رہے ہیں؟'' یونس خان کے ساتھ آئے ہوئے ایک عمر رسیدہ مغل نے قدرے غصے سے سوال کیا۔

''ہاں۔'' الغ خان نے بنا کسی پس و پیش کے واضح اور صاف آواز میں جواب دیا۔ ''اگر منگولستان کی رعایا نے بوغا خان کو اپنا خاقان تسلیم کر لیا ہے تو اب کسی کو اس پر اعتراض کرنے کا کوئی حق نہیں۔''

الغ خان کے ظالمانہ فیصلے نے یونس خان کی آخری آس بھی توڑ دی تھی۔ الغ خان کے حکم پر ساتھ آئے اس کے کتنے ہی حامیوں کو جیل میں ٹھونس دیا گیا اور کچھ کو یہ علاقہ چھوڑ کر راہ فرار اختیار کرنے پر مجبور کر دیا گیا۔

''یونس خان! تمہارے لئے میرا مشورہ یہ ہے کہ تم یہاں سے کوچ کر جاؤ۔'' الغ خان نے یونس خان کے متوحش چہرے کی طرف دیکھ کر مضحکہ اڑانے والے انداز میں کہا۔ ''بدخشاں یا شیراز کے سلطان کے دربار میں تمہیں ضرور ملازمت مل جائے گی۔''

جوانی کا جوش اور چنگیزی خون تھا۔ یونس خان اس طرح اپنا وطن چھوڑ کر جانے کے لئے تیار نہ تھا مگر اس موقع پر بھی اس کی باشعور ماں مخدومہ خاتون نے اسے سمجھایا۔ ''دنیا بدر ہونے سے بہتر ہے ملک بدر ہو جایا جائے۔''

''مگر ماں......'' یونس خان پس و پیش اور کشمکش کا شکار تھا۔ ''میرے بعد تم اکیلی کس طرح رہ سکو گی؟''

''اندجان کے مضافاتی علاقے میں میری ایک رشتے کی بہن اسمارہ خاتون رہتی ہے۔'' مخدومہ خاتون نے دھیمے لہجے میں کہا۔ ''تم مجھے اس کے پاس چھوڑ دو۔ مجھے امید ہے کہ جلد ہی یہ مشکل وقت بیت جائے گا۔''

وہ اپنی ماں کو رشتے کی خالہ کے گھر چھوڑ کر بدخشاں چلا آیا۔ یہاں خان عبداللہ کے دربار میں اسے ملازمت مل گئی۔ وقت اپنی مخصوص رفتار سے آگے بڑھتا رہا۔ سال پر سال گزرتے رہے۔ سال دو سال میں وہ اندجان جا کر ماں سے مل آتا تھا۔

دیکھتے ہی دیکھتے سترہ برس بیت گئے۔ ان برسوں میں اسے اس حوالے سے بڑا فائدہ ہوا۔ اسے سیکھنے اور تعلیم و تربیت کے مواقع حاصل ہوئے۔ اس کی خانہ بدوشوں والی غیر شائستہ حرکتیں اور عادتیں چھوٹ گئیں جن کے باعث اس کے خاندان کے محکوم خانہ بدوش قبائل ذلت کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے۔ اب اس نے تعلیم یافتہ، مہذب و شائستہ ایرانیوں جیسے طور طریقے سیکھ لئے تھے۔ اس نے سمجھ لیا کہ شاید اب بقیہ زندگی اسی طرح غریب الوطنی میں گزرے گی۔ انہی دنوں اسے اس کی ماں مخدومہ خاتون کی علالت کی خبر ملی۔ وہ خبر ملتے ہی ماں سے ملنے کے لئے روانہ ہو گیا۔

اپنے گھوڑے کی پشت پر سوار جب وہ فرغانہ کے شمالی جنگلات میں داخل ہوا تو سورج کا ارغوانی گولہ دن بھر کی مسافرت کے بعد تھکن سے چور مغرب کے دامن میں پناہ گزین ہونے کی تیاری کر رہا تھا۔ نیلا آسمان ڈوبتے سورج کی سرخی سے لہو رنگ ہو رہا تھا، پرندے چہچہاتے، غل مچاتے اپنے آشیانوں کی طرف محو پرواز تھے۔ ہوا کے نرم جھونکوں میں تناور اور گھنے پیڑ دھیرے دھیرے جھوم رہے تھے۔

وہ تیز رفتاری سے آگے بڑھتا جا رہا تھا۔ تب ہی اچانک وہ اپنے گھوڑے کی باگیں کھینچ کر رک جانے پر مجبور ہو گیا۔ اس نے دیکھا کہ اس سے کچھ فاصلے پر ایک شخص تن تنہا خنجر سے ایک خونخوار بھیڑیئے کا مقابلہ کر رہا ہے۔ جسیم اور توانا بھیڑیئے نے اپنے نوکیلے پنجوں اور تیز دانتوں سے اس شخص کو لہولہان کر دیا تھا۔ اس سے قبل کہ بھیڑیا پوری طرح اس پر حاوی آتا، یونس خان اپنا خنجر نکال کر اس کی جانب لپکا اور زخمی شخص کو ایک جانب کر کے وہ بھیڑیئے کے مقابلے میں ڈٹ گیا اور جلد ہی اس نے خنجر کے پے در پے وار سے اس خونخوار درندے کو ڈھیر کر دیا۔

اس طرف سے نبٹ کر وہ زخمی کی جانب پلٹا۔ وہ شخص زخموں سے چور زمین پر پڑا ہانپ رہا تھا۔ یونس خان نے اپنے مشکیزے سے اسے پانی پلایا اور زخم صاف کر کے کپڑے سے ڈھانپ دیا۔

''میں تمہارا بے حد شکر گزار ہوں۔'' حواس درست ہونے کے بعد زخمی نے ممنون لہجے میں کہا۔ ''اگر تم بروقت نہ پہنچتے تو یقیناً وہ بھیڑیا میرا کام تمام کر دیتا۔''

''مارنے والے سے وہ اوپر والا بڑا بچانے والا ہے۔'' یونس خان نے انکساری سے جواب دیا۔ ''میرے شکر گزار ہونے کی بجائے اس رب کا شکر ادا کرو جس نے تمہیں نئی زندگی دی...... مگر تم اس گھنے جنگل میں اکیلے کیا کر رہے تھے؟''

یونس خان کے پوچھنے پر زخمی نے بتایا۔ ''میرا نام ابو سعید مرزا ہے۔ میں فرغانہ کے والی سلطان محمد مرزا کا بیٹا ہوں۔ ساتھیوں کے ساتھ شکار کھیلنے نکلا تھا۔ ان سے بچھڑنے کے بعد راستہ ڈھونڈ رہا تھا کہ یہ بھیڑیا حملہ آور ہو گیا اور تم نے آ کر میری جان بچالی۔ دوست تمہارا یہ قرض میری جان پر رہے گا۔ اب تم پوری زندگی مجھے اپنا بہی خواہ اور دوست پاؤ گے۔''

اور اس پل سے اس کی اور ابو سعید مرزا کی دوستی کا آغاز ہوا تھا۔

اسی زمانے میں یونس خان کے بھائی بوغا خان نے موقع پا کر فرغانہ کو کند بادام تک تخت و تاراج کر کے اندجان پر قبضہ کر لیا تھا۔ سلطان محمد مرزا اس کی ان گھٹیا حرکتوں سے سخت عاجز تھا اور اکثر کہتا تھا۔ ''بوغا خان اس قابل تھا ہی نہیں کہ اسے منگولستان کا خاقان بنایا جاتا۔ کاش اس کی جگہ یونس خان وہاں کا حاکم ہوتا۔''

یونس خان سے دوستی کا ہاتھ ملانے کے بعد اب ولی عہد شہزادہ ابو سعید مرزا بھی اسی خیال کا حامی تھا۔ چنانچہ جب وہ بادشاہ بنا تو اس نے ایک بڑا لشکر تشکیل دیا اور اسیرہ کے مقام پر بوغا خان سے معرکہ آراء ہوا۔ گھمسان کا رن پڑا اور آخر کار بوغا خان شکست کا طوق گلے میں لٹکائے راہ فرار اختیار کرنے پر مجبور ہو گیا۔

اب وقت آ گیا تھا کہ وہ اپنے دوست یونس خان کو اس کا حق لوٹا سکے۔ چنانچہ اس نے یونس خان کو بدخشاں سے بلوایا۔ بہت اہتمام و احترام سے اس کا استقبال کیا۔ اس استقبال میں ساغرچی قبائل کی بہت بڑی تعداد بھی شامل تھی۔ اس قبیلے کے لوگ خاقان، بوغا خان سے برگشتہ ہو کر فرغانہ کی طرف چلے آئے تھے۔ یونس خان اپنے ہم وطنوں سے مل کر بے حد خوش ہوا۔

ساغرچی قبیلے کا سردار حاجی بیگ کو شائستہ، مہذب اور تعلیم یافتہ یونس خان بے حد پسند آیا تھا اور اس نے اسی وقت اپنی حسین، ذہین اور تعلیم یافتہ بیٹی ایسن دولت بیگم کی شادی یونس خان سے کرنے کا فیصلہ کر لیا۔

چند دنوں میں ابو سعید مرزا نے نہایت دھوم دھام سے اپنے دوست کی شادی ایسن دولت بیگم سے کروادی۔ منگولوں کی رسم کے مطابق یونس خان اور ایسن دولت بیگم کو سفید نمدے پر بٹھا کر منگولوں کا خاقان تسلیم کر لیا گیا۔

یونس خان ابو سعید مرزا کی دوستی کا دل سے معترف اور اس کا بے حد شکر گزار تھا کہ اس کی مدد اور حمایت کی وجہ سے اسے اس کی لٹی جاگیر اور چھینی گئی سلطنت واپس مل گئی تھی اور ایسن دولت بیگم جیسی باشعور، باوقار اور باوفا خاتون سے اس کی شادی بھی ہو گئی تھی۔

وقت گزرتا رہا۔ اب وہ یکے بعد دیگرے تین بیٹوں اور دو بیٹیوں کا باپ بن چکا تھا۔ یونس خان کے دونوں بیٹے محمود مرزا اور احمد مرزا، اس کی بیٹیوں سے چھوٹے تھے۔ مگر ابو سعید مرزا کے تینوں بیٹے بڑے اور باشعور تھے۔ وہ ابو سعید کے بیٹوں سے بے حد محبت کرتا تھا۔ اس کے بیٹے بھی اس سے بے حد عزت و احترام سے پیش آتے تھے اور اس کی ہر بات کو مثل باپ مان لیتے تھے۔

وقت گزرنے کے ساتھ یونس خان اور ابو سعید مرزا کی دوستی اور محبت میں اضافہ ہوا تھا۔ خاص طور پر یونس خان ہمیشہ ہی مرزا کا ممنون احسان رہا تھا۔ وہ اس سے سگے بھائی سے بڑھ کر محبت کرتا تھا۔

وقت گزرتا رہا۔ بچے بچپن کی پگڈنڈی پر چلتے جوانی کی وادی میں داخل ہو گئے۔ ابو سعید کے تینوں بیٹے احمد مرزا، محمود مرزا اور عمر سعید مرزا اب خوبرو اور توانا جوان بن چکے تھے۔ خاص طور پر ابو سعید کا منجھلا بیٹا عمر سعید مرزا اپنی ستھری عادات، بہادری اور دلاوری کی بنا پر یونس خان کو بے حد پسند تھا حالانکہ ابو سعید کے سارے ہی بچے یونس خان کی بے حد عزت و تکریم کرتے اور اخلاص و الفت سے پیش آتے تھے۔ اسے اپنا بزرگ اور باپ کا عزیز دوست مان کر اس کی ہر بات پر سر تسلیم خم کر دیتے تھے۔ ابو سعید کے سارے بیٹے مختلف ماؤں کے بطن سے تھے اور ان کی ماؤں نے اپنی طرز پر ان کی تربیت کر کے ان سب کے دل میں ایک دوسرے کے لئے نفرت اور فاصلہ پیدا کر دیا تھا۔ مگر یونس خان سے سب ہی کا رویہ بے حد عزت و تکریم اور مربیانہ و دوستانہ تھا۔

انہی دنوں ابو سعید کی بڑی بیٹی خداوند زادہ کی شادی کی تقریب کا انعقاد ہوا تھا۔ یونس خان، بیوی ایسن دولت بیگم اور اپنی تینوں بیٹیوں مہر نگار خانم، قتلق نگار خانم اور سلطان نگار خانم اور دونوں بیٹوں محمود مرزا اور احمد مرزا کے ساتھ اس تقریب میں شرکت کے لئے خصوصی طور پر اندجان پہنچا تھا۔

اسے اور اس کے اہل خانہ کو نہایت عزت و احترام سے شاہی مہمان خانے میں رکھا گیا تھا۔ محل کے سامنے مرغزاروں میں، جریری خیموں میں شادی کا جشن بپا تھا۔ ایک وسیع و عریض خیمے میں طعام کا انتظام کیا گیا تھا۔

ایسن دولت بیگم مرزا کی ملکہ سلطان شاہ بیگم کے ساتھ تقریب کی رعنائیوں سے لطف اندوز ہو رہی تھی۔ دونوں چھوٹے بیٹے باہر کھیل کود میں مصروف تھے جبکہ تینوں بیٹیاں خادمہ خجستہ خانم کے ساتھ خواتین والے خیمے میں بیٹھی تھیں۔

اس کی تینوں بیٹیاں الگ الگ مزاج کی مالک تھیں۔ سب سے بڑی مہر نگار خانم، اس کی پیدائش کے دس ماہ بعد ہی قتلق نگار خانم پیدا ہو گئی تھی۔ شاید اس لئے اسے پوری توجہ اور محبت نہ مل سکی تھی جس کے باعث اس کے مزاج میں بڑی گرمی اور تلخی تھی۔ وہ ایک اکھڑ مزاج اور تند خو لڑکی تھی۔ ہر بات میں کیڑے نکالنا اور ہر بات کا تاریک پہلو دیکھنا اس کی عادت تھی۔ آج تک اس کی کسی سے نہیں بنی تھی۔ محل کے خدام اور خادماؤں سے لے کر اپنے بہن بھائیوں تک سب ہی سے وہ بیزار رہتی تھی۔

سب سے چھوٹی بیٹی سلطان نگار خانم ایک چنچل اور خوش مزاج لڑکی تھی۔ بذلہ سنج اور ہنس مکھ تھی۔ ہر وقت ہنستے مسکراتے رہنا اس کی عادت تھی۔ اس کی سب سے بنتی تھی، خاص طور پر اپنی منجھلی بہن قتلق نگار خانم سے تو اس کی بے حد دوستی تھی۔

یونس خان کی منجھلی بیٹی قتلق نگار خانم اپنے سب بھائی بہنوں میں سب سے زیادہ خوبصورت اور نیک خصلت تھی۔ وہ ایک سادہ لوح، محبت کرنے والی فرماں بردار لڑکی تھی۔ وہ اپنے ماں باپ اور بہن بھائیوں سے ہی نہیں، سب ہی لوگوں سے محبت اور عزت سے پیش آتی تھی۔ اپنے چلن اور اخلاق و کردار کی وجہ سے وہ اپنے ماں باپ کو بھی بے حد عزیز تھی۔ خاص طور پر یونس خان اپنی اس بیٹی سے حد درجہ محبت کرتا تھا۔

اس شام جب یونس خان کا پورا خاندان مرزا کی بیٹی کی شادی میں شرکت کے لئے اندجان میں موجود تھا...... تو قتلق نگار خانم اچانک ہی اپنی جگہ سے اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔

''کہاں؟'' خادمہ خجستہ خانم نے حیرت سے پوچھا۔

''مجھے بھوک لگ رہی ہے۔'' قتلق نگار خانم نے دھیمی اور نرم آواز میں جواب دیا۔ ''ذرا طعام گاہ تک جا رہی ہوں۔'' پھر وہ سلطان نگار خانم کی طرف پلٹ کر بولی۔ ''سلطان خانم! کیا تم بھی ساتھ چلنا پسند کرو گی؟''

اس کی بڑی بہن مہر نگار خانم چہرے پر نخوت اور بیزاری لئے برے برے منہ بنا کر چاروں طرف تک رہی تھی۔ اس لئے اس نے اس سے پوچھنے کی ضرورت محسوس نہیں کی کیونکہ جانتی تھی وہ فوراً ہی منع کر دے گی۔

''میرا خیال ہے تم خجستہ کے ساتھ چلی جاؤ۔'' سلطان نگار خانم نے معذرت خواہانہ لہجے میں کہا۔ ''مجھے ابھی بالکل بھوک محسوس نہیں ہو رہی۔''

''ٹھیک ہے۔'' قتلق نگار خانم نے خادمہ کی طرف دیکھا جو پہلے ہی اٹھ کر آگے بڑھ گئی تھی۔

وہ خجستہ کے ساتھ بڑے خیمے سے نکل کر باہر کھلے علاقے میں آ گئی۔ دور تک سبز گھاس کا مخملی فرش بچھا تھا اور جا بجا خوشبودار، خوش رنگ پھولوں کے تختے اور کیاریاں لہلہا رہے تھے۔ یہ ابو سعید کے محل کا باغیچہ تھا۔ سامنے کی جانب ایک بڑا ریشمی دیدہ زیب خیمہ تنا ہوا تھا، اسی میں طعام کا انتظام کیا گیا تھا۔

خیمے سے اشتہا انگیز کھانوں کی خوشبوئیں ہوا میں شامل ہو کر فضا کو مہکا رہی تھیں۔ قتلق نگار خانم، خجستہ کو ساتھ لئے اس خیمے کی طرف بڑھی۔ تب ہی اچانک کسی جانب سے کوئی شخص نکل کر ایک دم سامنے آ گیا۔

آکاش کی نیلی جھیل میں ہلکورے لیتے چاند کی سنہری کنول کی مدھم چاندنی میں وہ آنے والے شخص کو دیکھ نہ سکی تھی اور بے ساختہ اس سے بری طرح ٹکرا گئی تھی۔ اس سے قبل کہ وہ زمین پر گرتی، اجنبی نے اسے اپنے مضبوط بازوؤں میں سنبھال لیا تھا۔ چاندنی کے خوابناک مدھم اُجالے میں اس نے اپنی حیران آنکھوں سے اس شخص کی طرف دیکھا۔ وہ بڑی بڑی خمار آلود آنکھوں والا ایک وجیہ نوجوان تھا۔ اس کی شفاف اور کشادہ پیشانی پر قتلق نگار خانم کے طلائی جھومر کی خراش بے حد واضح تھی جس سے خون رستا دکھائی دے رہا تھا۔

''عمر سعید مرزا۔'' خادمہ شہزادے کو پہچان کر خوفزدہ لہجے میں بولی۔

اس نے ایک بار چونک کر پھر نگاہیں اٹھائیں اور اس کی پُر شوق نگاہیں اس سرخ و سفید، باوقار و شاندار نوجوان کی حیران اور پُر تجسس نگاہوں سے جا ٹکرائی تھیں۔ نظروں کے اس تصادم سے دونوں کو ہی اپنے رگ و پے میں ایک نیا سا، انوکھا سا احساس جاگتا محسوس ہوا تھا۔

وہ ایک دم گھبرا کر اس کے مضبوط بازوؤں کے حصار سے باہر آتے ہوئے بولی۔ ''میں شرمندہ ہوں۔'' پھر اس نے نگاہ اٹھا کر آن کی آن عمر سعید مرزا کی دمکتی پیشانی پر رستی خراش کی طرف دیکھا اور جلدی سے نگاہیں جھکا کر شرمسار اور ملتجی لہجے میں کہا۔ ''میری وجہ سے آپ کو زخم آ گیا، مجھے معاف فرما دیجیے۔''

یہ کہتے ہی وہ واپسی کے لئے پلٹ گئی تھی۔

''ارے سنئے تو......'' شہزادے عمر سعید مرزا نے پیشانی کی خراش کو ٹٹولتے ہوئے اسے پکارا۔ ''اپنا نام تو بتاتی جائیے۔ مجھے معلوم تو ہونا چاہئے کہ آخر مجھے زخم دینے والی یہ ماہ لقا کون ہے؟''

''شہزادے! کمال ہے آپ نے پہچانا نہیں۔'' ادھیڑ عمر خادمہ خجستہ آگے قدم بڑھاتے بڑھاتے تھم گئی تھی۔ ''یہ آپ کے والد آقا ابو سعید کے عزیز دوست خاقان یونس خان کی منجھلی شہزادی قتلق نگار خانم ہیں۔ بچپن میں تو آپ لوگ ایک ساتھ کھیلے ہیں مگر بڑے ہونے کے بعد...... آج برسوں بعد پہلی بار ملاقات ہوئی ہے۔''

یہ ملاقات بھی عجب ملاقات تھی۔ یوں اچانک سر راہ مل کر وہ دونوں گویا اپنے آپ سے جدا ہو گئے تھے۔ ہنستی مسکراتی قتلق خانم جب دوبارہ خیمے میں داخل ہوئی تو بے حد خاموش اور کچھ پریشان سی تھی۔ لگ رہا تھا جیسے اس کی کوئی قیمتی شے کہیں کھو گئی ہے۔

''کیا ہوا؟'' خیمے کے دروازے پر اس کی چھوٹی بہن سلطان نگار خانم کھڑی حیران نظروں سے اس کی متغیر کیفیت کو دیکھ رہی تھی۔ ''تم طعام گاہ جا رہی تھیں، پھر واپس کیوں آ گئیں؟''

''بس یونہی......'' قتلق نگار خانم نے نگاہیں چراتے ہوئے دھیمے لہجے میں جواب دیا۔ ''بھوک ختم ہو گئی ہے، اسی لئے واپس آ گئی۔''

''یہ بھوک شہزادے سے ٹکرانے کی وجہ سے تو ختم نہیں ہوئی؟'' سلطان نگار خانم نے شوخ لہجے میں سرگوشی کی۔ ''مگر سچ، اس کی بانہوں میں سمٹی تم بہت خوبصورت لگ رہی تھیں۔''

''تم نے کیسے دیکھا؟'' قتلق نگار خانم نے گھبرائے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

''تمہارے جاتے ہی میں نے سوچا کہ آپا مہر نگار خانم کے پاس بیٹھنے سے بہتر ہے میں بھی تمہارے ساتھ چل دوں۔'' سلطان نگار نے وضاحت کی۔ ''اور جوں ہی میں یہاں دروازے تک پہنچی تو تمہیں شہزادے عمر سعید کی بانہوں میں سمٹے دیکھ کر ٹھٹک کر رک گئی۔''

''اچھا سنو، اس حادثے کے بارے میں کسی کو پتا نہ چلے۔'' قتلق نگار نے خوفزدہ انداز میں بہن کو متنبہ کیا۔ ''کسی کو پتا چلا تو بہت بدنامی ہو گی۔''

''تم بھی نگاہیں نیچی رکھنا۔'' سلطان نگار نے شریر لہجے میں سرگوشی کی۔ ''نگاہ اٹھاؤ گی تو سب کو اس کی تصویر نظر آ جائے گی۔'' وہ شوخ انداز میں ہنسی اور بولی۔ ''اور ہاں اپنی دھڑکنوں کو سنبھال کر رکھو ورنہ سب تمہاری دھڑکنوں میں گونجتا اس کا نام سن لیں گے۔''

قتلق نگار نے نگاہیں جھکا کر اپنا دل تھام لیا تھا۔

ابو سعید مرزا کی بیٹی کی شادی کی تقریب سے شرکت کے بعد واپس آنے پر سب کچھ جوں کا توں تھا، مگر قتلق نگار کی دنیا ہی بدل گئی تھی۔ وہ اجنبی، انجانا شہزادہ اس کے خوابوں میں بس گیا تھا۔ اس کی نوخیز اور نو آمیز دھڑکنوں میں سما گیا تھا۔ نہ دن کو قرار تھا، نہ رات کو نیند...... ایسے میں اس کی بہن سلطان نگار ہی اس کی ہمراز و دمساز تھی۔

''حوصلہ رکھو قتلق نگار۔'' سلطان نگار اسے سمجھاتی۔ ''محبت اپنا راستہ خود بنا لیتی ہے۔ تمہارے جذبے میں اگر صداقت ہوئی تو یقین رکھو کچے دھاگے سے آئیں گے سرکار بندھے......''

''پتا نہیں وہ اس انداز میں سوچتے بھی ہوں گے یا نہیں۔'' قتلق نگار کی آواز اندیشوں اور وسوسوں میں ڈوبی ہوئی تھی۔

''اس ہلکی سی ملاقات کا اگر تم پر اتنا اثر ہے تو وہ اس کے تاثر سے کسی طرح بچ سکتے ہیں۔'' سلطان نگار نے جواب دیا۔ ''یقین رکھو، وہ بھی تمہارے لئے اسی طرح مضطرب اور بے کل ہوں گے۔''

سلطان نگار خانم کا اندازہ بالکل درست تھا۔ محبت کی انجانی آگ جو قتلق نگار خانم کے وجود کو سلگا رہی تھی، شہزادہ عمر سعید مرزا بھی اس ان دیکھی انوکھی آگ کی تپش سے جھلس رہا تھا...... شب و روز نگاہوں میں وہی معصوم چہرہ گھومتا تھا اور دل و ذہن میں ایک ہی نام گونجتا محسوس ہوتا...... ''قتلق نگار خانم۔''

اس صبح وہ اپنے والد ابو سعید کے ساتھ فرغانہ کے شمالی جنگلات میں شکار کی غرض سے گئے تھے۔ دن بھر کی شکار کی مصروفیت کے بعد شب بسری کے لئے دونوں باپ بیٹا ایک ہی خیمے میں دراز تھے، تب جواں سال بیٹے کی بڑبڑاہٹ سے سلطان ابو سعید مرزا کی آنکھ کھل گئی تھی۔ وہ جلدی سے اٹھ کر شہزادے کی طرف متوجہ ہو گیا تھا۔ شہزادے عمر سعید کے غلافی پپوٹوں کے اس پار گھنی پلکوں کے پیچھے ایک انوکھا دلفریب سپنا ہلکورے لے رہا تھا۔ اس سرسبز و شاداب جنگل میں گھنے پیڑوں کے بیچ اسے وہی ماہ لقا دکھائی دے رہی تھی۔

''قتلق نگار خانم۔'' اس نے حیرت سے اسے پکارا...... ''تم یہاں کہاں؟''

اس نے پلٹ کر اپنی غزالی آنکھوں سے اس کی جانب دیکھا اور پھر آگے کی جانب چل دی تھی۔

''قتلق نگار خانم۔'' عمر سعید مرزا بوکھلائے ہوئے انداز میں اس کی جانب لپکا۔ ''اب تم یہاں آ ہی گئی ہو تو مجھے چھوڑ کر مت جاؤ۔ میرے دل کی بے قراریوں کی داستان سنو۔ جب سے میں نے تمہیں دیکھا ہے، اس دل کا عجب عالم ہے۔ تم میری نیندوں میں، میرے خوابوں میں، میری دھڑکنوں میں اور میری سانسوں میں بس گئی ہو۔''

مگر وہ رکی نہیں، آگے ہی آگے بڑھتی رہی تھی۔ وہ دیوانہ وار اسے پکارتا اس کی جانب دوڑا۔ ''قتلق نگار خانم! سنو...... میں تمہارے بغیر نہیں رہ سکتا، مجھے اس طرح چھوڑ کر مت جاؤ...... قتلق نگار خانم۔''

بیٹے کی بڑبڑاہٹ میں یہ نام بڑا واضح تھا۔ ابو سعید مرزا حیران نظروں سے بیٹے کو تکے جا رہا تھا۔ پھر وہ تکیے پر سر رکھ کر گہری سوچ میں ڈوب گیا تھا۔ یہ نام اس کے لئے نیا یا اجنبی نہ تھا۔ وہ جانتا تھا یہ نام اس کے عزیز دوست یونس خان کی منجھلی بیٹی کا ہے۔ قتلق نگار خانم ایک بے حد اچھی لڑکی تھی۔ اپنے ماں باپ کی بہت چہیتی تھی۔ خود اسے بھی بے حد پسند اور عزیز تھی۔ وہ اسے اپنی بہو بنا کر اپنے گھر لانا چاہتا تھا۔ مگر آج شہزادے عمر سعید کی بڑبڑاہٹ نے اس کے لئے فیصلہ آسان کر دیا تھا۔

اور اگلے دن ہی اس نے شہزادے سے کہا تھا۔ ''شہزادے! میں سوچ رہا ہوں تمہارا رشتہ طے کر دیا جائے۔''

''جی۔'' شہزادے عمر سعید کے چہرے پر ایک رنگ سا آ کر گزر گیا۔ ''مگر بابا جان۔''

''اگر مگر کچھ نہیں۔'' سلطان ابو سعید مرزا مسکرایا۔ ''میں نے اپنے عزیز دوست یونس خان کی منجھلی بیٹی قتلق نگار خانم کو تمہارے لئے منتخب کر لیا ہے...... اگر تمہیں کوئی اعتراض نہ ہو تو آج شام ہی میں یونس خان کے پاس پیغام بھیجوں؟''

''بابا جان۔'' شہزادہ دمکتے چہرے اور روشن آنکھوں کے ساتھ فرط مسرت سے باپ سے لپٹ گیا تھا۔

سلطان ابو سعید مرزا نے اسی شام ایک قاصد کے ذریعے یونس خان کو مکتوب بھجوایا۔ ''یونس خان، میں جانتا ہوں تم میرے سب بچوں اور خاص طور پر میرے بیٹوں سے بہت انسیت رکھتے ہو۔ مگر شہزادے عمر سعید مرزا سے تم مثل اپنے بیٹوں کے الفت کرتے ہو۔ مجھے بھی تمہارے سارے بچے عزیز ہیں، خاص طور پر تمہاری منجھلی بیٹی قتلق نگار خانم مجھے بے حد پسند ہے۔ اس وقت اس مکتوب کے ذریعے میں تم سے تمہاری چہیتی بیٹی قتلق نگار خانم کا ہاتھ اپنے لائق و فائق بیٹے عمر سعید مرزا کے لئے مانگ رہا ہوں۔ امید ہے تم دوستی اور تعلق کو ملحوظ خاطر رکھتے ہوئے مجھے مایوس نہ کرو گے۔''

خط پڑھ کر یونس خان کا دل بلیوں اچھلنے لگا تھا۔ یہ اس کی بھی دلی تمنا تھی۔ وہ اپنی لاڈلی بیٹی کے لئے کسی عمر سعید جیسے شاندار لڑکے کا ہی متمنی تھا۔ اب وہ جلد از جلد یہ اچھی خبر اپنی شریک حیات ایسن دولت بیگم کو سنانا چاہتا تھا۔ گو کہ اسے یقین تھا کہ اسے بھی یہ رشتہ پسند آئے گا مگر پھر بھی اس کی رائے لئے بنا وہ کوئی فیصلہ نہیں کرنا چاہتا تھا۔

وہ خط ہاتھ میں لئے ملکہ کے کمرے کی طرف چل دیا۔ اس کے پیچھے اس کے خنجر بردار حفاظتی خدمت گار ہو لیے۔ ملکہ کے کمرے کے سامنے پہنچتے ہی دروازے پر متعین پہریداروں نے سر جھکا کر خاقان کو تعظیم پیش کی اور مؤدبانہ دروازہ وا کر دیا۔ یونس خان کے خدام دروازے پر ہی ٹھہر گئے اور وہ خود سر اونچا کئے شاہانہ وقار اور مکمل استحقاق کے ساتھ اپنی چہیتی بیگم کے کمرے میں داخل ہو گیا تھا۔

اس وقت ملکہ ایسن دولت بیگم، دیوار کے ساتھ ساتھ دور تک چلے گئے ریشم و مخمل کے آمیزش سے بنے خوش نما اور آرام دہ صوفوں میں سے ایک پر بیٹھی تھی۔ اس طرح کی نشست خود ملکہ کی اختراع تھی ورنہ اس دور میں زیادہ تر فرشی نشست ہی مستعمل تھی۔ ملکہ ایک تعلیم یافتہ، ذہین، دور اندیش اور زیرک خاتون تھی اور حکمران منگولستان یونس خان اس کی خوبیوں کا دل سے معترف تھا۔ وہ کسی معاملے میں ملکہ کی رائے لئے بغیر فیصلہ کرنے کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا اور اس وقت وہ اپنی شریف النفس بیٹی قتلق نگار خانم کے عقد کے سلسلے میں فیصلے سے قبل اس کی رائے لینے آیا تھا۔

''خان اعظم۔'' ملکہ محبت کرنے والے شوہر کو دیکھ کر اپنی نشست سے احتراماً اٹھ کھڑی ہوئی۔ ''زہے نصیب آپ تشریف لائے۔''

''بیگم! تم تو واقف ہو، تم سے دور رہ کر ہمارا گزارہ ہو ہی نہیں سکتا۔'' یونس خان نے اس کے گلابی رخسار کو انگلی سے چھو کر اپنی چاہت کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔ ''اور جب کوئی اہم مسئلہ آ پڑے تو تمہاری خدمت میں حاضر ہونا لازمی ہو جاتا ہے۔''

''خیر تو ہے؟'' ملکہ یونس خان کے مسرت و انبساط سے دمکتے چہرے کو دیکھ کر معنی خیز شوخی سے بولی۔ ''آج بہت مسرور دکھائی دے رہے ہیں۔''

''ہاں۔'' یونس خان نے مسرور سے انداز میں سر ہلایا۔ ''خبر تو واقعی خوشی کی ہے۔ تم سنو گی تو تم بھی شاد ہو اٹھو گی۔''

ٹھیک اسی پل چھوٹی شہزادی سلطان نگار خانم دروازے پر پہنچی۔ اس سے قبل کہ وہ دروازہ کھول کر اندر داخل ہوتی، اندر سے آتی یونس خان کی خوشی کے رس میں ڈوبی آواز سن کر وہیں ٹھٹک کر رک گئی۔

''میرے دوست، میرے محسن نے ہماری بیٹی قتلق نگار خانم کا رشتہ اپنے بیٹے عمر سعید مرزا کے لئے مانگا ہے۔'' یونس خان کی مسرور آواز ایسن دولت بیگم سے زیادہ دروازے پر موجود سلطان نگار خانم کو متحیر کر گئی تھی۔

''تمہیں بھی ابو سعید کا یہ منجھلا بیٹا بہت عزیز ہے نا؟''

''جی۔'' بیگم نے حیرت بھری مسرت سے شوہر کی طرف دیکھا۔ ''واقعی یہ تو بڑی خوشی کی خبر ہے۔ ان کا عقد کا کب تک ارادہ ہے؟''

''میرا خیال ہے اس میں تھوڑا وقت لگے گا۔'' یونس خان نے پُر سوچ لہجے میں بتایا۔ ''ابھی پچھلے ہفتے جب ملاقات ہوئی تھی تو بتا رہے تھے کہ ان ترکمانوں کے ایک جھگڑے کو طے کرنے کی غرض سے صوبہ آذربائیجان جانے کا ارادہ ہے۔'' یونس خان دم بھر کو دم لینے کو رکا۔ پھر اپنی بات آگے بڑھائی۔ ''اس لئے قرین قیاس یہی ہے کہ آذربائیجان سے واپسی کے بعد ہی یہ سلسلہ آگے بڑھے گا۔ البتہ تمہاری اجازت سے میں آج ہی اپنی رضامندی کا مکتوب روانہ کئے دیتا ہوں۔''

سلطان نگار خانم سے دروازے پر کھڑا رہنا مشکل ہو گیا۔ یہ انہونی مگر حیرت انگیز اور مسرت آمیز خبر اس کی سماعت کی راہ، اس کے دل میں گدگدی مچا رہی تھی۔ وہ یہ پُر مسرت خبر جلد از جلد قتلق نگار خانم کو سنانا چاہتی تھی۔ سو وہ تیزی سے اپنے کمرے کی جانب پلٹی تھی۔

سلطان نگار خانم اور قتلق نگار خانم کی عمروں میں صرف دس ماہ کا فرق تھا۔ شاید یہی وجہ تھی کہ وہ قتلق نگار کا نام لیتی تھی اور دونوں میں بے حد دوستی اور ذہنی ہم آہنگی تھی۔ وہ دونوں اپنی کوئی بات ایک دوسرے سے چھپا نہیں پاتی تھیں۔ البتہ سب سے بڑی شہزادی مہر نگار خانم سے اس کے اکھڑ اور غصیلے مزاج کی وجہ سے وہ دونوں ذرا دور دور ہی رہتی تھیں اور سامنا ہوتا تو بے حد محتاط طریقے سے عزت و تکریم سے پیش آتی تھیں، مبادا ان کی کوئی بات مزاج دار شہزادی کے مزاج پر گراں گزرے اور ان دونوں کی شامت آ جائے۔

سلطان نگار جب کمرے میں داخل ہوئی تو اس پل قتلق نگار دریچے میں کھڑی پائیں باغ میں، پر پھڑپھڑاتے، یہاں سے وہاں پرواز کرتے، چہچہاتے طیور کی اور تک رہی تھی۔

''قتلق نگار...... کہاں ہو تم؟'' سلطان نگار تیزی سے اس کی طرف لپکی۔ ''یہ دریچے میں کھڑی کیا تک رہی ہو؟''

''سلطان نگار۔'' قتلق نگار نے کھوئے کھوئے افسردہ لہجے میں کہا۔ ''یہ طیور بھی کتنے خوش نصیب ہوتے ہیں، ہر پابندی و مجبوری سے آزاد پنکھ پسارے جہاں چاہتے ہیں پرواز کر جاتے ہیں...... مگر ہم انسان......''

''ہم انسان بھی اب ایسے کچھ مجبور اور پابند نہیں رہے۔'' سلطان نگار خانم معنی خیز انداز میں مسکرائی۔ ''ابھی میں تمہیں جو خبر دینے والی ہوں، اسے سنو گی تو تمہارے دل و دماغ ساتویں آسمان پر اڑنے لگیں گے۔''

اور واقعی، خبر سن کر قتلق نگار خانم مسرت و انبساط کے ساگر میں ڈوب گئی تھی۔ رشتہ طے ہو گیا تھا۔ ایسن دولت بیگم نے تیاریاں شروع کر دی تھیں۔

اسی دوران سلطان ابو سعید مرزا اپنا لشکر لے کر آذربائیجان کی طرف روانہ ہوا اور اردبیل کی تنگ گھاٹی میں پھنس گیا۔ نہ صرف وہ خود ختم ہو گیا بلکہ اس کی بے شمار فوج میں سے صرف چند لوگ یہ اندوہناک خبر سنانے کے لئے زندہ واپس آئے۔

اپنی نشست گاہ کی اداس فضا میں، یونس خان اس پل اپنے عزیز دوست کی افسوسناک موت پر تعزیت بٹور رہا تھا۔

کچھ ہی دیر بعد وہ فرغانہ کے لئے روانہ ہو گیا۔ اس کے جواں سال بیٹوں کی مدد اور دست گیری کے لئے اس وقت اس کا ان کے پاس ہونا بے حد ضروری تھا۔

سلطان ابو سعید کی آخری رسوم کے بعد سلطنت کے امراء، وزراء اور خود یونس خان کے سامنے سلطنت کی تقسیم کا سوال آیا تھا۔ سلطان مرحوم کے تینوں بیٹے اسے اپنا بزرگ اور بڑا مانتے تھے۔ مگر اب اس کا عمر سعید سے رشتہ تبدیل ہو چکا تھا۔ عمر سعید مرزا اس کا ہونے والا داماد تھا۔ اسی لئے اس نے فوری طور پر اپنے دوست کے بقیہ دونوں بیٹوں کے عقد میں اپنی بقیہ دونوں بیٹیاں دینے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ سلطان احمد مرزا سے اپنی بڑی بیٹی مہر نگار خانم، سلطان محمود مرزا سے سب سے چھوٹی بیٹی سلطان نگار خانم سے جبکہ منجھلی بیٹی قتلق نگار خانم کا رشتہ پہلے ہی منجھلے بیٹے عمر سعید مرزا سے طے ہو چکا تھا۔

جلد ہی نہایت سادگی سے تینوں شہزادوں کا عقد یونس خان کی تینوں شہزادیوں سے ہو گیا تھا۔

دم رخصت سلطان نگار خانم اور قتلق نگار خانم تو خوش تھیں مگر مہر نگار خانم حسب عادت سخت خفا اور ناخوش تھی۔

''بابا جان کو بھی خدا جانے کیا سوجھی، اس غصیلے اور جھگڑالو احمد مرزا سے میرے عقد کا فیصلہ کر لیا۔'' وہ بہنوں کے سامنے غصے سے کہہ رہی تھی۔ ''بتاؤ اس کی تو اپنے بھائیوں سے نہیں بنتی، مجھ سے کیا بنے گی؟''

''کوئی ان سے پوچھے، خود ان کی کبھی کسی سے بنی ہے؟'' سلطان نگار نے شوخ لہجے میں قتلق نگار کے کان میں سرگوشی کی۔

''ویسے آپا کی بات ایسی کچھ غلط بھی نہیں ہے۔'' قتلق نگار کی سرگوشی سے فکر مندی عیاں تھی۔ ''تم جانتی ہو یہ تینوں بھائی الگ الگ تین ماؤں سے ہیں۔ ان کی ماؤں نے ان کی کچھ اس انداز میں تربیت کی ہے...... وہ ایک دوسرے سے حسد، نفرت اور دوری کا شکار ہیں۔''

''یقیناً بابا جان نے ہم تینوں بہنوں کو ان تینوں کے عقد میں اسی لئے دیا ہے کہ ہم تینوں اس نئے رشتے کے ساتھ ان کی پرانی رنجش، چپقلش اور نفرت دھو کر ان میں باہم حسن سلوک اور دوستی و محبت کے جذبات پیدا کر سکیں۔''

چند دنوں میں ہی سلطنت ابو سعید مرزا کے بیٹوں میں تقسیم ہو گئی اور سارے بیٹے خود مختار حکمران ہو گئے۔ سب سے بڑا بیٹا سلطان احمد مرزا قلب سلطنت پر قابض ہونے میں کامیاب ہو گیا۔ اس میں معروف صوبے سمرقند و بخارا بھی شامل تھے جن کے نام ہی ثقافت، عیش و عشرت اور دولت و ثروت کے ہم معنی سمجھے جاتے تھے۔

تیسرا بیٹا محمود مرزا بدخشاں و ختلان اور ہندوکش اور اسفرہ پہاڑوں کے درمیان واقع دیگر صوبوں کا حکمران بن گیا۔

منجھلے بیٹے عمر سعید مرزا کے حصے میں فرغانہ کی سلطنت آئی۔

فرغانہ، جو اب روسی ترکستان کا تقریباً پچاس ہزار مربع میل وسیع ایک چھوٹا سا صوبہ ہے۔ یہ ایک زرخیز علاقہ ہے، عمدہ آب و ہوا کے باعث غلوں اور میوؤں کی پیداوار بافراط ہے اور شمالی جنگلوں میں چھوٹے شکار بکثرت ملتے ہیں۔ اس کی مغرب کی سمت چھوڑ کر باقی تین اطراف بلند و بالا پہاڑ ہیں اور ان پہاڑوں سے نکل کر عظیم دریا سیحوں مغرب سے مشرق کی سمت بہتا ہے اور کوہستانی حلقے سے گھرے میدان کو دو غیر مساوی حصوں میں اس طرح بانٹ دیتا ہے کہ فرغانہ کے سات اضلاع میں سے دو دریا کے شمال اور پانچ جنوب میں واقع نظر آتے ہیں۔ سلطان عمر سعید مرزا کا فرغانہ کم و بیش آج جیسا ہی تھا۔

دریا کے جنوب میں واقع شہر اندجان ہمیشہ سے اس سلطنت کا پایہ تخت رہا تھا۔ اس وقت یہ ایک محفوظ اور قلعہ بند جگہ تھی۔

فرغانہ کے پایہ تخت اندجان کے خوبصورت محل میں قتلق نگار خانم اپنے خوابوں کے شہزادے سلطان عمر سعید مرزا کے ساتھ قیام پذیر تھی۔ وہ اپنی اس نئی دنیا میں بے حد خوش تھی۔ گو کہ وہ اور سلطان نگار خانم کوشش کے باوجود بھائیوں کے مابین موجود نفرت اور دوری دور نہیں کر سکی تھیں۔ مگر یہ دونوں اپنے شوہروں کے دلوں میں اپنے لئے بے حد جگہ بنا چکی تھیں۔ مگر توقع کے عین مطابق مہر نگار خانم اپنے شوہر سلطان احمد مرزا سے ذہنی ہم آہنگی پیدا نہ کر سکی تھی۔ عام طور پر شوہر سے جھگڑے ہی رہتے تھے۔ تمام عمر اولاد کی نعمت سے محروم رہی۔

مگر شادی کے کچھ عرصے بعد قتلق نگار خانم امید سے ہو گئی تھی۔ جوں ہی یہ خبر سلطان نگار خانم کو ہوئی تو وہ خوشی سے نہال بہن کو مبارکباد دینے پہنچ گئی تھی۔

''سچ قتلق نگار، سن کر بے حد خوشی ہوئی۔ بابا جان اور والدہ بھی بے حد خوش ہیں، جلد ہی خلعتیں و سوغات شیرینی و میوہ جات کے ساتھ تمہیں اور سلطان عمر سعید مرزا کو مبارکباد دینے کے لئے آنے والے ہیں۔''

''سچ۔'' قتلق نگار کی حسین اور بے ریا آنکھوں میں خوشی روشنی بن کر دمکنے لگی۔ ''ان کی آمد پر میں ہی نہیں، سلطان محترم بھی بے حد خوش ہوں گے۔''

''ان کی آمد پر تو سلطان محترم خوش ہوں۔'' سلطان نگار نے شرارت سے آنکھیں مٹکا کر اس کے پیٹ پر ہاتھ رکھتے ہوئے شوخ لہجے میں سوال کیا۔ ''مگر ان کی آمد پر وہ کتنے شاداب ہیں، کچھ اس کا بھی تو احوال دو؟''

''بہت خوش ہیں۔'' قتلق نگار خانم شرمیلی آواز میں بولی۔ ''بچے کا نام بھی سوچ لیا ہے۔''

''اچھا۔'' سلطان نگار حیران ہوئی۔ ''کیا نام سوچا ہے؟''

''محمد ظہیر الدین......'' قتلق نگار خانم نے حیا بار نگاہیں جھکا کر لجاتے ہوئے جواب دیا۔ ''انہیں یقین ہے کہ اللہ انہیں ولی عہد سے بھی سرفراز کرے گا۔''

''اور تمہیں؟'' سلطان نگار نے بہن کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے پوچھا۔

''مجھے اپنے خدا پر اور اپنے مزاجی خدا کی ہر بات پر یقین ہے۔'' قتلق نگار خانم نے پورے یقین سے جواب دیا۔ ''ان شاء اللہ شہزادہ محمد ظہیر الدین ضرور دنیا میں تشریف لائیں گے۔''

''چلو تو پھر مجھ سے بھی ایک وعدہ کر لو۔'' سلطان نگار خانم مسرور سے لہجے میں بولی۔ ''اگر خدا نے مجھے بیٹی دی تو ہم اپنے بچوں کا باہم رشتہ کر لیں گے۔''

''کیا تم بھی امید سے ہو؟'' قتلق نگار نے حیران و مسرور لہجے میں سوال کیا۔

''ابھی تو نہیں۔'' سلطان نگار حسب عادت شوخ انداز میں مسکرائی۔ ''مگر خدا کی ذات سے امید ہے کہ جلد ہی میں بھی امید سے ہو جاؤں گی۔ اب تمہاری شہزادے کو اپنا داماد بنانا ہے تو پھر...... ایسا ہونا تو ضروری ہے نا......''

''سلطان نگار! تم بھی نا......'' قتلق نگار بہن کو گلے لگا کر بے ساختہ ہنس پڑی تھی۔

اندجان میں بنفشے اور انجیر کے پیڑوں سے گھرے قرمزی پتھر سے تعمیر شدہ محل میں ایک روشن اور تابناک صبح قدم رنجہ ہو چکی تھی۔ ابھرتے سورج کی نارنجی و ارغوانی کرنیں محل کے چوباروں اور میناروں کو جگمگا رہی تھیں۔ صبح صادق کا اجالا طلائی غبار کی طرح پورے شہر کو اپنے حصار میں لیتا جا رہا تھا۔ ہواؤں میں ایک تسکین آمیز سا انبساط بھرا احساس رچا ہوا تھا۔

محل کے اندرونی کمروں میں سے ایک کمرے میں ملکہ قتلق نگار خانم تخلیق کے کربناک مراحل سے گزر رہی تھی...... اور محل کی نشست گاہ میں سلطان عمر سعید مرزا اپنے محسن و مربی خسر یونس خان کے ساتھ بیٹے کی ولادت کی خبر سننے کے لئے بے چین و منتظر تھا۔

14 فروری 1483ء کا جمعے کا وہ مبارک دن، آہستہ روی سے آگے بڑھ رہا تھا۔ نماز جمعہ کے وقت کا احساس کر کے سلطان عمر سعید مرزا اور خاقان یونس خان نماز کی تیاری میں لگ گئے تھے۔

ادھر نماز جمعہ کی اذان بلند ہوئی، ادھر ملکہ کے کمرے کی اندیشوں اور اذیتوں میں ڈوبی فضا میں نومولود کے رونے کی مترنم و دل افزاء آواز گونجی۔ ایسن دولت بیگم اور سلطان نگار خانم نے پہلے ایک دوسرے کی طرف پھر نومولود کی طرف دیکھا۔

''مبارک ہو آپ سب کو...... بیٹا ہوا ہے۔'' بوڑھی اور مشاق دایہ نے بچے کی خالہ اور نانی کی مشتاق نظروں کے سوال کو سمجھ کر جواب دیا۔ ''بے حد پیارا اور توانا بچہ ہے۔ خدا نے چاہا تو سلطان کا نام روشن کرے گا اور سلطنت کو وسعت دے کر وسیع کر دے گا۔''

''آمین۔'' ایسن دولت بیگم نے دعائیہ انداز میں سر ہلایا اور اپنی انگلی سے زمرد کی انگوٹھی اتار کر دایہ کی طرف بڑھا دی۔ ''اسے رکھ لو...... یہ تمہارا انعام ہے۔''

(جاری ہے)

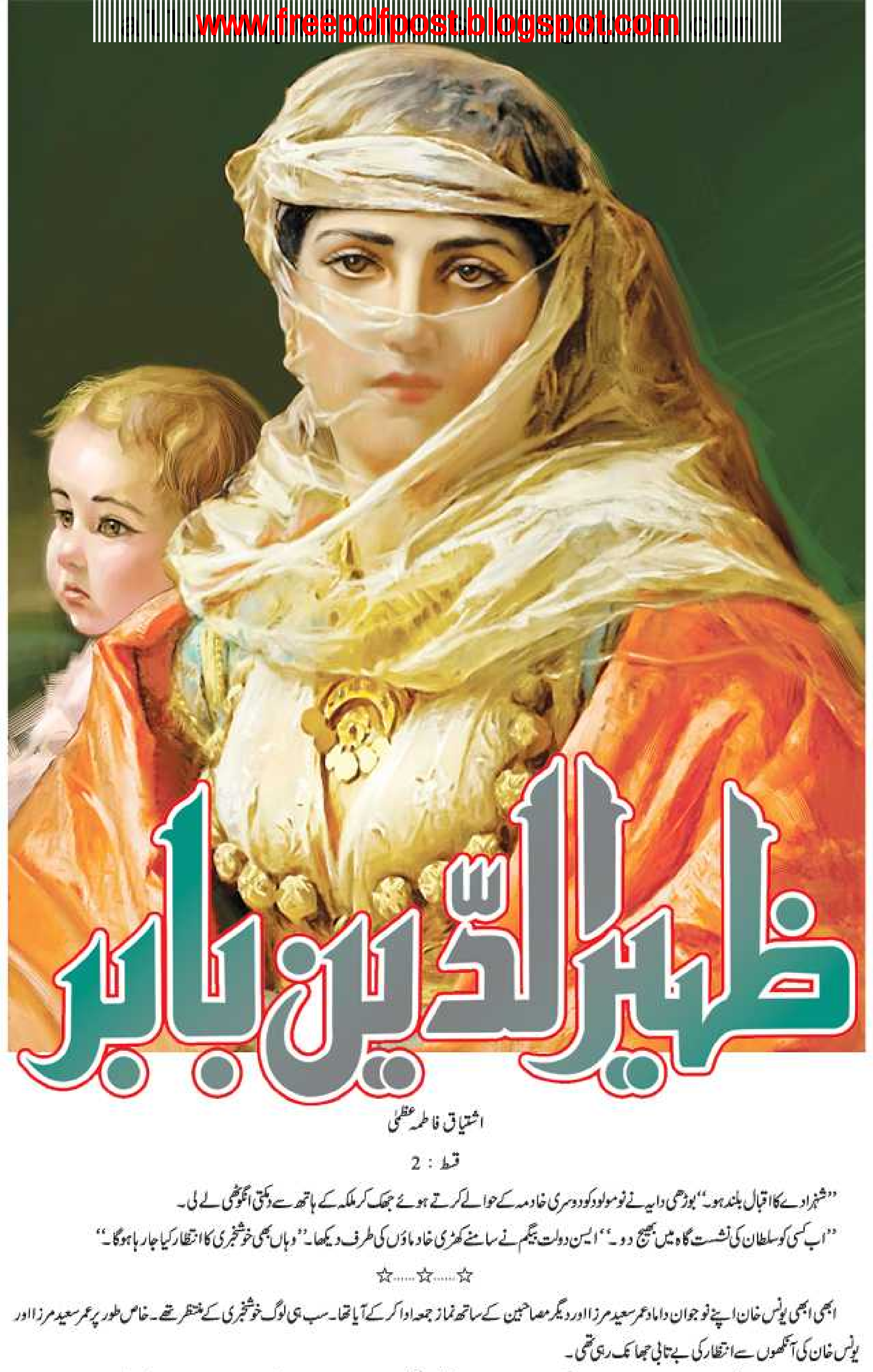

ظہیرالدین بابر

اشتیاق فاطمہ عظمیٰ

قسط : 2

''شہزادے کا اقبال بلند ہو۔'' بوڑھی دایہ نے نومولود کو دوسری خادمہ کے حوالے کرتے ہوئے جھک کر ملکہ کے ہاتھ سے دمکتی انگوٹھی لے لی۔

''اب کسی کو سلطان کی نشست گاہ میں بھیج دو۔'' ایسن دولت بیگم نے سامنے کھڑی خادماؤں کی طرف دیکھا۔ ''وہاں بھی خوشخبری کا انتظار کیا جا رہا ہوگا۔''

☆......☆......☆

ابھی ابھی یونس خان اپنے نوجوان داماد عمر سعید مرزا اور دیگر مصاحبین کے ساتھ نماز جمعہ ادا کر کے آیا تھا۔ سب ہی لوگ خوشخبری کے منتظر تھے۔ خاص طور پر عمر سعید مرزا اور یونس خان کی آنکھوں سے انتظار کی بے تابی جھانک رہی تھی۔

''اب تو خاصی دیر ہو گئی۔'' سلطان عمر سعید مرزا نے ادھ کھلے دریچے سے اس پار پھیلی، چمکتی دھوپ سے وقت کا اندازہ کرتے ہوئے بے چین لہجے میں کہا۔

''ان شاء اللہ اب مزید دیر نہیں ہوگی۔'' خاقان یونس خان نے بزرگانہ انداز میں پُر یقین لہجے میں کہا۔ ''بس خوشخبری آیا ہی چاہتی ہے۔''

ابھی اس کا جملہ مکمل نہ ہو پایا تھا کہ ادھیڑ عمر خادمہ دروازے پر نمودار ہوئی۔ تیز تیز چلنے کے باعث اس کی سانس پھول گئی تھی اور فرط مسرت سے اس کا چہرہ تمتما رہا تھا۔

''سلطان معظم، مبارک ہو۔'' خادمہ ادب سے جھکتی ہوئی پُر مسرت لہجے میں بولی۔ ''شہزادے معظم، تشریف لا چکے ہیں۔''

''کیا؟'' سلطان عمر سعید نے بے یقین لہجے میں پوچھا۔ ''شہزادہ؟''

''جی۔'' خادمہ نے پُر یقین انداز میں سر ہلایا۔ ''خدا نے سلطان معظم کو چاند سا بیٹا عطا کیا ہے۔ اس عظیم سلطنت کے لئے ولی عہد تشریف لے آئے ہیں۔''

''مبارک ہو۔'' یونس خان نے پہلے خادمہ پھر عمر سعید مرزا کی طرف دیکھ کر جوش بھرے لہجے میں کہا۔ ''مبارک ہو سلطان۔ خدا نے آپ کو بیٹا عطا کیا ہے۔'' اس کا صحت مند چہرہ فرط مسرت سے جگمگا رہا تھا۔

''آپ کو بھی مبارک ہو۔'' سلطان عمر سعید مرزا نے مؤدبانہ قدرے جھکتے ہوئے سسر کو مخاطب کیا۔ ''آپ نانا بن گئے ہیں۔''

''شکر ہے اس رب العزت کا۔'' یونس خان نے دونوں ہاتھ آسمان کی طرف اٹھا کر ممنون نظروں سے اوپر کی طرف دیکھا۔ پھر اس نے اپنے گلے سے سچے موتیوں کی ایک مالا اُتار کر خادمہ کی طرف بڑھاتے ہوئے ممنون لہجے میں کہا۔ ''تمہارا شکریہ کہ تم نے ہم تک یہ خوش کن خبر پہنچائی۔ یہ حقیر تحفہ قبول کیجئے۔''

''خان اعظم کا اقبال بلند ہو۔'' خادمہ نے جھک کر موتیوں کا ہار لیتے ہوئے انتہائی مسرت بھرے لہجے میں کہا۔ ''خان کے لئے ہمیشہ یہ نواسہ عزت و تکریم اور مسرت و انبساط کا باعث ہو۔''

''ان شاء اللہ ایسا ہی ہوگا۔'' یونس خان داماد کی طرف متوجہ ہوا۔ ''عمر مرزا! میرا دل کہہ رہا ہے...... تمہارا یہ لخت جگر ہم سب کے لئے عزت و افتخار کا باعث ہوگا۔'' یہ کہہ کر یونس خان نے مشفق انداز میں بازو پھیلائے۔

''خدا آپ کی زبان مبارک کرے۔'' عمر سعید مرزا اس کے کھلے بازوؤں میں سما گیا۔ اس پل یونس خان کو اپنے عزیز دوست ابو سعید مرزا کی بہت یاد آ رہی تھی۔ کاش اس خوشی کے وقت وہ بھی موجود ہوتا۔ وہ اپنی برگ نسل کے اوّلین کو دیکھ کر کس قدر شاد ہوتا۔

نشست گاہ میں موجود سب ہی لوگ سلطان اور اس کے خسر کو مبارکباد دینے میں مصروف ہو گئے تھے۔ نشست گاہ کی خاموش فضا مبارک سلامت کی مسرت آمیز آوازوں سے گونج اٹھی تھی۔

اگلے ہی لمحے خدام چاندی کی ٹرے میں منقش گلاسوں میں مشروب اور چاندی کی رکابوں میں لذیذ شیرینی لئے آ حاضر ہوئے تھے۔

''کیا ہم نومولود کو دیکھ سکتے ہیں؟'' خادمہ کو واپسی کے لئے پَر تولتے دیکھ کر یونس خان نے سوال کیا۔

''ابھی کچھ ہی دیر میں ملکہ عالیہ کو ان کی خواب گاہ میں منتقل کر دیا جائے گا۔''

کچھ دیر بعد یونس خان اور سلطان عمر سعید مرزا نومولود شہزادے کے دیدار کے لئے بے تابانہ ملکہ کی خواب گاہ کی طرف جا رہے تھے۔ دونوں کے انداز سے تجسس اور اشتیاق بھری بے تابی ہویدا تھی۔ آنکھوں میں شوق اور چاہت کی قندیلیں روشن تھیں۔

''باادب! سلطان معظم، خان یونس خان کے ساتھ تشریف لا رہے ہیں۔'' دروازے پر متعین چوب داروں میں سے ایک نے باآواز بلند دونوں کی آمد کا اعلان کیا...... اور یہ اعلان سنتے ہی خواب گاہ میں موجود دائیاں اور خادمائیں مؤدب و مستعد ہو کر کھڑی ہو گئی تھیں۔

کمرے میں پہلے یونس خان داخل ہوا۔ اس کے پیچھے سلطنت کا والی اور شہزادے کا پدر گرامی سلطان عمر سعید مرزا۔

سامنے ہی کشادہ مسہری پر ملکہ قتلق نگار خانم لیٹی تھی۔ کل رات سے وہ اذیت اور تکلیف میں مبتلا تھی۔ تخلیق کے کرب نے اس کے نازک وجود کو تھکن اور اذیت میں مبتلا کر دیا تھا۔ مگر شہزادے کی آمد کے بعد وہ کرب و اذیت، خوشی، طمانیت اور راحت میں تبدیل ہو گئی تھی۔ بے حد چاہنے والے شوہر کی آمد پر اس کے سپید رخسار ارغوانی رنگ میں ڈھل گئے تھے اور شنگرفی لبوں پر پیار بھری مسکراہٹ بکھر گئی تھی۔ محترم والد کو سامنے دیکھ کر بار حیا سے اس کی گھنی پلکیں دہکتے رخساروں پر جھک گئی تھیں۔

ایسن دولت بیگم نے ننھے نواسے کو پہلے اپنے شوہر یعنی بچے کے نانا کی طرف بڑھایا۔

''ماشاء اللہ۔'' یونس خان نے بچے کے حسین و پُر جلال چہرے پر نگاہ پڑتے ہی پیار بھرے لہجے میں کہا۔ ''مجھے یقین ہے ہمارا یہ شہزادہ ایک پُر جلال شہنشاہ بنے گا اور باپ، دادا اور نانا کے نام کو عزت بخشے گا۔''

''آمین۔'' سب ہی خادماؤں اور ملکہ ایسن دولت بیگم نے باآواز بلند کہا۔

پھر یونس خان نے بچے کے کان میں اذان دی۔ اس کے بعد اس نے نیلے لبادے میں لپٹے سرخ و سفید شہزادے کو اس کے باپ، سلطان عمر سعید مرزا کی طرف بڑھایا۔

''ماشاء اللہ۔'' سلطان کا چہرہ مسرت و انبساط سے تمتما رہا تھا۔ اپنے ولی عہد کو آغوش میں لے کر اسے ایک نئی اور انوکھی خوشی کا احساس ہو رہا تھا۔

اسی شام یونس خان نے اپنے دونوں دامادوں سلطان احمد مرزا اور سلطان محمود مرزا کے گھروں میں شیرینی کے ٹوکرے کے ساتھ اپنے پہلے نواسے کی آمد کی خبر بھیجی تھی۔

سلطان عمر سعید مرزا کا بڑا بھائی سلطان احمد سعید مرزا جو اس کی بیوی قتلق نگار خانم کی بڑی بہن مہر نگار خانم کا شوہر بھی تھا، یہ خبر سن کر خاصا بے مزہ ہوا تھا۔ اس نے غصیلی نظروں سے اپنی بدمزاج اور غصہ ور بیوی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''تمہیں یہ خبر سن کر خوشی ہونا ہو مگر شرم ضرور آنی چاہئے۔ تم سے چھوٹی بہن بیٹے کی ماں بن گئی اور تم اب تک خزاں رسیدہ درخت کی طرح ٹنڈ منڈ ہو۔''

''شاید تم بھول رہے ہو۔'' مہر نگار خانم نے اینٹ کا جواب پتھر سے دیا۔ ''بچے کا باپ تمہارا چھوٹا بھائی ہے، اور وہ تم سے پہلے باپ بن گیا ہے۔''

''باپ نہ بن سکنے کے طعنے سے زیادہ مجھے تمہاری یہ بات ناگوار گزری ہے کہ تم نے عمر سعید مرزا کو میرا بھائی کہا ہے۔'' احمد مرزا بے حد ناگواری سے بولا۔ ''میں کسی کو اپنا بھائی نہیں مانتا...... جب بھی مجھے موقع ملا، میں نہ صرف عمر سعید مرزا بلکہ محمود سعید مرزا کی سلطنت کو ڈکار لئے بغیر ہڑپ کر لوں گا۔''

''کہیں اُلٹا ہی نہ ہو جائے۔'' ملکہ مہر نگار نے طنزیہ نگاہوں سے اپنے شوہر کی طرف دیکھا مگر منہ سے کچھ نہیں کہا۔ یہ تلخ اور سلگا دینے والا جملہ وہ صرف سوچ کر رہ گئی تھی۔ سلطان احمد مرزا اپنے بھائیوں کے ذکر پر اسی طرح بھڑک اٹھتا تھا۔ وہ پاؤں پٹختا اپنی نشست گاہ کی طرف چلا گیا اور مہر نگار خانم سر جھٹک کر دریچے میں آ کھڑی ہوئی تھی۔

یہ خبر جب قتلق نگار کی چھوٹی بہن سلطان نگار خانم تک پہنچی تو اس کا چہرہ خوشی سے تمتما اٹھا تھا۔

''کچھ سنا آپ نے؟'' اس نے مسرت سے لبریز آواز میں اپنے شوہر محمود مرزا کو مخاطب کیا۔ ''آپ کے بھائی سلطان عمر سعید مرزا ایک چاند سے شہزادے کے والد محترم بن گئے ہیں اور میری بہن قتلق نگار خانم ماں بن گئی ہیں۔''

احمد مرزا کی طرح محمود مرزا کو بھی بھتیجے کی ولادت کی کوئی خاص خوشی نہیں ہوئی تھی۔ مگر بیوی کو مسرور دیکھ کر وہ اس کا دل رکھنے کی خاطر مسکرا کر بولا۔ ''مبارک ہو، یہ ایک اچھی خبر ہے۔''

''اچھی خبر؟'' سلطان نگار نے آنکھیں پھیلا کر حیرت سے کہا۔ ''ارے جناب عالی! بہت ہی اچھی خبر ہے۔ پتا ہے میں نے قتلق نگار سے کیا وعدہ کیا ہے؟'' لحظہ بھر کے توقف کے بعد سلطان نگار نے نگاہیں جھکا کر قدرے شرمیلے لہجے میں کہا۔

''وعدہ؟'' محمود مرزا حیران ہوا۔ ''کیسا وعدہ؟''

''یہی کہ اگر اللہ نے ہمیں بیٹی دی...... تو ہم اس کی شادی ان کے بیٹے سے کر دیں گے۔''

''کیا ایسی کوئی صورت حال ہے؟'' محمود مرزا نے چونک کر ٹٹولتی نظروں سے بیوی کو دیکھا۔

''نہیں ابھی تو نہیں۔'' سلطان نگار نے نگاہیں جھکا کر شرمیلے لہجے میں جواب دیا۔ ''مگر مجھے اس رب کریم سے کامل امید ہے کہ جلد ہی ہمارے گھر میں بھی ایسی ہی خوشی اترے گی۔''

''چلو دیکھتے ہیں۔'' محمود مرزا نے ٹالنے والے انداز میں کہا اور اپنی جگہ سے اُٹھ کھڑا ہوا۔

''کہاں چل دیئے؟'' سلطان نگار حیرت سے بولی۔ ''ابا جان اپنے پہلے نواسے کا دھوم دھام سے عقیقہ کر رہے ہیں، ہم سب کو مدعو کیا ہے۔ ہمیں آج ہی فرغانہ کے لئے روانہ ہو جانا چاہئے۔''

''سلطنت کے بہت سے کام توجہ طلب ہیں۔'' محمود مرزا مجبور سے لہجے میں بولا۔ ''شاید میرا جانا مشکل ہوگا۔ تم جانا چاہو تو شوق سے جاؤ۔''

''آپ ساتھ چلتے تو ابا جان آپ کو دیکھ کر خوش ہوتے۔''

''مجھے بھی بابا یونس خان سے مل کر خوشی ہوتی ہے۔'' محمود خان دھیمے مگر سچے لہجے میں بولا۔ ''میں جلد ہی ان کی سلطنت منگولستان جا کر ان سے شرف ملاقات حاصل کروں گا۔''

اور اسی شام سلطان نگار خانم بہن اور نومولود بھانجے کے لئے تحفے تحائف سمیٹے فرغانہ کے لئے روانہ ہو گئی تھی۔

اس کی آمد پر سلطان عمر سعید مرزا کے محل میں خوشی کی لہر دوڑ گئی تھی۔ اس کے ماں باپ ہی نہیں، بہن بہنوئی بھی اسے دیکھ کر بے حد خوش ہوئے تھے۔ خاص طور پر قتلق نگار اپنی دوست نما بہن کو دیکھ کر کھل اٹھی تھی۔

''اللہ...... سلطان نگار تم آ گئیں۔ تمہیں دیکھ کر دل بہت شاد ہوا ہے۔'' وہ پیار سے بہن کو گلے لگاتے ہوئے خوشی سے لبریز لہجے میں بولی۔

''آپ کو شہزادے کی مبارک دینے کے ساتھ آپ کو آپ کا وعدہ یاد دلانے آئی ہوں۔'' سلطان نگار نے بہن کے کان میں شوخی سے سرگوشی کی۔

''کیسا وعدہ؟'' قتلق نگار خانم حیران ہوئی۔

''لو بھول گئیں؟'' سلطان نگار نے ننھے بھانجے کو گود میں بھرتے ہوئے بہن کی طرف شکوہ بھری نظروں سے دیکھا۔ ''یاد کرو تم نے کیا کہا تھا۔'' پھر وہ ننھے شہزادے کو سینے سے لگاتے ہوئے بولی۔ ''تم نے وعدہ کیا تھا کہ تمہارے ہاں بیٹا ہوا اور میرے گھر بیٹی ہوئی تو ہم ان دونوں کی باہم شادی کر دیں گے...... دیکھو اللہ نے تمہیں بیٹا دے دیا ہے۔ یہ ضرور میرا داماد بنے گا۔''

''ارے ابھی تو تمہاری کوئی بیٹی ہی نہیں ہے۔'' قتلق نگار ہنسی۔ ''جب ہو گی، تب دیکھا جائے گا۔''

''دیکھا کیا جائے گا۔'' وہ ٹھنک کر بولی۔ ''ان شاء اللہ ایسا ہی ہوگا۔ جیسے ہی میری بیٹی پیدا ہوئی، ہم ان دونوں کی منگنی کر دیں گے۔''

اگلے دن نومولود شہزادے کی عقیقے کی رسم ادا کر دی گئی اور یونس خان نے اپنے پیارے نواسے کا نام تجویز کیا...... محمد ظہیر الدین۔ یہ نام عمر سعید مرزا اور قتلق نگار خانم نے پہلے سے ہی پسند کر رکھا تھا۔ سب ہی کو ننھے شہزادے کا نام پسند آیا۔ یہ شاندار تقریب رات تک جاری رہی۔ شہر کے تمام غرباء و فقراء میں کپڑے اور اشرفیاں تقسیم کی گئی تھیں۔ طعام عام کا اہتمام کیا گیا تھا اور محل سمیت شہر بھر میں تین دن تک چراغاں کیا گیا تھا۔

محمد ظہیر الدین جب پانچ برس کا تھا تو سلطان نگار کے گھر ایک بیٹی تولد ہوئی۔ اس کا نام ماہ لقا بیگم رکھا گیا۔ ولادت کی خبر پا کر قتلق نگار خانم نے ثمرقند جانے کی خواہش کا اظہار کیا۔

''اگر آپ اجازت دیں تو اس خوشی کے موقع پر میں سلطان نگار کے پاس جانا چاہتی ہوں۔'' اس نے دھیمی آواز اور ہچکچاہٹ بھرے لہجے میں شوہر سے اجازت طلب کی۔

''ہاں کیوں نہیں۔'' عمر سعید مرزا نے بنا کسی پس و پیش کے اجازت دے دی۔ ''ہمارے ولی عہد کی ولادت پر وہ بھی کتنے مسرور انداز میں آئی تھی، تمہیں بھی ضرور جانا چاہئے۔''

''شکریہ سلطان معظم۔'' ملکہ نے سر جھکا کر شکریہ ادا کیا۔ ''ایک اور بات کی آپ سے اجازت چاہتی ہوں۔''

''کہو کیا بات ہے؟'' سلطان نے حیران لہجے میں سوال کیا۔

''بچوں کی ولادت سے پہلے سلطان نگار خانم نے اپنی اس خواہش کا اظہار کر دیا تھا۔'' قتلق نگار خانم نے دھیمے سروں میں کہنا شروع کیا۔ ''ان کی خواہش ہے کہ ہمارے ظہیر الدین اور اس کی بیٹی ماہ لقا بیگم کا رشتہ طے کر دیا جائے۔''

''تو اس میں کیا قباحت ہے۔'' عمر سعید مرزا نے بنا کسی رد و قدح کے مسکرا کر جواب دیا تو قتلق نگار خانم کے لبوں پر بھی مسکراہٹ بکھر گئی۔

اگلے دن ہی وہ بہن کے پاس جانے کے لئے ثمرقند روانہ ہو گئی۔ توقع کے مطابق سلطان نگار قتلق نگار کو دیکھ کر خوشی سے کھل اٹھی تھی۔

''تمہیں دیکھ کر میری خوشی دوبالا ہو گئی ہے۔'' وہ بہن کے گلے لگتے ہوئے مسرور لہجے میں بولی۔ ''تم تو جانتی ہو کہ خدا نے مجھے اولاد کی یہ خوشی کتنے انتظار کے بعد عطا کی ہے۔''

''سو تو ہے۔'' قتلق نگار نے تائید بھرے انداز میں سر ہلایا۔ ''اتنے برسوں میں کہیں تم اپنا وعدہ تو نہیں بھول گئیں؟''

قتلق نگار نے چاندی بھانجی کو گود میں اٹھاتے ہوئے بہن سے سوال کیا۔ ''تمہیں یاد ہے نا۔ تم نے کہا تھا کہ اگر تمہارے گھر بیٹی ہوئی تو تم اسے ظہیر الدین سے منسوب کرو گی؟''

''ہاں۔ یہ بھی کوئی بھولنے والی بات ہے۔'' سلطان نگار نے اپنے پانچ سالہ وجیہ و شکیل بھانجے ظہیر الدین کو پیار بھری نظروں سے دیکھتے ہوئے جواب دیا۔ ''میں اپنے رب ذوالجلال کی شکر گزار ہوں کہ اس نے مجھے اپنا وعدہ نبھانے کا موقع دیا۔''

''دیکھو بیٹا۔ یہ ننھی سی گڑیا کتنی پیاری ہے۔'' قتلق نگار نے ننھی ماہ لقا کو ظہیر الدین کے سامنے کرتے ہوئے تجسس بھرے لہجے میں کہا۔ ''تمہیں اچھی لگی نا؟''

''امی جان۔'' تب ہی ایک چار ساڑھے چار سال کی بچی غصے میں بل کھاتی آگے بڑھی۔ وہ کافی دیر سے دروازے میں کھڑی قتلق نگار کا ننھی ماہ لقا سے لاڈ پیار دیکھ رہی تھی اور یہ سب دیکھ کر اسے سخت ناگواری ہو رہی تھی۔ ''یہ خاتون کون ہیں جو ہماری ماہ لقا بیگم کو یوں گود میں لئے ہوئے ہیں؟''

''ارے اریبہ بیگم؟'' سلطان نگار نے چونک کر نووارد بچی کی طرف دیکھا جسے اس نے اریبہ کے نام سے مخاطب کیا تھا۔ ''تم کب آئیں؟ یہ خاتون میری بڑی بہن ہیں جس طرح تم ماہ لقا بیگم کی بڑی بہن ہو۔''

''یہ لڑکی کون ہے؟'' قتلق نگار خانم نے اس صحت مند اور سرخ و سفید بچی کی طرف حیرت سے دیکھتے ہوئے سوال کیا۔ بچی کی بھوری آنکھوں سے شعلے سے نکلتے محسوس ہو رہے تھے۔ قتلق نگار کی گود میں ماہ لقا کو دیکھ کر اور اب ظہیر الدین کو بچی کی طرف متوجہ پا کر وہ غصے سے پیچ و تاب کھا رہی تھی۔

''یہ سلطان کی بیٹی اریبہ بیگم ہے۔ ان کی حرم ایک کنیز کے بطن سے ہے۔'' سلطان نگار نے دھیمی آواز میں جواب دیا۔ ''میری گود میں تو ماہ لقا اب آئی ہے۔ تنہائی کے دن میں نے اسی بچی کو گود میں کھلا کے گزارے ہیں۔ مجھ سے اور اب اپنی چھوٹی بہن ماہ لقا سے بے حد محبت کرتی ہے۔ کوئی اور اس سے پیار کرے یا گود میں لے، یہ برداشت نہیں کر پاتی۔''

''یعنی بہت حاسد بچی ہے؟'' قتلق نگار نے دھیمی آواز میں کہا اور دوبارہ ظہیر الدین کی طرف متوجہ ہو گئی۔

وہ بے حد دلچسپی اور محبت سے پیاری سی بچی کو دیکھ رہا تھا۔ پھر اس نے اپنے بازو پھیلاتے ہوئے اشتیاق سے کہا۔ ''امی جان! کیا میں ننھی شہزادی کو گود میں لے سکتا ہوں؟''

''کیوں نہیں۔'' قتلق نگار نے پیار بھرے لہجے میں جواب دیتے ہوئے بچی کو ظہیر الدین کی طرف بڑھایا ہی تھا کہ اریبہ غصے سے آگ بگولا ہو کر درمیان میں آ گئی۔

''خبردار جو میری بہن کو آپ نے اس لڑکے کی گود میں دیا...... یہ میری ہے، صرف میری۔ آپ ابھی اسے گود سے اتاریں اور میری امی جان کو دیں۔''

قتلق نگار حیرت سے اس چھوٹی سی لڑکی کی نفرت اور نخوت دیکھ رہی تھی۔ ''سلطان نگار! یہ سب کیا ہے؟'' اس نے بہن سے پوچھا۔

''ارے قتلق نگار خانم، بچی ہے۔ تم بھی کہاں، بچوں کی باتوں میں لگ گئیں۔''

ظہیر الدین کو بھی اریبہ بیگم اور اس کا جارحانہ انداز پسند نہیں آیا مگر وہ خاموش تھا۔ البتہ قتلق نگار خانم کی شفاف پیشانی پر لکیریں ابھر آئی تھیں مگر سلطان نگار خانم نے مسکرا کر معاملہ رفع دفع کر دیا اور دونوں بہنیں منگنی کی رسم کے حوالے سے باتوں میں لگ گئی تھیں۔

دو روز بعد زنان خانے کے بڑے ایوان میں اس رسم کی ادائیگی کا اہتمام کیا گیا۔ دربار کے تمام امراء، وزراء اور نوابین کی بیگمات تحفوں تحائف سے لدی پھندی آئی تھیں۔ وسیع ایوان کو روشنیوں اور پھولوں سے آراستہ کیا گیا تھا۔ درمیان میں ایک تخت پر مخملی تو شک پر کم خواب کے گاؤ تکیوں کے سہارے دونوں بہنیں اپنے اپنے بچوں کے ساتھ تشریف فرما تھیں۔

شاہی خاندان کے بچوں کو کلام پاک پڑھانے والی بوڑھی استانی نے پہلے تلاوت کلام پاک کی۔ پھر دونوں بچوں کی طویل عمری، خوشی اور خوشحالی کے ساتھ باہم زندگی گزارنے کی دعا کے بعد قتلق نگار خانم کی طرف سے ہیروں کے دو ننھے ننھے کڑے ننھی شہزادی کی نازک سی کلائی میں پہنا دیئے تھے۔

اس کے بعد سلطان نگار خانم کی طرف سے شہزادے ظہیر الدین کے گلے میں ایک سچے موتیوں کا ہار ڈالا۔ موتیوں کے بیچ یاقوت دمک رہا تھا۔ ہر طرف سے مبارک سلامت کا شور اٹھا اور مہمان خواتین دونوں معزز بیگمات کی خدمت میں نذرانے گزارنے لگیں۔ گانے بجانے اور ناچ رنگ کا بھی انتظام تھا۔ آخر میں ایک پُر تکلف ضیافت کا اہتمام کیا گیا تھا۔

اس طرح رات گئے یہ خوبصورت تقریب اختتام پذیر ہوئی۔ قتلق نگار خانم اور ظہیر الدین بے حد خوش تھے کہ ننھی شہزادی اب ان کی ہو گئی تھی مگر سلطان نگار خانم کی سوتن کی بیٹی اریبہ بیگم سخت ناخوش اور خفا تھی۔ اپنی گڑیا سی بہن کو ظہیر الدین کی گود میں دیکھ کر وہ حسد کی آگ میں سلگ رہی تھی۔ یہ ہنستا مسکراتا صاحب جمال و جلال شہزادہ اسے زہر لگ رہا تھا۔ اس کے لئے ایک بے نام سی نفرت اور کدورت کا احساس اس کے رگ و پے میں سرایت کر رہا تھا۔

چند دن رہ کر قتلق نگار خانم، ظہیر الدین کے ساتھ واپس فرغانہ لوٹ آئی تھی۔

ظہیر الدین کے پایۂ تخت پہنچتے ہی اس کی تعلیم و تربیت کا سلسلہ پھر سے شروع ہو گیا تھا۔ بہت ہی قابل اور اعلیٰ پائے کے اساتذہ کی زیر نگرانی اسے خوش خطی، شعر و ادب کے علاوہ طب، علم نجوم اور دیگر مضامین کی تعلیم دی جا رہی تھی۔ اس کے ساتھ ہی شہ سواری، شمشیر زنی اور نشانہ بازی کی تربیت بھی جاری تھی۔

ظہیر الدین ایک وجیہ و شکیل شہزادے کے ساتھ کچھ غیر معمولی صفات کا بھی حامل تھا۔ وہ بے حد محنتی، مستقل مزاج، بہادر اور رحم دل انسان تھا۔ اس کے والد عمر سعید مرزا ہی نہیں، اس کے نانا یونس خان بھی اس سے بے حد محبت و شفقت رکھتے تھے۔

ان دنوں سلطان عمر سعید مرزا مختلف کشاکش اور کشمکش کا شکار تھا۔ اسے ہمیشہ ہی یہ احساس تکلیف دیتا رہتا تھا کہ اس کے والد کی وسیع سلطنت میں سے اس کے حصے میں بہت کم آیا ہے، اور وہ اپنا حق چھیننے کا خواہشمند تھا جیسا کہ اس عہد میں عام طور پر ہوتا تھا۔ اس کے خاص حریف اس کے اپنے ہی خاندان والے تھے۔ اپنے بڑے بھائی سلطان احمد مرزا سے اس کے تعلقات مستقل طور پر معاندانہ تھے۔ اس کی کئی وجوہات تھیں۔ سب سے پہلی وجہ یہ تھی کہ عمر سعید مرزا کی نظریں اپنے سے زیادہ خوش قسمت بھائی کے مقبوضات پر لگی ہوئی تھیں اور وہ اس کے خلاف مستقل سازشیں کرتا رہتا تھا۔ جبکہ سلطان احمد مرزا کے پاس موجود ایک طاقتور لشکر فرغانہ کے لئے ایک خطرہ بنا ہوا تھا۔ وہ کئی بار فرغانہ کو خود اپنی مملکت میں شامل کرنے کی کوشش کر چکا تھا۔ عمر سعید مرزا اپنے وسائل کی کمی کے باعث اپنے بھائی سے خوفزدہ بھی تھا لیکن وہ تاشقند اور شاہ رخیہ کے سرحدی صوبوں پر اپنا حق جتانے سے باز نہیں آتا تھا۔ یہ زرخیز صوبے دونوں بھائیوں کے درمیان ایک مستقل وجہ مخاصمت کی شکل اختیار کر گئے تھے۔

بڑے بھائی احمد مرزا کے مادی وسائل کی زبردست برتری کے باعث یہ مقابلہ بہت غیر متوازن تھا مگر خاقان منگولستان یونس خان کی غیر مشروط امداد نے ہمیشہ ہی عمر سعید مرزا کے لئے اس کشمکش کو جاری رکھنا ممکن بنا دیا تھا۔

یونس خان نہ صرف اپنی بیٹی داماد سے بے حد محبت کرتا تھا بلکہ وہ اپنے چہیتے نواسے ظہیر الدین پر بھی دل و جان سے نثار تھا۔ اسے اپنا یہ حسین، ذہین، شجاع اور باصلاحیت نواسہ بے حد عزیز تھا۔ وہ اس کی تعلیم و تربیت پر خصوصی توجہ دیتا تھا۔ سلطان عمر سعید مرزا کے مصروف رہنے کے باعث وہ خود اسے اکثر شکار پر لے جایا کرتا تھا۔ اس دور میں شکار کے ذریعے شہزادوں کو جنگی داؤ اور حکمت عملی کی تربیت دی جاتی تھی۔

وہ اوائل فروری کے خنک مگر دل کشا ہواؤں کے دن تھے۔ ظہیر الدین کے پورے نو سال کے ہونے میں ابھی چند روز باقی تھے۔ اتنی سی عمر میں ہی وہ ایک دراز قد، سنجیدہ، بردبار اور باوقار لڑکا بن چکا تھا۔ اس صبح یونس خان اپنے شکاری عملے اور اپنے چہیتے نواسے ظہیر الدین کے ساتھ فرغانہ کے شمالی جنگلات میں شکار کی غرض سے موجود تھا۔

یہ جنگلات گھنے سرسبز اور چھوٹے شکار کی بہتات کی وجہ سے بہت مشہور تھے۔ زیادہ تر یہاں ہرن، بارہ سنگھا اور خرگوش وغیرہ پائے جاتے تھے مگر کبھی کبھار بھیڑیئے، چیتے اور شیر بھی دکھائی دے جاتے تھے۔

صبح سے دوپہر تک یونس خان، ظہیر الدین کو اپنے تجربات کے بارے میں آگاہ کرتا رہا تھا۔ دوپہر کے کھانے کے بعد جب دوپہر، سہ پہر کی جانب قدم رنجہ تھی، وہ ظہیر الدین کے ساتھ خیمے سے باہر نکلا۔ حفاظتی عملے کے سپاہی ان سے چند قدم کے فاصلے پر چل رہے تھے۔

گھنے جنگل میں ہر سمت ہریالی اور شادابی بکھری ہوئی تھی۔ گھنے سرسبز پیڑ ہواؤں کے تیز جھکڑوں میں بدمست ہاتھیوں کی طرح جھوم رہے تھے۔ ہلکی دھوپ نے فضا کو ایک عجب سی تسکین آمیز تمازت دے دی تھی۔ یونس خان اور ظہیر الدین اس خوشگوار موسم میں ماحول سے لطف اندوز ہوتے باتوں میں مگن اپنے عملے کے سپاہیوں سے بہت آگے نکل گئے تھے۔

اچانک یونس خان ایک جگہ ٹھٹک کر رک گیا۔ اس کے سامنے، ذرا داہنی جانب ایک جسیم بارہ سنگھے کا ادھ کھایا دھڑ پڑا تھا۔ تازہ گوشت اور رستا ہوا خون اس بات کا غماز تھا کہ اسے کچھ ہی دیر قبل کسی بڑے درندے نے شکار کیا تھا اور وہ کچھ گوشت سے سامان کام و دہن کے بعد کسی طرف ستانے کے لئے نکل گیا ہے۔ بھلا اس صحت مند اور جسیم بارہ سنگھے کا شکار کون کر سکتا ہے؟ یونس خان نے حیران و پریشان نظروں سے پیچھے کی جانب دور تک دیکھتے ہوئے سوچا۔

''تم بتاؤ اس بارہ سنگھے کا شکار کس درندے نے کیا ہوگا؟'' اُس نے اچانک اپنے ساتھ موجود ظہیر الدین سے سوال کیا...... مگر اس وقت اسے ایک جھٹکا سا لگا جب اس نے ظہیر الدین کو اپنے ساتھ نہ پایا۔

اس نے گھبرائے ہوئے انداز میں سامنے کی طرف دیکھا۔ ظہیر الدین اس سے باتوں میں اتنا مگن تھا کہ اس کے رکنے کا اسے پتا ہی نہ چلا تھا اور وہ اپنی ہی دھن میں سر ہلاتا شاہانہ چال چلتا آگے ہی آگے بڑھتا چلا جا رہا تھا۔

اس وقت وہ یونس خان سے بہت آگے نکل چکا تھا۔ اس سے قبل کہ یونس خان اسے آواز دے کر روکتا، اسے دائیں جانب کی گھنی جھاڑیوں کے پیچھے دو بھوری چمکتی ہوئی آنکھیں دکھائی دی تھیں۔

''او میرے خدا! یہ تو شیر ہے۔'' یونس خان نے گھبرا کر سامنے کی جانب دیکھا۔ شیر اپنی خون آلود تھوتھنی اور پنجوں سمیت شہزادے ظہیر الدین کی طرف بڑھ رہا تھا۔ اور پھر وہ چھوٹی جھاڑیوں کو روندتا ایک دم ظہیر الدین کے مقابل آ ٹھہرا۔

یونس خان، ظہیر الدین سے خاصے فاصلے پر تھا۔ وہ اڑ کر جاتا تو بھی خونخوار درندے سے پہلے اس تک نہیں پہنچ سکتا تھا۔ آنکھوں میں خونخواری لئے جوان اور تومند درندہ شہزادے کے سر پر موجود تھا۔ یونس خان اپنی جگہ منجمد ہو گیا تھا۔ اس کی پھیلی ہوئی آنکھوں میں خوف جم گیا تھا اور ہراساں چہرے سے وحشت اور سراسیمگی مترشح تھی۔

تب ہی شہزادے ظہیر الدین نے رک کر اپنے سامنے موجود عفریت کی طرف دیکھا۔ لحظہ بھر کو گردن کو خم دے کر اس نے اپنے نانا کو دیکھنے کی کوشش کی۔ مگر وہ اس وقت اس سے خاصے فاصلے پر پتھر کی مورت بنے ساکت و جامد کھڑے تھے۔ شہزادے نے غیر محسوس انداز میں گردن گھما کر اپنی تیز شعلہ بار نظریں شیر کے چہرے پر جما دیں۔ اس سے قبل کہ شیر چھلانگ لگا کر شہزادے کو مجروح کرتا، شہزادے نے بجلی کی سی سرعت سے پٹکے میں لٹکتے خنجر کو نکالا اور پھر اسی تیزی سے سیدھے ہاتھ میں زہر میں بجھایا ہوا خنجر تول کر شیر کی دائیں آنکھ کا نشانہ لے کر پھینکا۔

شہزادے کا نشانہ غضب کا تھا۔ مسموم خنجر شیر کی داہنی آنکھ میں ترازو ہو گیا تھا۔ ابھی کچھ ہی دیر قبل ایک تومند بارہ سنگھے کو پچھاڑ کر اس کے تازہ گوشت اور گرم لہو سے بھوک بجھانے والے اس طاقتور درندے کے وہم و گمان میں نہ تھا کہ یہ بالشت بھر کا لڑکا اسے اس طرح کی غیر متوقع اور ناقابل برداشت اذیت میں مبتلا کر سکتا ہے۔

خنجر کے آنکھ میں پیوست ہوتے ہی وہ بے اختیار پلٹ گیا تھا۔ اگلے ہی لمحے خنجر کے زہر نے اپنا کام دکھانا شروع کر دیا۔ شیر دھاڑتا، درد و اذیت سے بلبلاتا پچھلی جانب دوڑا تھا۔ چند قدم چل کر ہی لڑکھڑا کر گرا اور ڈھیر ہو گیا تھا۔ زود اثر زہر میں بجھے خنجر کا زہر، اس کے اندر اثر کر گیا تھا۔ کچھ آنکھ کے گھاؤ کا کرب تھا۔ وہ ذرا ہی دیر میں تڑپ کر ساکت ہو گیا۔

شیر کے ساکت ہوتے ہی شہزادے نے پلٹ کر اپنے نانا کی طرف دیکھا۔ وہ دوڑتا ہوا اس کے قریب آ رہا تھا۔ قریب آتے ہی یونس خان نے اسے اپنے بازوؤں میں بھر کر اپنے سینے سے لگا لیا۔

''میرے لخت جگر، میرے بچے، میرے نواسے، تم بے شک بہادر ہو، تم دلاور ہو، تم شیر ببر، ہو تم بابر ہو۔'' وہ دیوانہ وار شہزادے کے پیشانی کے بوسے لیتے ہوئے مسلسل کہے جا رہا تھا۔

''تم بے شک چنگیز کی آل ہو۔ آج سے تم بابر ہو۔''

''شکریہ نانا جان۔'' شہزادے نے قدرے جھک کر نانا کا عطا کردہ خطاب قبول کرتے ہوئے کہا۔

شکار ملتوی کر کے یونس خان اسی پل اپنے چہیتے نواسے اور دیگر شکاری عملے کے ساتھ پایۂ تخت کی طرف روانہ ہو گیا تھا۔

جب ظہیر الدین بابر کے والد عمر سعید مرزا کو اس واقعے کا علم ہوا تو وہ بھی بے حد خوش ہوا۔ ''مجھے یقین ہے کہ میرا یہ سپوت باپ، دادا کا نام روشن کرے گا۔''

''سلطان معظم۔'' یونس خان نے دھیمی مگر قدرے شوخ آواز میں یاد دہانی کروائی۔ ''آپ بابر کے نانا کا نام بھول رہے ہیں۔''

''خاقان اعظم۔'' سلطان عمر سعید مرزا ایک دم جھکتا ہوا قدرے ندامت سے بولا۔ ''آپ کا نام تو سرفہرست ہے۔ شہزادے کی یہ صلاحیت، لیاقت اور شجاعت سب کچھ آپ کی تعلیم و تربیت کا نتیجہ ہے اور آپ کا عطا کردہ یہ خطاب...... اس سے ظہیر الدین کے نام کی توقیر میں اضافہ ہوا ہے۔''

''شکریہ صاحب زادے۔'' یونس خان مشفق انداز میں مسکرا دیا۔

''قتلق نگار خانم سے کہو کہ شہزادے بابر کا صدقہ اتار دیا جائے۔ خداوند کریم نے نئی زندگی عطا کی ہے۔''

''ہاں کیوں نہیں۔'' ملکہ قتلق نگار خانم آہستگی سے اندر داخل ہوئی۔ اسے بھی تمام واقعہ کا علم ہو چکا تھا۔ پہلے اس نے اپنے جری اور شجاع بیٹے کو سینے سے لگا کر اپنے دھڑکتے دل کا خوف دور کیا۔ پھر اس نے ڈھیروں اشرفیاں شہزادے پر نچھاور کر کے اس کا صدقہ اتارا۔

دیکھتے ہی دیکھتے ایک برس اور بیت گیا۔ اب ظہیر الدین بابر دس سال کا ہو چکا تھا۔ سلطان عمر سعید مرزا اپنی کشاکش اور پریشانیوں میں گھرا ہونے کے باوجود اب وہ شہزادے کو زیادہ سے زیادہ وقت دینے کی کوشش کرتا تھا۔ فرصت کے لحات میں وہ چاہتا تھا کہ شہزادہ اس کے ساتھ رہے۔ اس شام وہ اسے اپنے کبوتر خانے کی سیر کے لئے لایا تھا۔

سلطان عمر سعید کو کبوتروں سے بے حد دلچسپی تھی۔ شاہانہ انداز میں سر اٹھا کر نخوت و نفاست سے قدم بہ قدم چلنے والے یہ پرندے اسے بے حد پسند تھے۔ کبوتر پالنا اور ان کی پُر شکوہ اُڑان کا نظارہ کرنا سلطان کا پسندیدہ ترین مشغلہ تھا۔ محل کے پچھواڑے، دریا کے کنارے پہاڑ کے ڈھلوان پر اس نے ایک بڑا کبوتر خانہ بنوایا ہوا تھا۔ اعلیٰ درجے کی لکڑی کا یہ بڑا اور وزنی کبوتر خانہ ڈھلوان پر آویزاں کیا گیا تھا۔ کبوتر خانے میں بے شمار کابک تھیں، جن میں ہزاروں کبوتر موجود تھے۔

شہزادہ پہلے بھی اس کبوتر خانے کی سیر کر چکا تھا۔ مگر آج وہ کئی مہینوں کے بعد اس سمت آیا تھا۔ اب اس کی سمجھ، شعور اور عاقبت اندیشی میں پہلے کی نسبت خاصا اضافہ ہو چکا تھا۔ اسی لئے وہ آج اس کبوتر خانے کو ناقدانہ نظروں سے دیکھ رہا تھا۔

''بابا جان۔'' خاصی دیر پُر سوچ نظروں سے چاروں طرف دیکھنے کے بعد اس نے نہایت سنجیدگی سے اپنے والد محترم کو مخاطب کیا۔ ''میرا خیال ہے کہ یہ کبوتر خانہ غلط انداز میں نصب کیا گیا ہے۔''

''کیا مطلب؟'' سلطان ایک ایک کابک میں ہاتھ ڈال کر کبوتر باہر نکال کر کبوتر کے پنجوں اور چونچ کا معائنہ کرنے میں مشغول تھا۔ بیٹے کی بات سن کر چونک کر بولا۔ ''میں تمہاری بات سمجھ نہیں سکا۔''

''بابا جانی! آپ دیکھ رہے ہیں، یہ وزنی اور دیوہیکل کبوتر خانہ ڈھلوانی سطح پر نصب کیا گیا ہے۔ ڈھلوانی اور چکنی سطح کسی بھی وقت اس کا بوجھ اٹھانے سے انکار کر سکتی ہے۔''

''ارے نہیں بیٹا۔'' عمر سعید مرزا بے نیازی سے مسکرا کر بولا۔ ''ایسا کچھ نہیں ہوگا۔ بڑے ماہر کاریگروں نے یہ کبوتر خانہ بنایا ہے اور اپنے فن میں ماہر لوگوں نے اسے نصب کیا ہے۔ تم اس بیکار کی منطق کو نظر انداز کر کے اس خوبصورت پرندے کی اونچی اڑان کا نظارہ کرو۔ دیکھو کیسے جھنڈ کے جھنڈ فضا میں بلند ہوتے ہیں اور ایک آواز پر چھتریوں پر اتر آتے ہیں۔ کاش انسان میں بھی یہ فرمانبرداری ہوتی تو ہم سلطانوں کو زیادہ پریشان نہ ہونا پڑتا۔''

شہزادہ ظہیر الدین بابر، باپ کے جواب سے کلی طور پر مطمئن نہیں ہوا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ اتنا وزنی کبوتر خانے کا اس طرح ڈھلوان پر نصب ہونے کے ساتھ فضا میں معلق ہونا بے حد خطرناک بھی ثابت ہو سکتا ہے۔

کبوتر خانے کی سیر سے واپس آنے پر سلطان عمر سعید کو خبر ملی کہ سلطان احمد مرزا اور سلطان محمود مرزا لشکر تشکیل دینے میں مصروف ہیں۔

''آپ کچھ پریشان دکھائی دے رہے ہیں۔'' رات کے کھانے پر ملکہ قتلق نگار خانم نے شوہر کے چہرے پر فکر کی پرچھائیاں دیکھیں تو متفکر لہجے میں سوال کیا۔

''ہاں میرا خیال ہے کہ بدخشاں کے سلطان ہمارے بڑے بھائی صاحب محترم احمد مرزا فرغانہ پر لشکر کشی کی منصوبہ بندی کر رہے ہیں۔''

''اوہ!'' قتلق نگار کے چہرے کی فکر ایک دم گہری ہو گئی۔ ''آپ اس سلسلے میں بابا جان یونس خان سے کیوں نہیں رابطہ کرتے؟''

''میں پہلے اپنے لشکر پر توجہ دینا چاہتا ہوں۔'' سلطان عمر سعید مرزا نے پُر سوچ لہجے میں جواب دیا۔ ''جہاں تک خان یونس خان کا تعلق ہے تو وہ میرے مربی اور مہربان ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ انہیں خبر ہوتے ہی وہ خود ہی میری مدد کو چلے آئیں گے۔''

اور ہوا بھی یونہی...... جونہی سلطان اپنی فوج لے کر فرغانہ سے نکلا اور کچھ آگے جا کر، ہستل کے میدان میں پڑاؤ انداز ہوا، اس سے کچھ فاصلے پر احمد مرزا اپنا لشکر لئے موجود تھا۔ ابھی جنگ شروع نہیں ہوئی تھی کہ یونس خان ہانپتا کانپتا آ پہنچا تھا۔

''سلطان عمر سعید مرزا۔'' وہ منجھلے داماد سے حیرت اور وحشت بھرے لہجے میں کہہ رہا تھا۔ ''یہ کیا حماقت ہے۔ تمہیں کچھ پتا بھی ہے۔ احمد مرزا کے لشکر کی تعداد کیا ہے؟ تمہارے یہ چند ہزار سپاہی گاجر، مولی کی طرح کاٹ کر رکھ دیئے جائیں گے۔''

''آپ خود ہی بتایئے، جب میری مملکت سے کچھ ہی فاصلے پر کوئی لشکر آ کر پڑاؤ انداز ہو جائے تو ایسے میں، میں اس کے سوا کیا کر سکتا ہوں۔''

''بات تمہاری بھی غلط نہیں ہے۔'' یونس خان نے فکر مند لہجے میں جواب دیا۔ ''خیر برسرپیکار ہونے سے پہلے مجھے کچھ سوچنے کا موقع دو۔''

یونس خان جانتا تھا۔ دوسرے دونوں دامادوں کی طرح احمد مرزا بھی اس کی بے حد عزت کرتا ہے اور اس کی کسی بھی بات کو رد کرنے کی جسارت نہیں کر سکتا۔ مگر اس کے باوجود اس نے مشہور بزرگ خواجہ نصیر الدین عبید اللہ سے رابطہ کیا۔

''خان! آپ مجھ سے کیا چاہتے ہیں؟'' ساری صورت حال جاننے کے بعد بزرگ نے دھیمی آواز میں سوال کیا۔

''محترم! میں چاہتا ہوں کہ آپ درمیان میں پڑ کر ان دونوں عاقبت نااندیش بھائیوں کے مابین صلح کروا دیں۔'' یونس خان نے ملتجی لہجے میں کہا۔

''ٹھیک ہے، آپ کہتے ہیں تو میں ضرور کوشش کروں گا۔'' بزرگ نے پُر امید لہجے میں جواب دیا۔

اور پھر خواجہ نصیر الدین عبید اللہ کی کوششوں سے یہ جنگ ٹل گئی تھی۔ احمد مرزا اپنا لشکر لے کر واپس ہو گیا اور سلطان عمر سعید اپنی فوج لے کر واپس فرغانہ چلا آیا تھا۔

کچھ عرصے کے لئے جنگ کا خطرہ ٹل گیا تھا۔ مگر یہ سکون وقتی ثابت ہوا تھا۔ کچھ ہی عرصے بعد دونوں بھائیوں کے مابین تاشقند اور شاہ رخیہ کے سرحدی صوبوں کے مسئلے پر ٹھن گئی تھی۔

دونوں سلاطین ان صوبوں پر اپنا حق جتا رہے تھے اور ان کے حصول کی خاطر جنگ کے لئے تیار تھے۔

''کیا جنگ کے علاوہ اور کوئی حل نہیں ہے اس مسئلے کا؟'' اس شام اپنے سامنے سرحدی علاقے کا نقشہ پھیلائے عمر سعید مرزا جنگی حکمت عملی تیار کرنے میں مصروف تھا...... تب ہی ملکہ قتلق نگار خانم نے دھیمی آواز میں پوچھا۔

''شاید نہیں۔'' سلطان عمر سعید مرزا نے سنجیدہ اور گمبھیر لہجے میں جواب دیا۔ ''میں کسی بھی قیمت پر احمد مرزا کو یہ زرخیز اور قابل قدر صوبے ہڑپنے نہیں دوں گا۔''

''بھائی احمد مرزا بھی کچھ اسی طرح کے خیالات رکھتے ہوں گے۔'' قتلق نگار خانم نے افسردہ اور دھیمی آواز میں کہا۔

''ہاں، ظاہر ہے۔'' عمر سعید مرزا نے لاپروائی کے اظہار کے طور پر کندھے اُچکا کر جواب دیا۔ ''مگر ان کے ان خیالات کی فکر کسے ہے۔ میں ہر قیمت پر، کسی بھی انداز میں، ان سے وہ صوبے چھین کر رہوں گا۔''

آئے دن کی ان چپقلشوں، کشمکشوں اور لشکر کشیوں نے قتلق نگار خانم کو خاصا زود رنج اور ملول کر دیا تھا۔ عمر سعید مرزا سے شادی کے بعد ایک خوبصورت گھر میں پیارے پیارے بچوں کے ساتھ ایک پُر سکون زندگی کا اس نے جو خواب دیکھا تھا، اس کی تعبیر اتنی اچھی ثابت نہیں ہوئی تھی۔ یہ روز روز کی جنگیں اور لڑائیاں اسے بے حد دکھی اور رنجور کر چکی تھیں۔

''بابا جان۔'' اس شام اس نے کرب بھرے لہجے میں اپنے والد یونس خان سے کہا۔ ''خدارا سلطان اور احمد مرزا کے مابین سرحدی صوبوں کے معاملات پر کچھ توجہ کیجئے۔ سلطان پھر فوج لے کر بدخشاں پر حملہ آور ہونے کا ارادہ کر رہے ہیں جبکہ آپ جانتے ہیں بھائی احمد مرزا کے لشکر کے سامنے ہماری فوجوں کی کوئی حقیقت نہیں ہے۔''

''ہاں، یہ بات درست ہے۔'' یونس خان نے پُر سوچ انداز میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ''خیر تم فکر مت کرو، میں کچھ کرتا ہوں۔ بہرحال یہ جنگ نہیں ہونی چاہئے، ورنہ سلطان سعید مرزا کو بے حد نقصان پہنچے گا۔''

سلطان احمد مرزا اور سلطان عمر سعید مرزا، دونوں سرحدی صوبوں کی ملکیت سے متعلق تنازع میں کسی بھی سمجھوتے پر نہ پہنچ پا رہے تھے، تب ہی شیخ مہدی رئیس افغانی کے مشورے پر یہ طے کیا گیا کہ ان متنازع علاقوں کو کسی تیسرے فریق کی تحویل میں دے دیا جائے۔ کئی نام زیر بحث آئے مگر وہ دونوں متفق نہ ہو سکے۔ آخر میں خواجہ نصیر الدین نے دونوں فریقین کے سامنے ایک نام پیش کیا اور وہ نام تھا......؟

(جاری ہے)

ظہیر الدین بابر

اشتیاق فاطمہ عظمیٰ

قسط : 3

منگولستان کے خاقان، یونس خان کا نام اتنا معتبر تھا کہ دونوں فریق متنازع علاقوں کو یونس خان کے سپرد کر کے اس تنازع کو حل کرنے پر رضامند ہو گئے۔

جب تک یونس خان زندہ رہا، اس کے اثرات دامادوں کی باہمی جنگ و جدل کو ٹھنڈا کرنے کے لئے ہمیشہ مؤثر رہے۔ پر 1486ء میں اس کی وفات کے بعد تیموری برادران اور دیگر اقربا کی آپس کی کشمکش نے ایک نئی وحشیانہ شدت اختیار کر لی۔

موسم سرما کے آغاز سے ہی یونس خان کی طبیعت ناساز ہو گئی تھی۔ سردی کے باعث سینے میں درد بیٹھ گیا تھا۔ معمولی سردی کے اثر نے دیکھتے ہی دیکھتے نمونیہ کی شکل اختیار کر لی تھی۔ یونس خان کی بیٹیاں اپنے اپنے گھروں میں تھیں جبکہ دونوں بیٹے احمد خان اور محمود خان اس کے پاس موجود تھے۔ اس کی طبیعت کے پیش نظر ایسن دولت بیگم نے اسے مشورہ دیا۔ ”میرا خیال ہے اب آپ کو سلطنت کا بوجھ بیٹوں میں تقسیم کر دینا چاہئے تاکہ آپ بے فکری کے ساتھ اپنی صحت پر توجہ دے سکیں۔“

”تم ٹھیک کہتی ہو بیگم۔“ یونس خان نے دھیمی آواز میں جواب دیا۔ ”دیوان سلطنت ارمغان خان کو طلب کیا جائے۔“

یونس خان نے سلطنت کے جنوبی علاقہ جات چھوٹے بیٹے احمد خان کے سپرد کر دیئے جبکہ شمالی علاقہ جات جن میں شاہ رخیہ اور تاشقند کے علاقے بھی شامل تھے، بڑے بیٹے محمود خان کے حصے میں آئے۔

یونس خان کا علاج جاری تھا۔ ملک کے ماہر اطباء نہایت توجہ اور دل جمعی سے مرض دور کرنے کی کوششوں میں لگے تھے۔ پر مرض بڑھتا رہا جوں جوں دوا کی، کے مصداق اس کی حالت دن بہ دن بگڑتی جا رہی تھی۔ فرغانہ کے حکمران، سلطان عمر سعید مرزا کو جونہی اس کی بیماری کی خبر ملی، وہ اس کی عیادت کے لئے بے چین ہو گیا۔

”بابا جان! کیا میں بھی آپ کے ساتھ نانا جان کی عیادت کو چل سکتا ہوں۔“ دس سالہ ظہیر الدین بابر نے باپ سے مؤدبانہ گزارش کی۔ عمر سعید مرزا جانتا تھا کہ یونس خان اسے اور اس کی بیوی قتلق نگار خانم کو ہی نہیں بلکہ اپنے نواسے بابر کو بھی بے حد چاہتا ہے۔ چنانچہ اس نے بابر کو بھی اپنے ساتھ لے جانے کا فیصلہ کر لیا۔

”کیا واقعی بابا جان کی طبیعت بہت زیادہ خراب ہے؟“ قتلق نگار خانم نے اندیشوں سے پُر آواز میں سوال کیا۔ ”میرا دل چاہ رہا ہے کہ میں بھی آپ لوگوں کے ساتھ ان کی مزاج پرسی کو چلوں۔“

”ہاں کیوں نہیں۔“ عمر سعید مرزا نے فراخدلانہ انداز میں جواب دیا۔ ”ہم تینوں کو ایک ساتھ اپنے سامنے پا کر یقیناً خاقان اعظم خوش ہوں گے۔“

اسی شام وہ تینوں منگولستان کے لئے روانہ ہو گئے۔

باپ کی بیماری کی خبر ملتے ہی یونس خان کی چھوٹی بیٹی سلطان نگار خانم بھی اپنے خاوند سلطان محمود مرزا اور بیٹی ماہ لقا بیگم کے ساتھ منگولستان پہنچ گئی تھی۔ اگلے دن قتلق نگار خانم بھی شوہر اور بیٹے کے ساتھ میکے پہنچ گئی۔

”اللہ قتلق نگار! کتنے دنوں بعد تمہیں دیکھا ہے؟“ سلطان نگار بڑی بہن کو دیکھتے ہی لپٹ گئی۔ پھر اس نے ظہیر الدین بابر کی طرف توجہ کی۔ ”ماشاءاللہ ہمارے ہونے والے داماد ظہیر الدین میاں کس قدر سنجیدہ اور بُردبار ہو گئے ہیں۔“

”شکریہ خالہ جان۔“ بابر نے قدرے جھکتے ہوئے مؤدبانہ انداز میں خالہ اور ہونے والی ساس کی خدمت میں سلام پیش کیا۔

پانچ سالہ ماہ لقا بیگم اپنی بڑی بڑی دلکش آنکھوں سے بابر کی طرف دیکھ رہی تھی۔ اس کی شفاف آنکھوں میں حیرت نمایاں تھی۔ اس لڑکے کا ذکر اس نے بارہا اپنی بڑی بہن اریبہ بیگم سے سنا تھا مگر اس نے اس پیارے اور سنجیدہ سے لڑکے کے بارے میں ہمیشہ ہی خوفناک تصویر کشی کی تھی۔

”وہ ایک بہت ہی بُرا لڑکا ہے۔ لڑاکا اور غصہ ور......“

”اچھا آپا۔“ معصوم اور پیاری سی ماہ لقا حیرت سے آنکھیں پھیلا کر پوچھتی۔ ”پھر تو ہمیں اس گندے لڑکے کے بارے میں بات بھی نہیں کرنی چاہئے، ہے نا؟“

”بات تو کرنی پڑے گی۔“ نو سالہ اریبہ بیگم مجبور سے لہجے میں کہتی۔ ”تمہاری امی جان نے اس سے تمہاری منگنی جو کر دی ہے۔ چند برسوں بعد وہ تم سے شادی کر کے تمہیں اپنے ساتھ لے جائے گا......اور تم پر بہت ظلم ڈھائے گا۔“

”اُف توبہ۔“ ننھی شہزادی جھرجھری لے کر جواب دیتی۔ ”میں امی جان سے کہہ دوں گی۔ میری اس ظالم لڑکے سے ہرگز شادی نہ کریں۔“

اریبہ کی باتوں کی روشنی میں، ماہ لقا کے ذہن میں بابر کا جو تصور اُبھرا تھا، وہ اس کی اصل شخصیت سے بے حد مختلف تھا۔

دوسری طرف بدخشاں کا سلطان، احمد مرزا خسر کی ناسازئ طبع کی خبر پاتے ہی اس کی عیادت کو آنے کو بے چین ہو گیا تھا، مگر اس کی بیوی مہر نگار بیگم لیت و لعل سے کام لے رہی تھی۔ وہ جانتی تھی وہاں فرغانہ کا حکمران سلطان عمر سعید مرزا بھی موجود ہو گا......اور جب بھی یہ دونوں بھائی آمنے سامنے ہوتے تو اختلاف رائے کا کوئی نہ کوئی پہلو سامنے آ جاتا تھا اور وہ نہیں چاہتی تھی کہ بیمار والد کے ذہن پر ان دونوں کی چپقلش کا کوئی برا اثر پڑے۔

”تم کیسی بیٹی ہو، تمہارے والد بیمار ہیں اور تم انہیں دیکھنے کے لئے بے تاب ہونے کی بجائے اطمینان سے بیٹھی ہو اور مجھے بھی وہاں جانے سے روکنا چاہتی ہو......مہر نگار بیگم یہ اجتناب کیوں؟“

”شاید آپ کو علم نہیں۔ وہاں قتلق نگار خانم اور عمر سعید مرزا بھی موجود ہیں اپنے سپوت، بابر کے ساتھ......“ مہر نگار خانم نے قدرے طنزیہ لہجے میں جواب دیا۔

”ہاں سنا ہے۔ ظہیر الدین کی بہادری اور دلاوری پر خاقان اعظم یونس خان نے اسے ”بابر“ کا خطاب عطا کیا ہے......ببر شیر کی طرح بہادر اور جری۔“ احمد مرزا نے قدرے حسرت بھرے لہجے میں کہا۔ ”سنا ہے، بہت ذہین اور لائق لڑکا ہے۔ بہادری اور شجاعت کے علاوہ اکتساب علم میں بھی یکتا ہے۔“

”میں عمر سعید مرزا کی بات کر رہی تھی۔“ مہر نگار خانم نے قدرے خشک اور بیزار سے لہجے میں کہا۔ ”اور تم بابر کا ذکر لے بیٹھے۔“

”اگر تم سے میری کوئی بیٹی ہوتی تو میں اس کی نسبت بابر سے کر دیتا۔“ احمد مرزا نے سرسری سے لہجے میں کہا مگر مہر نگار کا دل جل کر رہ گیا تھا۔ کس قدر خوبصورتی سے اس نے اسے اس کے بانجھ ہونے کی بات جتا دی تھی۔

”تمہاری اطلاع کے لئے بتاتی چلوں۔“ مہر نگار خانم دل جلے انداز میں بولی۔ ”بابر کی منگنی ہماری چھوٹی بہن سلطان نگار کی بیٹی ماہ لقا سے ہو چکی ہے۔ تمہیں جمع خاطر رکھنی چاہئے کہ بابر کا رشتہ میری بیٹی سے نہ سہی میری چھوٹی بہن کی بیٹی سے طے پا چکا ہے۔“

”خیر اس سے مجھے کیا؟“ سلطان احمد مرزا نے بے نیازی اور بے زاری سے کندھے اچکائے۔ ”میں کل صبح ہی خان یونس خان کی عیادت کے لئے روانہ ہو رہا ہوں۔“

مہر نگار خانم نے کوئی جواب نہیں دیا۔ خاموشی سے ادھ کھلے دریچے میں جا کھڑی ہوئی تھی، اس کی زندگی کی طرح چاند تاروں سے محروم آسمان سنسان اور ویران دکھائی دے رہا تھا۔ سیاہ بادلوں نے آسمان کی نیلاہٹ ڈھانپ لی تھی۔ ہر سمت روح نگار تاریکی بکھری ہوئی تھی۔

☆......☆......☆

منگولستان کے دارالحکومت میں واقع شاہی محل ”کاخ زرد“ کی فضاؤں میں اداسی رچی ہوئی تھی۔ کئی مہینوں تک صاحب فراش رہنے کے بعد خاقان یونس خان مالک حقیقی سے جا ملا تھا۔ وہ اپنی زندگی میں ہی اپنی سلطنت دونوں بیٹوں میں تقسیم کر گیا تھا۔ اس لئے اس کی موت کے بعد تخت و تاج کے حوالے سے کوئی ہنگامہ نہیں کھڑا ہوا تھا۔

یونس خان ایک ذہین، باشعور، متین اور باوقار انسان تھا۔ اس کا شجرہ نسب بارھویں پشت میں چنگیز خان سے مل جاتا ہے۔ اس نے جلاوطنی کے دور میں ایران کے مختلف شہروں میں رہ کر مخکوم خانہ بدوش ناشائستہ عادات ترک کر کے تعلیم یافتہ اور مہذب ایرانیوں والے طور طریقے سیکھ لئے تھے۔ اسے اپنی تینوں بیٹیوں سے بے حد محبت تھی۔ وہ ایک محبت کرنے والا باوفا اور مخلص انسان تھا۔ تمام عمر وہ اپنے مربی اور محسن ابو سعید مرزا کے احسانوں کے بوجھ تلے دبا اس کی اولاد کی بھلائی اور بہتری کے لئے کوشاں رہا۔ وہ ہمیشہ ہی اپنے تینوں دامادوں کے مابین جنگ و جدال کو روکنے کی غرض سے اور ان کے باہمی تنازعات کو دور کرنے کے لئے ثالث کا کردار ادا کرتا رہا۔ وہ ایک غیر معمولی راست باز اور قابل محبت کردار کا انسان ہونے کی وجہ سے اس کی شخصیت اس کے دامادوں اور ہم عصروں میں ہمیشہ ہی عزت و تکریم سے دیکھی جاتی تھی۔

اسے عمر سعید مرزا سے خاص انسیت تھی، اس لئے وہ اپنے نواسے بابر کو بے پناہ چاہتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ سلطان عمر سعید نے اپنی ناسمجھی اور عاقبت نااندیشی سے جب بھی وبال خریدا، یونس خان اسے ان کے بد نتائج سے بچانے کے لئے بار بار کوشش کرتا رہا۔

خاقان اعظم یونس خان کے کردار و اخلاق کی وجہ سے اس کی جو عزت و عظمت اس کے ہم عصروں اور حلیفوں میں تھی۔ اس کا سب سے نمایاں ثبوت یہ تھا کہ جب سلطان عمر سعید مرزا اور سلطان احمد مرزا تاشقند اور شاہ رخیہ کے سرحدی صوبوں کے متعلق تنازع میں کسی سمجھوتے پر نہ پہنچ سکے تو دونوں فریق متنازع علاقوں کو یونس خان کے سپرد کر کے اس مسئلے کو حل کرنے پر رضامند ہو گئے تھے۔

اور اب جبکہ یونس خان دنیا میں نہیں رہا تھا تو تاشقند اور شاہ رخیہ کا مسئلہ پھر سے اٹھ کھڑا ہوا تھا۔ یونس خان کے بڑے بیٹے محمود خان کے حصے میں آئے علاقوں میں یہ دونوں صوبے بھی شامل تھے، اور وہ اب ان صوبوں کو چھوڑنے پر تیار نہ تھا۔

دوسری طرف تیموری بھائیوں، سلطان احمد مرزا اور سلطان عمر سعید مرزا کا دعویٰ تھا کہ تاشقند اور شاہ رخیہ کے علاقے یونس خاں کے قبضے میں صرف اختلافی حقوق کا فیصلہ ہونے تک عارضی طور پر دیئے گئے تھے۔

ابھی موسم سرما کا آغاز نہیں ہوا تھا۔ اندجان کے نیلے آسمان پر سورج اپنی آب و تاب کے ساتھ چمکتا تو ہر سو تمازت بھری دھوپ بکھری بھلی معلوم دیتی۔ ایسے خوشگوار موسم میں سلطان عمر سعید مرزا چوسر کھیلنا پسند کرتا تھا۔ ابتدا میں وہ بہت زیادہ شراب نوشی کا عادی تھا۔ مگر قتلق نگار خانم کی رفاقت میں رہ کر اور اس کے سمجھانے بجھانے کے باعث اب ہفتے میں ایک آدھ بار ہی وہ ساغر و مینا سے جی بہلاتا تھا۔ البتہ اب اسے افیون کھانے کی عادت پڑ گئی تھی۔

اس دوپہر وہ خاص امراء قاسم بیگ قوچین، بابا قلی بیگ اور قنبر علی مغل کے ساتھ وہ تاشقند اور شاہ رخیہ کے حوالے سے صلاح مشورے میں مصروف تھا۔

”میں چاہتا ہوں، ہم اپنے تمام تر وسائل کو بروئے کار لا کر ایک زبردست لشکر تشکیل دیں......اور اس سے قبل کہ بھائی احمد مرزا، خان محمود خان سے معرکہ کر کے وہ دونوں صوبے حاصل کریں......ہمیں ان صوبوں کے حصول کے لئے اس آگ میں کود جانا چاہئے۔“

”ارادہ ایسا کچھ برا نہیں۔“ بوڑھے وزیر قاسم بیگ قوچین نے سنجیدہ اور گمبھیر آواز میں کہا۔ ”مگر ہمیں فیصلہ بہت سوچ سمجھ کر کرنا ہو گا۔ ایسا نہ ہو ہمارا اس آگ میں بے دھڑک کود جانا......ہمارے لئے نقصان دہ ثابت ہو۔“

”قاسم بیگ قوچین۔“ عمر سعید مرزا نے قدرے حیرت اور ناگواری سے اس کی طرف دیکھا۔ ”تم لشکر اندجان کے قدیم سرداروں میں سے ہو، بہت بہادر اور دلاور ہو۔ یاد کرو، ایک بار ازبک، کاشان کے نواح میں لوٹ مار مچا کر چلے گئے تھے، تم نے ان کا تعاقب کیا اور کچھ دور جا کر انہیں دھر لیا، کیسی عبرت ناک حالت کر دی تھی تم نے ان کی......اور آج اس پل تم ہمیں آگ سے دامن بچا کے چلنے کی صلاح دے رہے ہو۔ تعجب ہے۔“

”سلطان معظم میری بات کا غلط مطلب لے رہے ہیں۔“ وہ بدستور سنجیدہ لہجے میں جواب دہ ہوا۔ ”میرا کہنا ہے کہ ہمیں محمود خان کی طاقت کا غلط اندازہ نہیں کرنا چاہئے۔ یہ درست ہے ایک مدت سے منگولستان کے شہری و سپاہ سلطان کے وفادار اور عزت و تکریم دینے والوں میں شامل ہیں، سلطان اس سلطنت کے داماد ہی نہیں بلکہ وہاں کے حکمراں خان یونس خان کی بے حد عزیز شخصیت بھی رہے ہیں مگر اب صورت حال یکسر تبدیل ہو چکی ہے۔ محمود خان گو کہ آپ کا برادر نسبتی ہے۔ مگر اس سے آپ کسی بھلائی کی امید مت رکھیے......اور نہ ہی اس کے لشکر کا غلط تخمینہ لگائیے۔“

”اسی لئے تو میں چاہتا ہوں۔“ سلطان نے قاسم بیگ قوچین کی بات کو سمجھتے ہوئے تائید بھرے انداز میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ”کہ ہمیں از سر نو ایک نیا اور بڑا لشکر تشکیل دینا ہو گا۔“

”لشکر کی تشکیل اور لشکریوں کے اخراجات کی مد میں ہمارا خزانہ خالی ہو سکتا ہے۔ ہمیں اپنے وسائل کو مدنظر رکھتے ہوئے کوئی قدم اٹھانا چاہئے۔“ بابا قلی بیگ نے دھیمی آواز میں اپنی رائے کا اظہار کیا۔ شیخ فرید بیگ کے انتقال کے بعد شہزادے ظہیر الدین بابر کی تعلیم و تربیت کی ذمے داری اسے سونپی گئی تھی۔

”تو گویا آپ لوگ یہ چاہتے ہیں کہ میں لاؤ لشکر لے کر محمود خان پر چڑھائی کر کے اپنے مقبوضہ صوبے حاصل کرنے کی کوشش نہ کروں، یہاں تک کہ بھائی احمد مرزا اپنا زبردست لشکر لے کر محمود خان سے یہ علاقے چھین کر قابض ہو جائے......کہیے کیا آپ لوگوں کا یہی منصوبہ ہے۔“

”نہیں۔“ بوڑھے میر علی دوست طغائی نے سفید ریش پر ہاتھ پھیرتے ہوئے دھیمی آواز میں کہا۔ ”ہم ایسا کس طرح چاہ سکتے ہیں۔ ہم بھی چاہیں گے کہ تاشقند اور شاہ رخیہ کے صوبے فرغانہ سلطنت کا حصہ بن جائیں مگر اس مقصد کے لئے ہم آپ کو زبردستی جنگ میں کودنے سے باز رکھنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ آپ ان صوبوں کے حصول کے لئے ضرور جنگ کیجئے مگر اس کے لئے تھوڑا انتظار کیجئے۔ اپنے وسائل پر توجہ دیجئے اور حسب توفیق جنگ کی تیاری کیجئے، ملک کے تمام وسائل جنگ کی تیاری میں جھونک دینا عقلمندی نہیں ہے۔“

سلطان نے نظریں اٹھا کر اپنے اس بوڑھے امیر کی طرف دیکھا جو اس کی ساس ایسن دولت بیگم کے قبیلے ساغرچی سے تھا، اس حوالے سے سلطان اس کا بہت لحاظ کرتا تھا۔

کافی دیر تک جنگ کے وسائل اور حکمت عملی پر بحث ہوتی رہی۔ آخر میں وہی فیصلہ ہوا جو سلطان نے پہلے سے سوچ رکھا تھا۔ پورا خزانہ ایک طاقتور لشکر بنانے میں جھونک دیا گیا۔ وہ اپنے بھائی پر سبقت لے جانے کے لئے بے تاب تھا۔ نہایت برق رفتاری کے ساتھ جنگ کی تیاری کی گئی اور نہایت راز داری کے ساتھ وہ اپنا لشکر لے کر فرغانہ سے نکلا اور اچانک دھاوا بول کر تاشقند کے ایک اہم قلعہ اُشتر پر قبضہ کر لینے میں کامیاب ہو گیا۔

مگر یہ قبضہ تادیر قائم نہیں رہ سکا کیونکہ محمود خان کے اعلیٰ ترین وسائل کے سامنے اس کے وسائل بہت کمزور تھے۔ محمود خان نے اپنے چھوٹے بھائی شمالی منگولستان کے حکمراں احمد خان کو بھی بلانے کی زحمت گوارا نہ کی۔ وہ اپنا لشکر جرار لے کے آگے بڑھا اور اشتر کے قلعے پر حملہ کر دیا۔

سلطان عمر سعید مرزا کے لشکر نے مزاحمت کی، قیامت کا رن پڑا۔ محمود خان اپنے تازہ دم لشکریوں کے ساتھ سلطان عمر سعید مرزا کی سپاہ کو گاجر مولی کی طرح کاٹتا، کیڑے مکوڑوں کی طرح مسلتا آگے بڑھا اور اشتر کے قلعے پر ٹوٹ پڑا۔ اس نے قلعے پر متعین سلطان کے ایک ایک سپاہی کو تہہ تیغ کر دیا۔ ہر طرف چیخ و پکار تھی، زخمیوں کی آہ و بکا تھی، لاشوں کے انبار تھے اور خون کی ندیاں بہہ رہی تھیں۔

سلطان عمر سعید مرزا اپنا بڑا لشکر ضائع کر کے اور بدترین ہزیمت اٹھا کر فرغانہ کی طرف واپس لوٹ آیا۔

موسم سرما اپنے ساتھ شدید برف باری لایا تھا۔ اسی دوران ایک خطائی قافلہ اندجان میں آ رہا تھا۔ یہ قافلہ جب کوہستان شرقی کے اطراف میں آیا تو ایسی برف پڑی کہ تمام اہل قافلہ ہلاک ہو گئے۔ صرف دو آدمی بچے۔

وہ دونوں افراد بھوک پیاس اور شدید سردی کا سامنا کرتے آخر کار سلطان کے دربار میں جا پہنچے۔ ان کی داستان الم سن کر سلطان عمر سعید مرزا کا دل کرب سے بھر گیا تھا۔

”میرے دوستو! تمہارا اور تمہارے ساتھ آنے والے قافلے کے لوگوں کا احوال سن کر مجھے دلی رنج ہوا ہے۔ تم اس دربار میں خود کو تنہا مت سمجھو، اور جو کچھ مدد درکار ہو، بے دھڑک اظہار کرو۔“

”سلطان معظم کا اقبال بلند ہو۔“ ایک شخص جس کا نام طغرہ خان تھا، نے بلند آواز سے نعرہ لگایا۔ پھر کچھ دیر توقف کے بعد دھیمی آواز میں گویا ہوا۔ ”سلطان معظم ہمارے قافلے کے ساتھ خطائی سوداگران تھے، جن کے پاس تجارت کا قیمتی سامان، ریشم و اطلس کا کپڑا، سچے موتی اور زمرد و یاقوت بڑی مقدار میں موجود تھے۔ وہ تمام مال و متاع برف میں غرق ہو گیا......کیا ہی اچھا ہو آپ اس سامان بربادکو تلاش کروانے کا حکم صادر فرمائیں۔“

سلطان کو طغرہ خان کا مشورہ پسند آیا۔ اسی وقت اپنے خدام کو بھیج کر تمام مال و اسباب جمع کروا کر منگوا لیا۔ لاکھوں روپے کی مالیت کا سونا اور جواہرات ہاتھ لگے تھے اور اس خزانے کا کوئی وارث بھی موجود نہ تھا۔ خود سلطان کا یہ حال تھا کہ وہ اپنے تمام تر وسائل محمود خان سے جنگ میں جھونک کر خالی ہاتھ بیٹھا تھا۔

یہ مال و زر اس کے بہت کام آ سکتے تھے مگر امانت داری کے جذبے نے امانت میں خیانت کا خیال بھی نہ آنے دیا۔ اس نے اپنے سپاہی بھیج کر خراسان اور سمرقند سے اس مال و اسباب کے وارثوں کو بلایا اور وہ مال اس کے ورثاء کے حوالے کر دیا۔

”مجھے آپ پر فخر ہے بابا جان۔“ ظہیر الدین بابر نے باپ کو محبت بھری نگاہوں سے دیکھتے ہوئے کہا۔ ”اس وقت امور سلطنت چلانے کے لئے آپ کو مال و متاع کی کس قدر ضرورت ہے۔ مگر اس کے باوجود آپ نے کس دیانتداری اور امانت داری کا ثبوت دیا جبکہ اس دولت کا کوئی وارث تھا ہی نہیں......“

”ہاں بیٹے۔“ سلطان عمر سعید مرزا نے بیٹے کو پیار بھری نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔ ”سلطان کا مطلب امانت دار اور دیانت دار ہونا ہے۔ خدا جس کو بھی حکمرانی کا اعزاز بخشتا ہے، یہ اس کا فرض ہے کہ اس کی مخلوق سے دیانتداری کے ساتھ پیش آئے۔ جب تم حکمراں ہو گے تو تم بھی اس بات کا بے حد خیال رکھنا۔“

”جی بابا جان۔“ بابر نے سعادت مندی سے سر جھکاتے ہوئے جواب دیا۔ باپ کے کردار کے اس روپ نے اس کے دل میں باپ کی محبت اور عزت کچھ اور بڑھا دی تھی۔

☆......☆......☆

بدخشاں کے سلطان، احمد مرزا نے محل کے جھروکے سے محل کے سامنے واقع وسیع و عریض میدان کی طرف دیکھا۔ جہاں آج شاہی لشکر کو معائنے کے لئے طلب کیا گیا تھا۔ اپنے لشکر جرار پر نظر پڑتے ہی سلطان احمد مرزا کا سر نخوت سے کچھ اور اونچا ہو گیا تھا۔

”مجھے یقین ہے ہماری یہ بہادر سپاہ ہمارے مقبوضہ صوبے حاصل کرنے میں کامیاب رہے گی۔“ سلطان نے گردن کو ذرا سا خم دے کر اپنے دائیں جانب کھڑے فوجی سردار ابجد خان کی طرف دیکھا۔

”اِن شاءاللہ۔“ ابجد خان نے باوثوق لہجے میں جواب دیا۔

”مجھے یقین ہے ہمارے سپاہی سلطان عمر سعید مرزا کے سپاہیوں کی طرح کردار ادا نہیں کریں گے۔“ اس کے خاص مشیر افضل بیگ نے دھیمی مگر طنزیہ انداز میں کہا۔

”عمر سعید کا لشکر چار دن میں تیار کیا گیا تھا۔“ ابجد خان نے تحقیر آمیز انداز میں کہا۔ ”ہمارا یہ لشکر پورے سال کی محنت، کوشش اور تیاری کا نتیجہ ہے۔ ہم پچھلے پورے سال سے اس جنگ کی تیاری کر رہے ہیں اور اب معرکہ سر کرنے کے لئے بالکل تیار ہیں۔“

”دیکھتے ہیں کیا ہوتا ہے؟“ ایک اور فوجی سردار شاہی بیگ شیبانی نے بے نیازی سے کندھے اچکاتے ہوئے کہا اور آگے بڑھ گیا۔

”سلطان معظم! یہ شاہی بیگ کبھی کبھی بڑے عجیب انداز سے پیش آتا ہے۔“ ابجد خان کو شاہی بیگ کی بات پسند نہ آئی تھی، اس لئے دھیمی آواز میں سلطان سے ہم کلام ہوا۔ ”کبھی کبھی اس کی حرکتیں بہت زیادہ مشکوک لگنے لگتی ہیں۔“

”ہٹاؤ اس ذکر کو۔“ سلطان بیزاری سے بولا۔ ”اس وقت شاہی بیگ سے زیادہ اہم امور قابل ذکر ہیں۔“

چند قدموں کے فاصلے پر ایک ستون کی آڑ میں کھڑا شاہی بیگ ابجد خان کا خود پر کیا گیا تبصرہ سن رہا تھا۔ غصے سے اس کا گلابی چہرہ سرخ ہو گیا تھا اور نیلگوں آنکھوں سے شعلے لپکنے لگے تھے۔

”ابجد خان! میں تمہاری امید ٹوٹنے نہیں دوں گا۔“ اس نے دانت کچکچا کر کہا اور لمبے لمبے ڈگ بھرتا دوسری جانب نکل گیا۔

سلطان کے اردگرد موجود لوگ ہمیشہ ہی اس کے خلاف سلطان کے کان بھرا کرتے تھے۔ وہ کتنی بار سلطان کے سامنے اپنی صفائیاں پیش کر چکا تھا۔ اور اب حقیقت میں وہ اسی نہج پر سوچ رہا تھا۔ اس نے فیصلہ کیا کہ وہ خفیہ طور پر سلطان محمود خان سے رابطہ کرے گا......اور لوگوں کی کہی گئی جھوٹی باتوں کو سچ کر دکھائے گا۔ چنانچہ جلد ہی اس کا خان محمود خان سے نا صرف رابطہ ہو گیا بلکہ تمام معاملات بھی طے پا گئے تھے۔

سلطان احمد مرزا ایک لاکھ پچاس ہزار سپاہ کا لشکر لے کر تاشقند پر حملہ آور ہوا۔ محمود خان مقابلے کے لئے بڑھا اور شہر دریائے سیموں کے درمیان مورچہ بند ہو گیا۔ اسے سلطان کے فوجی اہلکار شاہی بیگ سے مدد کی امید تھی۔ معاملات پہلے سے طے تھے۔ چنانچہ طے شدہ پروگرام کے تحت محمود خان نے اپنے دشمن کو دریا پار کرنے کا موقع فراہم کیا۔ اس دریا نے دونوں فوجوں کو ایک دوسرے سے فاصلے پر رکھا ہوا تھا۔ احمد مرزا کی فوجیں جوں ہی دریا پار اتریں، محمود خان نے اچانک ہی سامنے سے حملہ کر دیا۔ غدار شاہی بیگ اپنا دستہ لے کر پیچھے سے اپنے ہی ساتھیوں پر ٹوٹ پڑا۔ اس دوطرفہ حملے نے احمد مرزا کی سپاہ کو بوکھلا کر رکھ دیا۔ مارے گھبراہٹ اور وحشت کے سپاہ میں افراتفری پھیل گئی اور جس دریا کو بھی پار کیا تھا، اس میں سپاہ کو دھکیل دیا گیا۔ ہزاروں سپاہی دریا بُرد ہو گئے۔ باقی جو کسی طرح دریا سے نکل کر خشکی کی طرف دوڑے، انہیں محمود خان کے خنجر بکف اور شمشیر بہ زن سپاہیوں کا سامنا کرنا پڑا۔ ہزاروں سپاہی قتل کر دیئے گئے۔ کچھ لشکر کے پیروں تلے آ کر مارے گئے تو ہزاروں زخمی ہو گئے۔

سلطان احمد مرزا، محمود خان کی طاقت سے مرعوب اور خائف ہو کر واپس لوٹ گیا۔ چند دنوں کی اس جنگ میں سال بھر کی مسلسل کوششوں سے تیار کیا گیا ڈیڑھ لاکھ کا لشکر برباد ہو گیا تھا۔

کچھ عرصے بعد دونوں حریفوں جو رشتے میں برادر نسبتی اور بہنوئی بھی تھے، کے مابین ایک معاہدہ طے پا گیا۔ اور سلطان احمد مرزا نے اپنے حرم سے تین حسین و رعنا کنیزیں، محمود خان کی خدمت میں بھجوا دیں۔

ادھر فرغانہ کا سلطان، عمر سعید مرزا، ایک بار پھر تاشقند اور شاہ رخیہ کے مقبوضات پر غور و فکر کرنے میں مصروف تھا۔

اب ظہیر الدین بابر گیارہ سال کا ہو چکا تھا۔ وہ ایک ذہین، سنجیدہ اور بُردبار لڑکا تھا۔ سعید مرزا اہم معاملات میں بابر سے مشورہ لینا ضروری سمجھنے لگا تھا۔ تمام ہی سرکاری مجالس میں وہ بابر کو اپنے ساتھ رکھنا پسند کرتا تھا۔

اس شام محل کے ایوان خاص میں سلطان عمر سعید مرزا نے تمام فوجی سرداروں اور اپنے چیدہ چیدہ رفقاء کار کو ملاقات کے لئے طلب کیا۔ گول تخت پر مخملی توشک پر زرنگار گاؤ تکیے کے سہارے سلطان کے پہلو میں بیٹھی تھی۔ ساتھ ولی عہد شہزادہ بھی موجود تھا۔

”میں چاہتا ہوں کہ ایک بار پھر پوری طاقت کے ساتھ محمود خان پر ضرب لگائی جائے۔“

”تایا جان، احمد مرزا نے بھی بھرپور طاقت کے ساتھ ماموں جان محمود خان پر حملہ کیا تھا......مگر......“ بابر نے نہایت تحمل اور سنجیدگی سے بات کا آغاز کیا۔ ”بابا جان، ہم ایک بار پہلے بھی، ماموں جان محمود خان پر حملہ کر کے ہزیمت اٹھا چکے ہیں......تو اب لازم ہے کہ اس بار بہت سوچ سمجھ کر قدم اٹھایا جائے۔“

”اسی لئے تو آج ہم یہاں سب جمع ہیں۔“ سلطان عمر سعید مرزا کے لبوں پر شرمساری سی مسکراہٹ بکھر گئی۔ ”مگر میرے بیٹے، میں نے یہ فیصلہ کر لیا ہے کہ اپنے جیتے جی محمود خان کو میں اپنے صوبے یوں آسانی سے ہضم نہیں کرنے دوں گا۔“

”بابا جان، کیا جنگ کے بغیر یہ مسئلہ حل نہیں ہو سکتا۔“ بابر نے بے حد سنجیدگی سے سوال کیا۔ ”آخر کو محمود خان اور احمد مرزا ہمارے قریبی رشتے دار ہیں، ہم سب بات چیت کے ذریعے بھی تو معاملات حل کر سکتے ہیں......پھر بھلا اس تیر تفنگ اور نشتر و تلوار کی ضرورت کیا ہے۔“

”میرے معصوم بیٹے، تم اپنے ان قریبی رشتے داروں کی ریشہ دوانیوں سے واقف نہیں ہو۔“ عمر سعید مرزا نے دھیمی آواز میں چبا چبا کر الفاظ ادا کیے۔ ”ان کے ساتھ نمٹنے کا یہی ایک طریقہ ہے کہ انہیں کبھی چین سے نہ بیٹھنے دیا جائے......اور ہر وقت ان کے سروں پر جنگ کی تلوار لٹکا کر رکھی جائے۔“

عمر سعید مرزا کے تازہ حملے کی تیاریوں کی خبر محمود خان تک پہنچی تو وہ پریشان ہونے سے زیادہ عمر سعید مرزا کی تنگ کرنے والی فطرت سے الجھن کا شکار ہو گیا اور اس نے فوری طور پر بدخشاں کے حکمراں سلطان احمد مرزا سے رابطہ کیا۔

”سلطان احمد مرزا! تمہارا بھائی محمد سعید مرزا پھر ایک نیا لشکر تشکیل دینے کی فکر میں ہے۔“

”کیا؟“ احمد مرزا بری طرح چونک اٹھا۔ محمود خان پر حملہ کرنے کا مطلب تھا کہ وہاں سے فارغ ہوتے ہی عمر سعید مرزا کے بدخشاں کا رخ کرنا۔ عمر سعید مرزا کا طاقتور ہونا، محمود خان کے لئے ہی نہیں خود اس کے لئے بھی خطرناک ہو سکتا تھا۔

”آپ کسی دن شام کو میرے غریب خانے تشریف لے آیئے۔“ احمد مرزا نے محمود خان کو پیغام بھجوایا۔ ”آپ اپنی بہن سے مل بھی لیں گے اور ہم سب کے ساتھ کھانا بھی کھا لیں گے۔ ساتھ ہی ساتھ ہم ان اہم اور جلد توجہ طلب معاملات پر گفت و شنید بھی کر لیں گے۔“

”ٹھیک ہے۔“ محمود خان نے جواب دیا۔ ”آپ کی اس دعوت کے لئے میں آپ کا شکر گزار ہوں......کیونکہ یہ معاملات فوری توجہ کے متقاضی ہیں، اس لئے میں اسی جمعے کی شام کو آپ کے دولت کدے پر حاضر ہو جاؤں گا۔“

نیلا آسمان سرمئی بدلیوں سے بھرا ہوا تھا۔ بادلوں کی وجہ سے شام کی سرمئی رنگت کچھ اور گہری ہو گئی تھی۔ ہلکی پھوار نے ہواؤں میں مٹی کے سوندھے پن کے ساتھ ایک روح پرور نمی بھی گھول دی تھی۔ موسم بے حد خوشگوار تھا اور احمد مرزا کا مزاج بھی آج خلاف معمول بہت خوشگوار تھا۔

”آج رات کے کھانے پر تمہارا چھوٹا بھائی محمود خان آ رہا ہے۔“ اس نے ارغوانی نمدے پر خاکستری گاؤ تکیے کے سہارے بیٹھی اپنی پہلی بیوی مہر نگار خانم کو اطلاع بہم پہنچائی۔ ”میرا خیال ہے کہ تم اپنے بھائی سے ملنا پسند کرو گی؟“

”میرا تو خیر وہ بھائی ہے۔“ مہر نگار خانم نے حسب عادت تیکھے لہجے میں کہا۔ ”یہ تم آج کل اس پر اس قدر مہربان کیوں ہو رہے ہو جبکہ کل تک اسی کے خلاف فوج کشی کے منصوبے بناتے رہے تھے۔“

”سیاست کا یہی اصول ہے۔“ وہ بے غیرتی سے ہنسا۔ ”خود سے کمزور کو دباؤ اور خود سے طاقتور کے سامنے جھک جاؤ۔ پچھلی جنگ میں یہ ثابت ہو گیا ہے کہ فی الحال محمود خان مجھ سے زیادہ طاقتور ہے۔ اس لئے مجھے اس کے سامنے جھکنا پڑا......رہا سوال تمہارا......تو اگر تمہارا دل چاہے تو تم ہمارے ساتھ رات کے کھانے میں شامل ہو جانا ورنہ دلبر بیگم بہرحال شریک دسترخوان ہوں گی۔“

مہر نگار بیگم سے شادی کے کچھ ہی عرصے بعد اس نے دوسری شادی کر لی تھی۔ ترخانان بیگم ترخانوں میں سے تھی۔ تیسری دلبر بیگم تھی، جس کو مرزا نے اپنے حرم میں داخل کر لیا تھا۔ مرزا کو اس عورت سے بے حد محبت تھی اور وہ مرزا پر بے حد حاوی تھی۔ بے حد تیز طرار، ہر وقت بناؤ سنگھار کیے رہتی تھی۔ مرزا کے مرد مہمانوں میں بھی اسے بیٹھنے میں کوئی عار نہ تھا۔ شراب بھی پیتی تھی۔ اس کے ہوتے مرزا کسی دوسری عورت کو نگاہ اٹھا کر دیکھنے کی جسارت نہ کر سکتا تھا۔

شام کے گہرے ہوتے ہی محمود خان اپنے چند قریبی اور چنیدہ ساتھیوں کے ساتھ آ موجود ہوا۔ مرزا احمد نے دروازے پر معزز مہمانوں کا استقبال کیا۔ پھر طعام گاہ میں لے آیا۔ طعام گاہ کے دروازے پر مہر نگار خانم نے اپنے بھائی محمود خان کا خیر مقدم کیا۔

”کیسی ہو آپا؟“ محمود خان نے محبت بھرے لہجے میں سلام کر کے خیریت دریافت کی۔

”کرم ہے اوپر والے کا۔“ مہر نگار روکھے لہجے میں جواب دہ ہوئی۔ اُسی پل دلبر بیگم ایک ادا کے ساتھ طعام گاہ میں داخل ہوئی۔ اس کے آتے ہی گویا چراغوں میں روشنی نہ رہی تھی۔ محمود خان بھی بہن کو بھول کر اس کی طرف متوجہ ہو گیا اور احمد مرزا تو اسے دیکھتے ہی بہکنے لگا تھا۔

چند ہی لمحوں میں مہر نگار کو یوں محسوس ہونے لگا جیسے وہ اس محفل میں موجود ہی نہیں ہے۔ کوئی بھی اس کی طرف متوجہ نہ تھا۔ محمود خان اور اس کے ساتھیوں سمیت احمد مرزا سب ہی دلبر بیگم کی آؤ بھگت میں مصروف تھے۔ وہ خاموشی سے اٹھی اور شکستہ قدموں اور گرفتہ دل کے ساتھ اپنے کمرے میں چلی گئی۔

خدام نے دبیز مخملی قالین کے بیچوں بیچ دسترخوان لگا دیا تھا۔ دسترخوان کے دونوں جانب نرم توشک لگے تھے جن پر گاؤ تکیوں کے سہارے مہمان بیٹھے تھے۔

چند ہی لمحوں بعد طعام گاہ میں اشتہا انگیز کھانوں کی مہک پھیل گئی۔ دنبے کی چربی میں پکے لذیذ کھانے مہمانوں کی بھوک بڑھا رہے تھے۔ خدام خالی پیالوں میں خوشبودار مشروب انڈیلتے جا رہے تھے۔ بے حد خوشگوار ماحول میں کھانا کھایا گیا۔ کھانے کے بعد احمد مرزا، محمود خان اور اس کے نزدیکی ساتھیوں کو اپنے ساتھ لئے اپنے کمرۂ خاص میں چلا گیا۔

چند ہی لمحوں بعد ایک خادم گرم خوشبودار قہوہ پیش کر گیا تھا۔ قہوے کی چسکیوں کے درمیان ان لوگوں نے عمر سعید مرزا کی شرارتوں کے بارے میں بات شروع کی۔

”پچھلی بار میرے ساتھ جنگ میں منہ کی کھانے کے باوجود اسے عقل نہیں آئی۔“ محمود خان نے قدرے غصیلے لہجے میں بات کا آغاز کیا۔ ”سمجھدار تو ایک ٹھوکر کھا کر ہی سنبھل جاتے ہیں۔“ اس نے گردن کو ہلکا سا خم دے کر احمد مرزا کی طرف دیکھا۔ ”مگر بدعقل منہ کے بل گرنے سے پہلے اپنی چال سیدھی نہیں کرتے۔“

”تو اب......آپ نے کیا سوچا ہے؟“ احمد مرزا نے قہوے کا خالی پیالہ خادم کی گول سینی میں رکھتے ہوئے محمود خان کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا۔ ”ان حالات میں ہمیں اب کرنا کیا چاہئے؟“

”جب تک اسے اچھی طرح سبق نہ سکھایا جائے، وہ سمجھنے والا نہیں ہے۔“ محمود خان نے سانپ کی طرح پھنکارتے ہوئے کہا۔ ”اس سے قبل کہ وہ لشکر تیار کر کے ہم پر حملہ آور ہو، ہمیں اپنے لشکروں کے ساتھ اس پر حملہ کر دینا چاہئے۔“

”آپ کا مطلب ہے......آپ اور میں مل کر اس پر حملہ آور ہوں۔“ احمد مرزا نے قدرے حیرانی سے سوال کیا۔

”مل کر ایک ساتھ نہیں۔“ محمود خان نے وضاحت کی۔ ”آپ اپنی طرف سے روانہ ہوں گے اور میں اپنی طرف سے۔ البتہ حملہ ہم متحد ہو کر کریں گے۔“

”ٹھیک ہے۔“ احمد مرزا نے اثبات میں سر ہلایا۔ ”اس جنگ کا حاصل کیا ہو گا؟“

”ہم ایک فیصلہ کن جنگ لڑیں گے اور جب تک عمر سعید مرزا کو اس کے علاقوں سے محروم نہ کر دیا جائے، یہ جنگ جاری رہے گی۔“

”آپ ٹھیک کہتے ہیں۔“ احمد مرزا نے گہرا سانس لیا۔ ”جب تک اسے اس کے علاقوں سے محروم نہیں کیا جائے گا، وہ اپنی سازشوں اور شرارتوں سے باز نہیں آئے گا۔ اس لئے مناسب یہی ہے کہ اس سے اس کا سب کچھ چھین کر اسے مزید آفت برپا کرنے سے روک دیا جائے۔“

اس ایک نقطے پر متفق ہونے کے بعد وہ لوگ باہم سر جوڑے دیر تک جنگی حکمت عملی پر غور کرتے رہے تھے۔

انہوں نے فرغانہ پر ایک زبردست حملے کا منصوبہ تیار کر لیا تھا۔

سلطان احمد مرزا کو تاشقند سے روانہ ہو کر دریائے سیموں کے جنوب میں سڑک کے ذریعے فرغانہ میں داخل ہو کر براہ راست دارالحکومت اندجان پر حملہ کرنا تھا۔ دوسری جانب اپنے بہتر وسائل کی بناء پر محمود خان کو دریا کے شمال میں درّے سے گزر کر اخسی کے قلعے پر قبضہ کرنا تھا۔

محمود خان کے واپس لوٹتے ہی جنگ کی تیاریاں بڑے زور و شور سے شروع کر دی گئی تھیں۔ دونوں ہی فریق بے حد جوش و جذبے سے اپنے اپنے وسائل بروئے کار لا کر زادِ جنگ مہیا کر رہے تھے۔

ماہ مئی کے آغاز کے ساتھ ہی حملے کے پہلے مرحلے میں منصوبے کے مطابق عملدرآمد ہوا......اور ایسا لگنے لگا کہ فرغانہ کی قسمت پر بربادی کی مہر لگنے والی ہے۔

ایسے میں عمر سعید مرزا نے یہ قدم اٹھایا۔ اپنے تمام وزراء اور مشیران کو جمع کیا اور اس صورتحال سے سب کو آگاہ کیا۔

”بابا جان! کیا ایسا ممکن نہیں کہ ہم ماموں جان محمود خان اور تایا جان احمد مرزا سے گفت و شنید کے ذریعے ان مسائل کا حل نکال سکیں۔“ بابر نے دھیمی آواز میں سوال کیا۔

”وہ لوگ باتوں کے نہیں لاتوں کے بھوت ہیں۔“ عمر سعید مرزا نے قدرے ناگواری سے جواب دیا۔ ”وہ صرف خنجر و شمشیر کی زبان سمجھتے ہیں۔“

”تو اب ہم کو کیا کرنا ہو گا؟“ گیارہ سالہ بابر کی دھیمی آواز میں تشویش کا تاثر خاصا نمایاں تھا۔

”میں نے سوچ لیا ہے کہ ہمیں کیا کرنا ہے۔“ عمر سعید مرزا نے پُر سوچ نظروں سے اپنے ہونہار اور ذمے دار بیٹے ظہیر الدین بابر کی طرف دیکھا اور پھر اسی شام کو وہ دارالحکومت بابر کے حوالے کر کے خود اخسی کیلئے روانہ ہو گیا تاکہ وہاں اپنے لشکر کو مرتب کر کے ایک آخری بھرپور معرکہ آرائی کر سکے۔

نوعمر بابر کے کاندھوں پر حکومت کی ذمہ داری اچانک ہی آ پڑی تھی۔ گو کہ عمر سعید مرزا نے جاتے وقت اپنے اتالیق خدابردی اور دیگر قابل اعتماد بیگ سرداروں کو بابر کی مدد اور مشاورت کے لئے چھوڑ دیا تھا۔

رات کی تاریکی میں وہ اخسی میں داخل ہوا۔ اپنے مکان میں پہنچتے ہی اس نے تمام فوجی سرداروں کو طلب کر لیا۔ تمام رات جنگی حکمت عملی پر غور و فکر جاری رہا۔ اگلی صبح عمر سعید مرزا نے لشکریوں کو حاضر ہونے کا حکم جاری کیا۔ ہتھیاروں کی جانچ پڑتال شروع ہوئی۔ دھڑا دھڑ ہتھیار ڈھلنے لگے، پرانے ہتھیاروں کی مرمت کی گئی، دھار لگوائی گئی۔ زرہ بکتر اور ڈھالوں کی مرمت کا کام بھی جاری تھا۔ جانور کا شمار شروع ہوا۔ نئے گھوڑے مہیا کیے گئے۔

گویا مئی کے آخر تک سلطان عمر سعید مرزا ایک اچھی خاصی تعداد میں فوج اکٹھا کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ اس فوج سے وہ میدان جنگ میں اپنے بھائی احمد مرزا اور برادر نسبتی محمود خان سے دو دو ہاتھ کر سکتا تھا۔

جون کا مہینہ اپنے ساتھ خاصا اطمینان لے کے آیا تھا۔ گو کہ جنگ کی تیاریاں بڑی حد تک مکمل ہو گئی تھیں مگر وہ مسلسل نئے سپاہیوں کی بھرتی پر توجہ دے رہا تھا۔ کارخانوں میں تلواریں، خنجر اور تیر و بھالے ڈھالے جانے کا کام زور و شور سے جاری تھا۔

آٹھ جون کی صبح کا آغاز ہوا۔ آج کتنے ہی دنوں بعد عمر سعید مرزا خود کو خاصا ہشاش بشاش محسوس کر رہا تھا۔ تمام کام سے نمٹ کر وہ اب میدان جنگ میں جانے کا انتظار کر رہا تھا۔ اپنے رفیق، منوچہر خان کے ساتھ اس نے فجر کی نماز ادا کی تھی۔ پھر کافی دیر تک تلاوت کلام پاک میں مصروف رہا۔ تلاوت سے فارغ ہوتے ہی خادماؤں نے ناشتہ لگا دیا۔ دنبے کے گوشت کا دم بخت، کلچے اور شہد اور جو کے دلیہ سے تیار شدہ حریرہ کھا کر وہ ہوا خوری کی غرض سے مکان سے باہر نکل گیا تھا۔ مکان کی پچھلی جانب پہاڑی کے پہلو میں ڈھلوان پر اس کا کبوتر خانہ بنا ہوا تھا۔

بہت سے ترکی افراد کی طرح اسے بھی لوٹن کبوتر پالنے اور انہیں تربیت دینے کا بے حد شوق تھا۔ اس کے اس کبوتر خانے میں بے شمار چھوٹے چھوٹے کابک تھے جن میں ہزاروں کبوتر پلے ہوئے تھے۔ اسے جب بھی فرصت ملتی، دریا کے کنارے چہل قدمی کرتا ڈھلوان راستے کو طے کر کے وہ اپنے کبوتر خانے میں جا پہنچتا تھا اور گھنٹوں کبوتروں کی بدمست چال، پُر شکوہ اُڑان اور سماعت کو سکون دینے والی غٹرغوں غٹرغوں سے لطف اندوز ہوتا تھا۔

آج کتنے ہی عرصے بعد اسے اس طرف آنے کا موقع ملا تھا۔ اس کے ساتھ منوچہر خان بھی تھا۔ عمر سعید مرزا اسے ساتھ لئے ایک ایک کابک کے سامنے رکتا، کبوتر کے حسب نسب اور صلاحیت کے بارے میں بتاتا آگے بڑھ رہا تھا۔

تب ہی کبوتروں کا ایک جھنڈ نیچی پرواز کرتا آیا اور کبوتر خانے کے ساتھ نصب چھتریوں پر اترنے لگا۔ منوچہر خان کے لئے یہ منظر حیران کن تھا۔ وہ دریا کے کنارے رک کر یہ منظر دیکھنے لگا جبکہ عمر سعید مرزا ”ہا، ہا“ کی آوازیں نکالتا دھیرے دھیرے کبوتر خانے کی سمت بڑھ رہا تھا۔ اس کے چہرے پر ایک مسحور کن مسکراہٹ بکھری ہوئی تھی۔ انگلیاں تیزی سے حرکت کر رہی تھیں اور وہ منہ سے محبت بھری ”ہنکار“ نکالتا کبوتر خانے کے نیچے آ کھڑا ہوا تھا۔

تب ہی بالکل اچانک کبوتر خانہ اپنی جگہ سے کھسکنا شروع ہو گیا تھا۔ دریا کے کنارے کھڑے منوچہر نے کبوتر خانے کو کھڑ تے دیکھا تو وہ چیختا ہوا آگے بڑھا مگر اس کے اور عمر سعید مرزا کے بیچ خاصا فاصلہ تھا۔ تب ہی ایک دھماکے کے ساتھ کبوتر خانہ نیچے آ رہا۔

کبوتر خانے کے عین نیچے عمر سعید مرزا، فرغانہ کا حکمران، ظہیر الدین بابر کا باپ کھڑا تھا۔ مگر لکڑی کے وزنی کبوتر خانے اور اس میں موجود ہزاروں کبوتروں نے عمر سعید مرزا کے حسب نسب پر کوئی توجہ نہیں دی تھی، اور ایک دھماکے سے وہ کبوتر خانہ اس کے اوپر آ رہا تھا اور کسی بھی عام آدمی کی طرح عمر سعید مرزا اس کبوتر خانے کے نیچے دب کر موت کے منہ میں چلا گیا تھا۔

یہ سب کچھ یوں چشم زدن میں ہوا تھا کہ عمر سعید مرزا تو کیا، اس کے ساتھ آئے ہوئے اخسی سردار منوچہر خان کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا تھا۔ اس نے فوری طور پر کبوتر خانہ ہٹوانے کا انتظام کیا۔ کبوتر خانے کے ہٹتے ہی اس کے نیچے سے سلطان عمر سعید مرزا کی نعش برآمد ہوئی تھی۔

(جاری ہے)

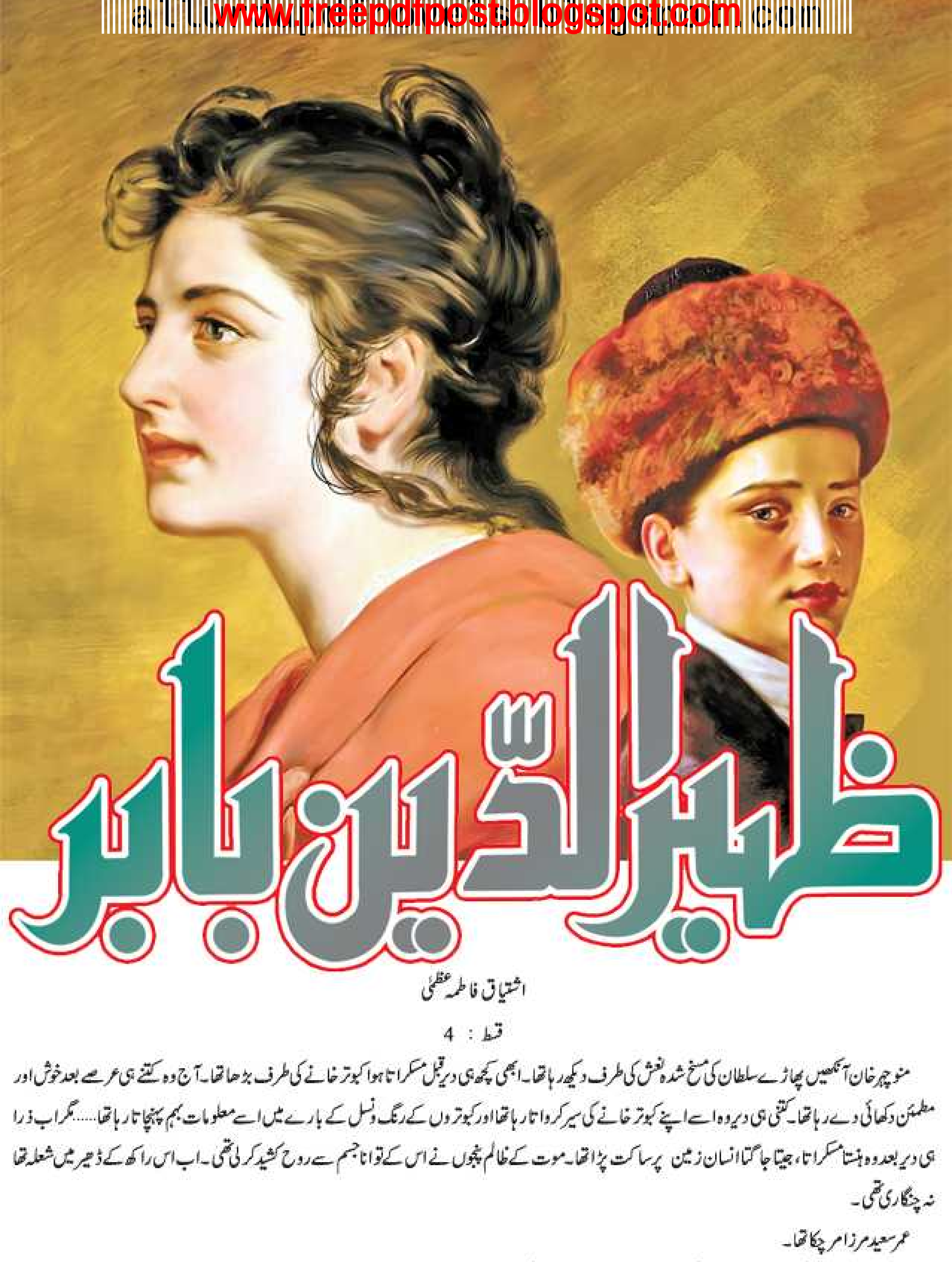

ظہیر الدین بابر

اشتیاق فاطمہ عظمیٰ

قسط : 4

منوچہر خان آنکھیں پھاڑے سلطان کی مسخ شدہ نعش کی طرف دیکھ رہا تھا۔ ابھی کچھ ہی دیر قبل مسکراتا ہوا کبوتر خانے کی طرف بڑھا تھا۔ آج وہ کتنے ہی عرصے بعد خوش اور مطمئن دکھائی دے رہا تھا۔ کتنی ہی دیر وہ اسے اپنے کبوتر خانے کی سیر کرواتا رہا تھا اور کبوتروں کے رنگ ونسل کے بارے میں اسے معلومات بہم پہنچاتا رہا تھا..... مگر اب ذرا ہی دیر بعد وہ ہنستا مسکراتا، جیتا جاگتا انسان زمین پر ساکت پڑا تھا۔ موت کے ظالم پنجوں نے اس کے توانا جسم سے روح کشید کر لی تھی۔ اب اس راکھ کے ڈھیر میں شعلہ تھا نہ چنگاری تھی۔

عمر سعید مرزا مر چکا تھا۔

فرغانہ کا سلطان، یونس خان کا چہیتا داماد قتلق نگار خانم کا محبوب شوہر اور ظہیر الدین بابر کا قابل احترام باپ اب دنیا میں نہیں رہا تھا۔

جون کی آٹھ اور رمضان المبارک کی پانچویں تاریخ، منگل کا دن تھا۔ محل میں افطاری کا سامان ہو رہا تھا۔ اکثر بیگمات نماز عصر میں مصروف تھیں کہ یہ اندوہناک خبر پہنچی۔

یہ خبر نہیں ایک زہر آلود خنجر تھا جو قتلق نگار خانم کے دل میں پیوست ہو گیا تھا۔ وہ عصر کی نماز کی ادائیگی کی نیت سے ابھی جائے نماز پر کھڑی ہی ہوئی تھی کہ سلطان کی موت کی خبر سنتے ہی تیورا کر گری اور بے ہوش ہو گئی۔

سلطان کا وارث اور ولی عہد ظہیر الدین بابر اس وقت گیارہ سال اور چار ماہ کا تھا اور اس خبر کی آمد پر وہ چار باغ میں تھا۔ شیرم طغائی یہ خبر لے کر اس کے پاس پہنچا تھا۔

”شہزادے محترم، غضب ہو گیا، آسمان ٹوٹ پڑا، زمین کا کلیجہ شق ہو گیا، میرے منہ میں خاک، آپ کو یہ خبر دینے سے پہلے میں کیوں نہ مر گیا۔“ وہ منہ ڈھانپ کر رونے لگا۔

بابر نے آگے بڑھ کر اسے شانے سے پکڑ کر جھنجھوڑتے ہوئے پوچھا۔ ”طغائی، بات کیا ہے۔ اس طرح کی تمہید سے مجھے پریشانی ہو رہی ہے۔ سیدھے سادے طریقے سے بتاؤ، ہوا کیا ہے؟“

”شہزادے!“ شیرم طغائی نے دوہتڑ سینے پر مارتے ہوئے دہائی دی۔ ”ہم لٹ گئے، ہم برباد ہو گئے شہزادے، سلطان معظم اس دار فانی سے کوچ کر گئے ہیں۔ آپ یتیم ہو گئے۔ یہ سلطنت بے یار و مددگار رہ گئی۔“

”کیا بکتے ہو۔“ شہزادے نے حیرت بھرے غصے سے کہا۔ ”وہ بالکل صحت مند اور توانا تھے۔ بھلا یوں چشم زدن میں ان کی موت کی خبر کیوں کر آ گئی۔ یقیناً یہ دشمنوں کی سازش ہے۔“

”نہیں شہزادے، یہ سانحہ ہو چکا ہے۔“ شیرم طغائی نے روتے ہوئے جواب دیا۔ ”کل دوپہر تک ان کی میت بھی محل پہنچ جائے گی۔ یہ حادثہ کبوتر خانے کے گرنے سے پیش آیا اور وہ راہی ملک عدم ہو گئے...... بالکل اچانک۔“

”اوہ میرے خدا۔“ بابر نے اپنا گھومتا ہوا سر اپنے ہاتھوں میں تھام لیا۔ اس کی نگاہوں کے سامنے پہاڑوں کے ڈھلوان پر واقع وہ کبوتر خانہ گھوم گیا جسے دیکھ کر اسے خود بھی ان کے غیر محفوظ ہونے کا احساس ہوا تھا۔ اس نے اپنی اس تشویش کا اظہار عمر سعید مرزا سے بھی کیا تھا۔ مگر اس نے اس بات کو ہنس کر ٹال دیا تھا۔ مگر آج ثابت ہو گیا کہ زیرک اور دور اندیش ولی عہد کی تشویش بے سبب نہ تھی۔

ظہیر الدین بابر نے فوری طور پر تمام ملازمین کو طلب کیا اور گھوڑے پر سوار ہو کر قلعے کی طرف روانہ ہو گیا۔ اسے اپنی والدہ قتلق نگار خانم کی فکر تھی۔ وہ جانتا تھا کہ وہ وفا شعار بیوی اپنے شوہر سے کس قدر محبت رکھتی تھی اور محبوب شوہر کی اس اچانک موت نے اس کے دل پر کس قدر برا اثر کیا ہو گا۔

سلطان عمر سعید کی والدہ شاہ سلطان بیگم خاندان کے دیگر لوگوں کے ساتھ آخشی میں موجود تھیں۔ صرف انتالیس سال کی عمر میں توانا بیٹے کی حادثاتی موت نے بوڑھی ماں کو شدید صدمے سے دوچار کیا تھا۔ وہ رنج سے نڈھال بستر سے جا لگی تھی۔ میت کے ساتھ اندجان آنے کی اس میں ہمت ہی نہ تھی۔ چنانچہ چند امراء مرحوم سلطان کا جسد خاکی لے کر اندجان کے لئے روانہ ہو گئے تھے۔

ظہیر الدین بابر اپنے چند نمک خوار ملازمین اور شیرم طغائی کی معیت میں قلعہ اندجان کی طرف روانہ ہو چکا تھا۔ اندجان کی اداس اور افسردہ فضا میں سرمئی خاموش اور دکھی شام پھیلی ہوئی تھی۔ مغرب کی اذان میں ابھی کچھ لمحے باقی تھے۔ چنانچہ شیرم طغائی ولی عہد کو قلعے میں لے جانے کی بجائے عیدگاہ اور اس سے ملحقہ مسجد جوزا کی طرف لے چلا۔

”طغائی! تم نے راستہ کیوں بدل دیا۔“ بابر نے حیران اور قدرے غصیلے لہجے میں سوال کیا۔ ”مجھے جلد از جلد قلعے میں پہنچ کر والدہ کا حال دریافت کرنا ہے۔“

”شہزادے افطار کا وقت ہوا چاہتا ہے۔“ طغائی نے نظریں چراتے ہوئے تاویل پیش کی۔ ”میں نے سوچا آپ افطار اور نماز مغرب سے فارغ ہو لیں تو پھر قلعے کی طرف جانے کے بارے میں سوچا جائے۔“

”سوچا جائے سے تمہاری کیا مراد ہے؟“ شہزادے نے جز بز ہوتے ہوئے سوال کیا۔ ”میں جلد از جلد امی جان کے پاس پہنچنا چاہتا ہوں۔“

”شہزادے۔“ شیرم طغائی نے نگاہیں جھکاتے ہوئے دھیمی آواز میں کہنا شروع کیا۔ ”آپ کے علم میں ہے کہ آپ کے تایا سلطان احمد مرزا فوج کثیر کے ساتھ اندجان سے چند کوس کے فاصلے پر موجود ہیں۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ امراء آپ کو اُن کے حوالے کر دیں۔“

”اوہ!“ شہزادے کی بڑی بڑی بادامی آنکھوں سے ہلکی تشویش جھانکنے لگی۔ خوبصورت چہرے پر بھی فکر و تردد کے آثار نمودار ہو گئے تھے۔

”اس لئے میں نے سوچا۔ میں آپ کو قلعے میں لے جانے کی بجائے مسجد جوزا کے پیچھے واقع پہاڑوں میں لے جاؤں۔ خدانخواستہ ملک گیا تو گیا مگر آپ تو بچ جائیں گے اور حالات بہتر ہوتے ہی آپ کو آپ کے ماموں محمود خان کے پاس پہنچا دیا جائے گا۔ اب آگے جو آپ کا حکم ہو۔“

ابھی بابر کوئی فیصلہ نہ کر پایا تھا کہ قلعے کی جانب سے چند گھڑ سوار تیز رفتاری سے ان کی جانب بڑھتے دکھائی دیئے۔

”الچھ خان! تم جا کر دیکھو۔ یہ کون لوگ ہیں اور یہاں کس مقصد سے آ رہے ہیں۔“ شیرم طغائی نے ایک ملازم کو حکم دیا اور شہزادے کا ہاتھ تھامے مسجد میں داخل ہو گیا۔

بابر کے ساتھ آئے تمام ملازمین مسجد کے باہر ہی کھڑے تھے۔ پانچواں روزہ تھا اور مغرب کی اذان ہوا ہی چاہتی تھی، اس لئے کافی لوگ مسجد میں داخل ہو رہے تھے مگر کسی نے بھی شیرم طغائی اور بابر کی طرف توجہ نہ کی تھی۔

کچھ ہی دیر بعد ملازم الچھ خان اپنے ساتھ درباری امیر ورزی خان کو لئے طغائی اور بابر کے پاس آ موجود ہوا۔

”شہزادے عالی مقام!“ امیر ورزی خان نے آتے ہی شہزادے بابر کی قبا کو بوسہ دیتے ہوئے مؤدب انداز میں کہا۔ ”خواجہ مولانا قاضی نے مجھے آپ کو واپس قلعے میں لے جانے کے لئے بھیجا ہے۔ جیسے ہی انہیں خبر ہوئی کہ آپ کا رخ مسجد جوزا کے پہاڑوں کی طرف ہے۔ انہوں نے مجھے فوراً آپ کو بلانے کے لئے بھیج دیا۔ کچھ اور درباری امراء باہر موجود ہیں۔ براہ کرم آپ قلعے میں تشریف لے چلیے۔ وہاں سب آپ کے وفادار ہیں، وہ اپنی جانیں لٹا دیں گے، پر آپ کا بال بھی بیکا نہ ہونے دیں گے۔“

امیر ورزی کے سمجھانے بجھانے اور یقین دہانی کروانے پر شیرم طغائی واپس قلعے جانے کے لئے آمادہ ہو گیا جبکہ بابر تو شروع سے ہی جان بچا کر اس طرح بھاگ کھڑے ہونے پر آمادہ نہ تھا۔ چنانچہ وہ سب قلعے کی طرف چل پڑے تھے۔

قلعے میں اس وقت بہت لوگ تھے مگر عجب ہُو کا عالم تھا۔ ہر سمت وحشت اور ویرانی کا راج تھا۔ روح میں اُترنے والا سناٹا اور آنکھوں کو بے نور کر دینے والا اندھیرا ہر سو پھیلا ہوا تھا۔

محمد ظہیر الدین بابر کو گھوڑے سے اتار کر ایوان خاص میں لے جایا گیا۔ مولانا قاضی اور دیگر سردار شہزادے کے حضور حاضر ہوئے۔ پہلے اس کے والد کی ناگہانی موت پر افسوس اور تعزیت کا اظہار کیا۔ پھر اپنی وفاداری اور استواری کا یقین دلایا۔

”اب سوال یہ ہے کہ ایسے وقت میں جب کہ ایک دشمن بڑا لشکر لئے ہمارے شہر سے چند کوس پر موجود ہے، ہمیں اپنے شہر اور قلعے کی حفاظت کے لئے کیا اقدامات کرنے چاہئیں؟“

بابر کے سوال پر سارے ہی امراء متفکر نظروں سے ایک دوسرے کی طرف دیکھنے لگے۔ پھر سب نے تائید بھرے انداز میں سر ہلاتے ہوئے یک زبان ہو کر کہا۔ ”آپ بجا فرماتے ہیں، ہمیں سب سے پہلے اس طرف توجہ دینی ہو گی۔“

اور پھر کافی بحث و تمحیص کے بعد سب اس بات پر متفق ہو گئے کہ قلعے کے برج اور فصیل کو مضبوط بنایا جائے اور سامانِ حرب کو درست کیا جائے۔ سب ہی سردار اس کام میں مشغول ہو گئے۔ اس فیصلے سے فارغ ہو کر بابر اپنی والدہ قتلق نگار خانم کی عیادت کو ان کے کمرے کی طرف چل دیا۔

اس وقت زنان خانے کے بڑے کمرے میں زمین پر سفید چاندنیاں بچھا دی گئی تھیں اور محل میں موجود کنیزیں اور حرم کی عورتیں بھیگی آنکھوں اور اترے چہروں کے ساتھ تلاوت کرنے اور تسبیح پڑھنے میں مصروف تھیں۔ جبکہ ملکہ قتلق نگار خانم اپنی خواب گاہ میں بستر پر بے سدھ پڑی تھی۔ محل کی طبیبہ ابھی ابھی کچھ مقوی ادویات دے کر گئی تھی، مگر ہنوز اس کی حالت بہتر نہیں ہوئی تھی۔

”امی جان۔“ بابر کی آواز پر اس نے چونک کر آنکھیں کھول دیں۔ اس کی آنکھیں کے سامنے اس کا لاڈلا بیٹا کھڑا تھا۔

”بابر...... میرے لعل۔“ اس نے اٹھ کر بے اختیار اپنے بازو پھیلا دیئے تھے اور بابر اس کے کھلے بازوؤں میں سما گیا تھا۔ ”میرے بچے تم یتیم ہو گئے۔ ہم بے آسرا ہو گئے۔ تمہارے بابا جان اب اس دنیا میں نہیں رہے۔ ہماری دنیا تاریک ہو گئی۔“

بیٹے کو سینے سے لگا کر وہ پھوٹ پھوٹ کر روئے جا رہی تھی۔ دل کا ملال آنسوؤں کی صورت رخساروں پر بہہ کر گریبان میں جذب ہوتا جا رہا تھا۔ کافی دیر رو لینے کے بعد دل کا بوجھ کسی قدر کم ہوا تو وہ بیٹے سے الگ ہو کر دیوار کے سہارے بیٹھ گئی۔

”امی جان! حوصلہ رکھیے، سب ٹھیک ہو جائے گا۔“ بابر نے ماں کے بھیگے رخسار اپنی ہتھیلیوں سے خشک کرتے ہوئے پُر امید آواز اور پُرعزم لہجے میں کہا۔ اور کچھ دیر ماں کے پاس بیٹھ کر واپس ایوانِ خاص میں آ گیا۔

جوں جوں امراء اور درباریوں کو سلطان کی موت اور ولی عہد کی آمد کی خبر ہو رہی تھی، توں توں وہ شہزادے کی خدمت میں حاضر ہو رہے تھے۔

اگلے روز سلطان کا جنازہ بھی پہنچ گیا تھا۔ کفن و دیگر رسوم کی ادائیگی کے بعد سلطان کو دفن کر دیا گیا۔

باقاعدہ کسی تقریب کا موقع نہ تھا۔ مگر سب ہی نے شہزادے بابر کو مرحوم سلطان کی جگہ سلطان تسلیم کر لیا تھا۔ نوجوان شہزادے کے تخت سلطنت پر قدم رکھتے ہی کچھ جاسوس، حملہ آور سلطان احمد شیخ کی طرف روانہ کر دیئے گئے تھے۔

جاسوسوں کے طفیل حملہ آور لشکر اور شہر میں موجود لوگوں کی سوچ اور خیالات کے بارے میں بھی بابر کو پتا چل رہا تھا۔

سلطان احمد مرزا، راتیہ، خجند اور مرغیان کے شہروں کو فتح کرتا اندجان سے چار کوس کے فاصلے پر مقام قبا پر آ پہنچا تھا۔

”ارے سلطان، کتے کی موت مارا گیا، اور دیکھنا، یہ بالشت بھر کا شہزادہ سلطان بن کر کون سا کارنامہ انجام دے گا۔ آخر یہ بھی چیونٹی کی موت مارا جائے گا۔“

اس طرح کی گستاخانہ باتیں، ایک شخص درویش کا فرم کرتا پھر رہا تھا۔ جاسوسوں نے اس کے بارے میں شہزادے کو مطلع کیا۔

”اس گستاخ اور بدزبان کو فوراً گرفتار کر کے، بھرے بازار میں اس کا سر قلم کر دیا جائے۔“ شہزادے بابر نے دھیمے لہجے اور غصیلی آواز میں حکم صادر فرمایا۔

کچھ ہی دیر بعد سرکاری اہلکاروں نے اس شخص کو گرفتار کر لیا۔

”ارے مجھے کیوں گرفتار کرتے ہو، آخر میں نے کیا کیا ہے؟“ وہ سپاہیوں کو دیکھ کر پہلے اکڑا پھر گڑگڑانے لگا۔ ”میں نے جو کچھ کہا غصے میں کہا، سلطان معظم کی توہین میرا ہرگز منشا نہ تھا۔“

سپاہیوں نے سلطان بابر کے حکم کے بموجب اس گستاخ کا سر قلم کر دیا۔ دیکھنے والوں کے دل دہل گئے اور سب لوگوں کو اس واقعے سے ایسی عبرت ہوئی کہ بعد میں کوئی نئے سلطان کے خلاف ایک حرف بھی منہ سے نکالنے کی جسارت نہ کر سکا۔

اس طرف سے اطمینان کے بعد سلطان بابر نے ایک بار پھر عمر رسیدہ اور زمانے کے سرد و گرم چشیدہ، جہاں دیدہ وزراء و امراء کو بٹھا کر صلاح مشورہ شروع کیا۔

سلطان احمد مرزا کو دارالحکومت سے محض چار کوس پر پڑاؤ انداز دیکھ کر قلعے کی فوج میں بہت سے سپاہیوں کے دل دھڑک رہے تھے۔ ان کا کم عمر آقا اپنے چچا کے بر تر وسائل کا مقابلہ کرنے کے قابل نہ تھا۔ ایسے میں ایک فوجی سردار حاتم برگوش نے دبی زبان میں اپنے ساتھیوں کے سامنے یہ تجویز رکھی کہ کیوں نہ شہزادے بابر کو اس کے چچا احمد مرزا کے حوالے کر دیا جائے، اس طرح کم از کم قتل عام سے تو محفوظ رہا جا سکتا ہے۔

جب حاتم برگوش کی یہ تجویز خواجہ مولانا قاضی تک پہنچی تو وہ غصے سے آگ بگولا ہو گیا۔ ”اس بدذات کی یہ ہمت۔“ اس نے غصے سے کانپتے ہوئے بابر کو مخاطب کر کے کہا۔ ”سلطان معظم ابھی اس بدذات کے قتل کا حکم صادر فرمائیے تاکہ اس جیسے دو چار اور نمک حراموں کو عبرت حاصل ہو۔“

چنانچہ سلطان بابر نے حاتم برگوش کا سر قلم کر دینے کا حکم صادر فرما دیا اور اگلے چند گھنٹوں میں اسے پکڑ کر اس کا سر تن سے جدا کر دیا گیا۔ اس کی اس عبرت ناک موت سے قلعہ بند فوج کا اتفاق رائے از سر نو بحال ہو گیا لیکن قلعہ بند ہو کر محاصرین کا مقابلہ کرنے کا تہیہ کرنے سے پہلے بابر اور اس کے رفقاء کار نے یہ فیصلہ کیا کہ حملہ آور فوج سے سمجھوتے کی ایک کوشش ضرور کی جائے۔

چنانچہ بابر نے اپنے چچا سلطان احمد مرزا کے نام ایک مکتوب تحریر کیا، جس میں درج تھا۔ ”ظاہر ہے کہ اس ملک پر آپ اپنا کوئی آدمی مقرر فرمائیں گے۔ میں آپ کا خادم بھی ہوں اور فرزند بھی...... اگر یہ خدمت میرے سپرد کر دی جائے تو بہتر ہو گا۔ تمام امور احسن طریقے سے پایۂ تکمیل کو پہنچ سکیں گے۔“

بابر کا یہ مکتوب لے کر خواجہ قاضی اوزون اور خواجہ حسین سلطان احمد مرزا کے حضور پیش ہوئے۔

سلطان احمد مرزا نیک خو، نرم مزاج اور فقیر منش انسان تھا۔ اگر وہ خود کوئی فیصلہ کرتا تو یقیناً اپنے یتیم بھتیجے کی گزارش کو منظور کر لیتا۔ مگر وہ اپنا کوئی بھی فیصلہ امراء کی مشاورت کے بغیر نہیں کرتا تھا۔ چنانچہ جب یہ معاملہ امراء کے سامنے رکھا گیا تو وہ بھتے سے اکھڑ گئے۔ منزل پر منزل مارتے وہ یہاں تک پہنچے تھے۔ اب جبکہ منزل محض دو گام رہ گئی تھی، تو وہ اس طرح کے کسی بھی سمجھوتے کے لئے آمادہ نہ تھے۔ انہوں نے نہایت سخت الفاظ میں جواب دیا۔

”قابل احترام بزرگو!“ انہوں نے دونوں مندوب کی سفید اور دراز ریش کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ”اپنے نوعمر سلطان سے جا کر کہو کہ انسان جو کچھ بوتا ہے وہی کاٹتا ہے۔ اس کے نادان اور عاقبت نااندیش والد سلطان عمر سعید مرزا نے اپنی فطری لاابالی پن سے جو آگ سلگائی تھی، آج وہ آگ، نار نمرود سے بھی آگے بڑھ چکی ہے۔ اپنے باپ کا بویا ہوا آج اسے ضرور کاٹنا ہو گا۔ جب عمر سعید مرزا نے کبھی اپنے بھائی کا لحاظ نہیں کیا تو سلطان احمد مرزا کا بھی حق بنتا ہے کہ وہ اپنے بھتیجے پر کوئی التفات نہ کرے۔ کچھ ہی گھڑیوں کی بات ہے۔ اندجان کا قلعہ ہمارے قبضے میں ہو گا۔“

سلطان احمد مرزا کے سرداروں اور امراء کا سخت اور دل دہلا دینے والا جواب سن کر بابر سخت رنجور و ملول ہونے کے ساتھ ہراساں و پریشان ہو گیا تھا۔ سوحری کے بعد نماز فجر سے قبل اس نے خداوند کریم کے حضور سربسجود ہو کر اس سے مدد کی درخواست کی تھی۔ اس کی بے ریا آنکھوں سے اطاعت و ندامت کے سچے موتی ٹوٹ کر جائے نماز میں جذب ہو رہے تھے اور وہ شاہوں کے شاہ کے سامنے سجدہ ریز مدد و نصرت کی دعا مانگے جا رہا تھا۔

☆......☆......☆

قبا کا نیلا آسمان سیاہ بادلوں سے ڈھکا ہوا تھا [illegible] اس مقام کا نام دریائے قبا کے باعث پڑا تھا۔ یہ ایک سیاہ دریا تھا جس میں بے حد دلدل تھی۔ اس دریا کو بنا کسی پل کے عبور کرنا ناممکن تھا۔

سلطان احمد مرزا کا لشکر اسی دریا کے اس پار پڑاؤ ڈالے ہوئے تھا۔ بابر کے گزارش نامے کے آنے اور سرداروں کے منہ توڑ جواب دینے کے بعد سرداروں اور جیالوں نے دریا کے اس پار جا کر قلعے پر حملہ کرنے کا فیصلہ کیا۔

”مگر سرکار، بنا پل کے اس دریا کو پار کرنا ناممکن ہے۔“ کچھ عمر رسیدہ سپاہیوں نے اپنے تجربے کی بنا پر مشورہ دیا۔

دو سال پہلے دریائے چرچق کے مقام پر بھی اسی طرح کے حالات ان کے سامنے درپیش ہوئے تھے اور جواب میں وہ اپنے ہزاروں سپاہی دریا برد کروا بیٹھے تھے۔ اسی لئے آج اپنے سامنے اس دلدلی دریا کو دیکھ کر وہ خوفزدہ سے ہو گئے تھے۔

چنانچہ دریا کے اوپر پل باندھا گیا۔

تیز ہواؤں کے جھکڑ میں، پل کسی معمولی رسی کی طرح ہچکولے کھا رہا تھا۔ لشکری اس پل کی ہیئت دیکھ کر ہی ہراساں و سراسیمہ تھے۔ مگر سرداروں کا حکم تھا، سو مرتا کیا نہ کرتا کے مصداق سپاہ اپنے اسباب گھوڑوں اور اونٹوں کے ساتھ پل سے گزر کر دوسرے کنارے پہنچنے کے لئے روانہ ہوئے۔

پل کمزور تھا اور لشکر بہت وسیع، چنانچہ ذرا ہی دیر میں پل ٹوٹ گیا۔ بہت سے گھوڑے، اونٹ اور بے شمار سپاہی دریا کی دلدل میں غرق ہو گئے۔ دو سال پہلے والا دریا میں ڈوبنے والا اندوہناک واقعہ ایک بار پھر تازہ ہو گیا تھا۔ اس بار بھی ہزاروں لشکری دریا بُرد ہوئے تھے اور بدترین شکست ان کا مقدر ٹھہری تھی...... اب کے بھی کچھ ایسا ہی واقعہ پیش آیا تھا۔ تمام اہل لشکر وہم کا شکار ہو گئے تھے اور دریا پار کر کے اندجان پر حملہ ہونے کی بجائے واپسی کے حق میں تھے۔

”سلطان عمر سعید مرزا سے دشمنی تھی۔“ لشکری باہم گفتگو کر رہے تھے۔ ”اب وہ دنیا میں نہیں رہا۔ ولی عہد ایک نوعمر بچہ ہے اوپر سے چند ہی دن ہوئے یتیم ہوا ہے...... کچھ بھی ہو سلطان احمد مرزا بابر کا رشتے دار ہے۔ سگا چچا...... اس وقت اسے اپنے یتیم بھتیجے کی اشک شوئی کرنی چاہئے، نہ کہ ستم و استبداد کا بازار گرم کیا جائے۔“

سلطان احمد مرزا تک بھی یہ چہ میگوئیاں پہنچ رہی تھیں۔ وہ فطری نرم خوئی کے باعث شاید واپس جانے کا فیصلہ کر لیتا، مگر اس بار بھی منتقم مزاج سردار آڑے آ گئے۔

”کچھ ہو، ہم اندجان کا قلعہ فتح کئے بنا واپس نہ جائیں گے۔“

”سب جانتے ہیں کہ اندجان کا قلعہ ایک مضبوط قلعہ ہے۔“ درویش محمد ترخان جو سلطان کے قریبی مصاحبین میں سے تھا، نرم لہجے میں گویا ہوا۔ ”اور پھر سنا ہے سلطان بابر کی فوج، رعیت اور امراء سب ہی یکجان ہو کر قلعے اور سلطان کو بچانے کے لئے سینہ سپر ہو گئے ہیں۔ اس قدر مستعد اور وفادار ہیں کہ جان دینے کو تیار ہیں مگر پیچھے ہٹنے کو آمادہ نہیں۔“

”تو یہاں کون بے وفائی پر آمادہ اور میدان چھوڑ کر بھاگنے کو تیار ہے۔“ سردار میوا خان نے کڑوے لہجے میں جواب دیا۔

”میرا خیال ہے کہ اس بات پر متفق ہو جانا چاہئے کہ اب ہمیں واپس لوٹ جانا چاہئے، پہلے ہی ہم دریا کی دلدل میں اپنے ہزاروں جانور اور جاں نثار سپاہی گنوا چکے ہیں۔“

مگر کوئی بھی درویش محمد ترخان کی بات سننے پر آمادہ نہ ہوا۔

اگلے دن یہ افتاد ٹوٹی کہ گھوڑوں میں کوئی وبائی مرض پھیل گیا۔ صبح سے شام تک طویلے کے طویلے خالی ہو گئے۔ لشکریوں کو یہ خوف لاحق ہوا کہ یہ مرض گھوڑوں سے انسانوں میں نہ منتقل ہو جائے، سو سب ہی واپس جانے کو تُل گئے۔

اب کے سلطان کی رائے بھی یہی تھی۔ سو جب اندجان قریب کوس بھر رہ گیا تو درویش محمد ترخان کو سمجھوتے کے لئے اندجان بھیجا گیا۔ ادھر سے حسن یعقوب آیا۔ عیدگاہ کے نواح میں دونوں وکیلوں کی ملاقات ہوئی۔ دونوں نے احترام و خلوص سے ایک دوسرے سے بات کی۔ امن و آشتی کا معاہدہ تیار ہوا۔ دونوں فریقوں نے دستخط کئے اور اخلاص سے مصافحہ کر کے اپنی اپنی جانب لوٹ گئے۔

”مبارک ہو سلطان معظم، اس رب ذوالجلال نے آپ کو سرخرو کیا۔“ حسن یعقوب نے واپس آ کر معاہدہ سلطان بابر کے قدموں میں رکھتے ہوئے مسرور آواز میں مژدہ سنایا تو بابر بے ساختہ بارگاہ رب العزت میں سربسجود ہو گیا۔

☆......☆......☆

دریائے خجند کا نیلگوں شفاف پانی مست خرام بہتا چلا جا رہا تھا۔ دریا کے دائیں جانب دریا کے پانی سے سیراب ہونے والا خودرو جنگل خوب سرسبز و شاداب تھا۔ اس پل دریا سے آنے والی ہوائیں اپنے اندر ٹھنڈک اور نمی بھی سموئے لائی تھیں۔ یہ ہوائیں برگ و بار کو چھوتی ہوئی گزرتیں تو لگتا ان کا چہرہ دھل گیا ہو۔

چھتنار درختوں کی لچکتی شاخوں پر جھولتے پرندے اپنی ننھی ننھی چمکدار آنکھوں سے فضا کے فسوں کو دیکھتے محسوس کرتے اور چہچہاتے ہوئے کسی اور سمت پرواز کر جاتے۔

ایسے میں بالکل اچانک ہی دریا کے شمالی سمت سے غبار کا ایک طوفان سا اٹھا...... اور ایک لشکر جرار دندناتا ہوا وارد ہوا۔ یہ لشکر بابر کے ماموں خاقان محمود خان کا تھا اور اس لشکر کی قیادت وہ خود کر رہا تھا۔

محمد ظہیر الدین بابر ابھی اپنے ایک عزیز، دشمن سے نجات پا کر سکون کا سانس نہ لے پایا تھا کہ اسے دوسرے عزیز دشمن کی آمد کی خبر پہنچی۔

بابر کے چچا سلطان احمد مرزا اور ماموں خاقان محمود خان نے باہم متحد ہو کر فرغانہ کو گھیرنے کا منصوبہ بنایا تھا۔ احمد مرزا کا ارادہ اندجان پر قابض ہونے کا تھا تو محمود خان کے دانت اخشی پر لگے ہوئے تھے۔

اخشی میں اس وقت سلطان عمر سعید مرزا کی والدہ شاہ بیگم اور بابر سے دو برس چھوٹا سوتیلا بھائی جہانگیر مرزا موجود تھا۔ اس کی ماں مغل سرداروں کے خانوادے سے تھی۔ اس کا نام فاطمہ سلطان تھا۔ آخشی کے قلعے میں اس وقت بابر کی بہن خانزادہ بیگم اور نانی ایسن دولت بیگم بھی موجود تھیں۔

سلطان مرحوم کی والدہ شاہ بیگم کے اوسان جواں بیٹے کی موت کے باعث ویسے ہی خطا تھے۔ چنانچہ اس وقت قلعے کے تمام انتظامات ایسن دولت بیگم نے اپنے ہاتھ میں لے لئے تھے۔ وہ ایک ذہین، دلیر اور دور اندیش خاتون تھی۔ اس کا شوہر مرحوم یونس خان جو اپنے ہم عصروں میں ایک لائق، ذہین اور زیرک انسان سمجھا جاتا تھا۔ وہ بھی اپنی عقلمند و دانا بیوی ایسن دولت بیگم کے مشورے کے بغیر کوئی قدم نہ اٹھاتا تھا۔ بابر کے لئے اس مشکل وقت میں نانی ایسن دولت بیگم کا آخشی کے قلعے میں موجود ہونا بے حد تقویت اور تسلی کا باعث تھا۔

محمود خان نے آخشی میں داخل ہوتے ہی قلعے کو گھیر لیا تھا۔ شہزادے جہانگیر مرزا کے علاوہ امراء میں علی درویش بیگ، قلی کلتاش باقر بیگ اور شیخ عبداللہ ایشک تھے۔

ویسے لاغری اور میر غیاث طغائی بھی وہاں موجود تھے۔ مگر کچھ ہی دنوں پہلے یہ دونوں امیر دیگر امراء سے بدظن ہو کر کاشان چلے گئے تھے۔ جو اویس لاغری کا وطن تھا۔ کیونکہ اویس لاغری شہزادہ ناصر مرزا کا اتالیق تھا۔ ناصر مرزا، بابر کا تیسرا سوتیلا بھائی تھا، جو اس سے عمر میں چار سال چھوٹا تھا۔ ناصر مرزا کی ماں اندجان کی تھی۔ اس کا نام امیہ تھا۔ چنانچہ ناصر مرزا کو اپنے اتالیق اویس لاغری کے ساتھ کاشان جانا پڑا تھا۔ کاشان آخشی کے نواح میں ایک خاصا آباد اور شاداب قصبہ تھا۔

جس وقت خاقان محمود خان آخشی کے نواح میں داخل ہوا اور کاشان کے قریب پہنچا تو ان دونوں امیروں کی نیت ڈانواں ڈول ہو گئی اور وہ خان کو فاتح مانتے ہوئے اس کے حضور جا حاضر ہوئے اور سات سال کے شہزادے ناصر مرزا کو محمود خان کے حوالے کر دیا۔

”کاش، عمر سعید مرزا کے اس منہ بسورتے بیٹے ناصر مرزا کی جگہ میرا بھانجا ظہیر الدین بابر ہوتا۔“ محمود خان نے ننھے شہزادے ناصر مرزا کو قدرے ناپسندیدہ نگاہوں سے دیکھتے ہوئے سوچا تھا۔ پھر سر جھٹک کر اویس لاغری اور میر غیاث طغائی سے گفت و شنید میں مصروف ہو گیا۔

محمود خان نے آگے بڑھ کر آخشی کے قلعے کو گھیر لیا تھا۔

شام ہونے تک نیلے آسمان کو سیاہ بادلوں نے ڈھانک لیا تھا۔ ہواؤں کے تیز جھکڑ بارش کا پیام لا رہے تھے۔ محمود خان کا لشکر قلعے کا محاصرہ کیے ہوئے تھا جبکہ قلعے کے اندر قلعہ بند فوج علی درویش بیگ اور مرزا قلی کلتاش اور دوسرے سپہ سالاروں کی رہنمائی میں سرفروشانہ مزاحمت کے لئے کمربستہ تھے۔ نوعمر شہزادہ جہانگیر مرزا کی موجودگی ان کی وفادارانہ خدمات کے لئے ہمت افزائی کا سبب تھی...... اور سب سے بڑھ کر ایسن دولت بیگم کی دانائی اور حوصلہ مندی سب کے لیے باعث تقلید و حوصلہ تھی۔

شام کے گہرے ہوتے ہی خاقان محمود خان نے قلعے پر پہلا حملہ کیا۔ مگر قلعے میں موجود بابر کی فوج اتنی عمدگی اور حوصلہ مندی سے لڑی کہ محمود کی ہمت جواب دے گئی۔

آٹھ بجے کے قریب اس کی فوجیں دوبارہ اپنے خیموں میں لوٹ گئیں۔ اس وقت تک خاقان کو سلطان احمد مرزا کی واپسی کی خبر مل چکی تھی۔ ”یہ بات قابل یقین کیونکر ہو سکتی ہے۔“ خاقان محمود خان جز بز ہوتے ہوئے بولا۔ ”سلطان احمد مرزا اتنا بڑا لشکر ہزاروں کی تعداد میں گھوڑے اور اونٹ لے کر اندجان فتح کرنے آیا تھا۔ وہ بھلا اندجان کے اتنے قریب پہنچ کر فتح کا تاج سر پر سجائے بغیر واپس کس طرح جا سکتا ہے۔“

”ہو سکتا ہے بھائی کی ناگہانی موت نے اسے احساس دلایا ہو کہ جھگڑا تو بھائی سے تھا۔ اب جبکہ بھائی ہی موجود نہیں تو پھر کس سے لڑائی اور کیسی جنگ؟ اپنے نوعمر بھتیجے بابر سے شاید اسے ایسی کوئی خاص پُرخاش نہیں ہے۔“ اپنے مشیر خاص موجو خان کی وضاحت سے محمود کی تشفی نہیں ہوئی۔ وہ جلد از جلد حقیقت حال جاننے کا متمنی تھا۔ چنانچہ اس نے کاتب کو بلوایا۔

”میرے آقا۔“ کاتب قلم دوات لئے آ حاضر ہوا۔

”سلطان احمد مرزا کے نام ایک مکتوب لکھو اور اس سے کہو کہ وہ اپنی لشکر کشی اور واپس لوٹ جانے کا سارا احوال مجھے تحریر کرے۔“

”جو حکم میرے آقا۔“ کاتب نے جھکتے ہوئے عرض کی، اور ایک کونے میں اپنا قلم دوات لے کر مکتوب لکھنے میں مصروف ہو گیا۔

اپنے حلیف سلطان محمود خان کی پسپائی کی غیر متوقع خبر سے اس کے حوصلے اور ولولے پر منفی اثرات مرتب ہوئے تھے۔ وہ خاصا پریشان ہو گیا تھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اتنے بڑے اور طاقتور لشکر کے ساتھ آخر سلطان احمد مرزا کو کیونکر پسپائی اختیار کرنی پڑی۔

وہ تمام رات انہی پریشان کن سوچوں میں گھرا رہا۔ ایک لمحے کو بھی اس نے بستر سے کمر نہ لگائی اور لحہ بھر کو بھی پلک نہ جھپکی تھی۔ بس اپنے سامنے نقشہ پھیلائے، آئندہ آنے والے دنوں کی جنگی حکمت عملی مرتب کرتا رہا تھا۔

سپاہ کا خیال تھا کہ اگلی صبح طلوع ہوتے ہی خاقان قلعے پر حملہ کر دے گا، مگر خاقان نے ایسا کچھ نہیں کیا۔ کسی اگلے قدم سے قبل اسے سلطان احمد مرزا کے جواب کا انتظار تھا۔ وہ پورا دن انتظار میں گزر گیا۔ صبح سے شام ہوئی اور پھر شام رات کی سیاہی میں گھل گئی۔ مگر سلطان احمد مرزا کی طرف سے کوئی جواب موصول نہیں ہوا۔ دو دن اور اسی طرح بیت گئے۔

یہ دن قلعے میں موجود بابر کی سپاہ کے لئے بے حد مفید اور کارآمد ثابت ہو رہے تھے۔ اندر موجود سپہ سالار دشمنوں سے سینہ سپر ہونے کے لئے تیاریوں میں مصروف تھے۔ نت نئی حکمت عملی وضع کی جا رہی تھی۔ حملہ آوروں کو منہ توڑ جواب دینے کے لئے حربے سوچے جا رہے تھے۔

آخر تیسرے دن نصف شب گزرنے کے بعد خاقان محمود خان کے لشکر میں کچھ ہلچل سی محسوس ہوئی۔ اس نے قلعے پر شب خون مارنے کا منصوبہ تیار کیا تھا۔

بانس کی طویل القامت سیڑھیاں قلعے کی سنگی فصیل کے ساتھ لگا دی گئی تھیں اور سپاہی سیاہ لباس میں ملبوس، سیڑھیوں کے ذریعے فصیل پر چڑھنے میں مصروف ہو گئے تھے۔

رات کی تاریکی میں وہ سیاہ لباس میں تاریکی کا حصہ دکھائی دے رہے تھے۔ دور سے دیکھنے سے پتا نہیں چلتا تھا کہ کوئی فصیل کی بلندی کی جانب بڑھ رہا ہے۔

قلعے کے مشرقی جانب کمندوں کے ذریعے سپاہیوں کو فصیل پر چڑھا کر اندر اتارنے کی کوششیں جاری تھیں۔ قلعے کے بڑے دروازے کے سامنے سترہ ہزار فوجی گھوڑوں پر سوار قلعے کا دروازہ کھلنے کے منتظر تھے۔ منصوبہ یہ تھا کہ سیڑھیوں کے ذریعے یا کمند لگا کر کچھ سپاہی قلعے کے اندر اتریں گے اور سرعت سے آگے بڑھ کر قلعے کا دروازہ وا کر دیں گے اور قلعے کے باہر پابہ رکاب فوج، تیز رفتاری سے قلعے میں داخل ہو جائے گی۔ اس طرح قلعے میں داخل ہونے کے بعد فتح یقینی تھی۔

محمد ظہیر الدین بابر کے جاسوس، قلعہ آخشی کی لحہ لحہ کی خبر بابر تک پہنچا رہے تھے۔ وہ آخشی سے دور تھا مگر اس کا دل یہاں کے لوگوں کے ساتھ دھڑک رہا تھا۔ اس کی آنکھیں یہاں پیش آنے والے معرکوں کو بخوبی دیکھ سکتی تھیں۔ گو کہ اس وقت وہ عمر میں اتنا زیادہ بڑا نہ تھا مگر ذہانت اور لیاقت میں وہ کئی عمر رسیدہ لوگوں سے کہیں آگے تھا۔ وہ فطری طور پر ایک جری سپاہی اور زیرک سپہ سالار تھا۔

خاقان محمود خان کا خیال تھا کہ اس کے سپاہی رات کی تاریکی میں خاموشی سے قلعے کے اندر جا اتریں گے اور قلعے والوں کو کانوں کان خبر نہ ہو گی جبکہ اس کے اس عمل کی خبر اندجان میں موجود بابر تک جا پہنچی تھی۔

”وزنی پتھروں اور کھولتے ہوئے تیل کی فصیل کے اوپر سے بارش کی جائے۔“ بابر کا حکم علی درویش بیگ تک پہنچا تو وہ چونک اٹھا۔ گو کہ وہ دونوں عمر رسیدہ اور جہاندیدہ سپہ سالار چوکنے اور مستعد تھے۔ مگر انہوں نے یہ نہیں سوچا تھا کہ محمود خان رات کی تاریکی سے اس انداز میں فائدہ اٹھانے کی کوشش کرے گا۔

سو فوری طور پر کئی کئی من وزنی پتھر فصیل سے باہر کی جانب پھینکے گئے اور تیل کھولا کر اوپر سے نیچے کی جانب پھینکا گیا۔ ساتھ ہی ابلتا ہوا پانی بھی فصیل کی بلندی سے نیچے کی جانب سے اوپر بڑھتے ہوئے دشمنوں پر پھینکا گیا۔

نصف فصیل تک پہنچ جانے والے اکثر سپاہی دیکھتے ہی دیکھتے فلک شگاف چیخوں اور دل فگار آہ و فغاں کے ساتھ زمین بوس ہو گئے۔ سلطان کی فوج کی ایک بڑی تعداد قلعے کے بڑے دروازے کے سامنے ایستادہ تھی۔ فصیل کے اوپر سے سات سو ماہر تیر اندازوں نے اس انداز سے تیر برسائے کہ دیکھتے ہی دیکھتے دشمن کے ہزاروں سپاہی ان تیروں کا نشانہ بن کے لقمۂ اجل بن گئے۔

صبح ہونے تک یہ معرکہ اختتام پذیر ہو گیا۔

اس معرکے میں صرف سلطان کی فوج کا یکطرفہ طور پر نقصان ہوا تھا۔ قلعے میں موجود کسی ایک سپاہی کا بال تک بیکا نہ ہوا تھا۔ خاقان محمود خان کے کئی ہزار سپاہی موت کے منہ میں چلے گئے تھے۔ اس پسپائی اور شکست فاش نے سلطان کی رہی سہی صحت بھی توڑ دی تھی۔ اب اسے اندازہ ہو گیا تھا کہ اس طرح کسی جنگ سے سوائے سخت نقصان کے کچھ حاصل ہونے کی توقع عبث ہے۔

اس نقصان و شکست کا اس کے دل و دماغ اور اعصاب پر بھی برا اثر پڑا تھا...... اور اچانک ہی اس کی طبیعت خراب ہو گئی تھی۔ تیز بخار نے آ لیا تھا۔ درد شکم نے اسے بے چین کر دیا تھا۔

لشکر کے ساتھ موجود اطباء اور حکماء سلطان کے علاج معالجے میں لگ گئے تھے۔ پر کئی دن بیتنے کے باوجود جب افاقہ کی کوئی صورت نظر نہ آئی تو سلطان نے اس بیماری کو عذر بنا کر واپسی کا ارادہ باندھا اور لشکر کو کوچ کا حکم دے دیا۔

”شہزادے مبارک ہو۔“ سپہ سالار علی درویش بیگ نے شہزادے جہانگیر خان کو مبارکباد پیش کرتے ہوئے مسرور لہجے میں خبر دی۔ ”سلطان بابر کے ماموں صاحب محاصرہ اٹھا کر رخت سفر کی تیاریوں میں ہیں۔“

”فوراً سلطان بابر کو خبر بھجوا دی جائے۔“ ایسن دولت بیگم نے سجدہ شکر ادا کرنے کے بعد مرزا قلی کلتاش کو حکم دیا۔ ”خداوند کریم کے کرم و مہربانی سے اس جارح دشمن سے نجات ملی۔“

شام ہونے تک محاصرہ اٹھا لیا گیا تھا اور خاقان محمود خان بیماری کی حالت میں اپنے لشکر کے ساتھ اپنے وطن کی جانب روانہ ہو گیا۔

☆......☆......☆

کاشغر کے نیلگوں شفاف آسمان پر ابھرتے سورج کی نارنجی کرنیں صبح صادق کا پیغام دے رہی تھیں۔ شہر کی مشرقی پہاڑیوں کی اوٹ سے خاور نو کا مدھم اجالا سنہرے غبار کی صورت ہر سو بکھرتا محسوس ہو رہا تھا۔

ختن کے خاکستری مرمر سے تعمیر شدہ کاشغر کے حاکم ابابکر دوغلت کاشغری کا محل ابھرتے سورج کی بنفشی و نارنجی کرنوں میں دمکتا ہوا دکھائی دے رہا تھا۔

کاشغری ایک جی دار اور بہادر سردار تھا۔ کئی برس سے وہ ختن اور کاشغر پر حکمرانی کر رہا تھا۔ سلطان عمر سعید مرزا کی اچانک موت اور اس کے ولی عہد کی کم عمری نے اس کے دل میں بھی حرص و ہوس کی جوت جگا دی تھی۔ اس کے عیار دماغ میں فرغانہ پر قابض ہونے کا شیطانی خیال بیدار ہوا تھا۔ اس وقت وہ اپنے محل کے دریچے میں کھڑا ابھرتے سورج کی طرف دیکھتے ہوئے اپنی کامیابی اور اپنے ملک کی وسعت کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ اس نے فوری طور پر اپنے مشیر خاص دودا خان کو طلب کیا۔

”دودا خان! کچھ تم نے سنا۔ سلطان عمر سعید مرزا، حادثاتی طور پر موت کے منہ میں چلا گیا ہے۔“ اس نے اپنے ادھیڑ عمر چاق و چوبند اور تیز طرار مشیر کی طرف دیکھ کر کہا۔ ”اور اب اس کا ملک بے یار و مددگار ہمارے رحم و کرم پر ہے۔ ہم وہاں جا کر لوٹ مار کریں یا حکومت پر قابض ہو جائیں، اب یہ ہماری صوابدید پر ہے۔“

”کیا واقعی؟“ مشیر کی ریاکار آنکھوں میں بھی حرص کی چمک جاگی۔

”ہاں بالکل۔“ وہ مسکراتا ہوا مخملی توشک پر بیٹھ گیا۔ ”سرداروں کو طلب کرو اور کوچ کی تیاری کا حکم دو۔ ہم دو روز بعد ہی فرغانہ کی طرف روانہ ہو رہے ہیں۔“

ابابکر دوغلت کاشغری اپنا لشکر لئے کند کے مقام پر آ پہنچا تھا۔ یہاں اس نے اپنا گڑھ قائم کیا اور سپاہیوں کے چھوٹے چھوٹے دستے بنا کر قرب و جوار کے علاقوں میں لوٹ مار پر متعین کر دیا۔ اکثر وہ خود سپاہیوں کو لے کر نکلتا اور قتل و غارت گری کے ساتھ لوٹ مار کا بازار گرم کرتا۔

محمد ظہیر الدین بابر ابھی اپنے رشتے داروں کی ریشہ دوانیوں سے نجات پا کر چین کی سانس لینے بھی نہ پایا تھا کہ اس شاخسانے کی خبر اس تک پہنچی۔ اس کا وجیہ چہرہ فکر و تردد سے دھواں دھواں ہو گیا۔

”بابر! میرے لخت جگر، کہو کیا بات ہے۔ تم کچھ پریشان دکھائی دیتے ہو؟“ سائے کی طرح ہر دم ساتھ رہنے والی اس کی ماں قتلق نگار خانم نے دریافت کیا۔

”آپ پریشان نہ ہوں امی جان۔“ بابر نے مسکرانے کی کوشش کرتے ہوئے جواب دیا۔ مگر کوشش کے باوجود وہ مسکرا نہ سکا۔ ”بس ایک معمولی سا معاملہ ہے، اللہ نے چاہا تو اس سے بھی سرخروئی کے ساتھ نبٹ لیا جائے گا۔“

چنانچہ اس نے فوری طور پر خواجہ قاضی کے پاس پیغام بھجوایا اور اسے حکم دیا کہ سپاہ کی ایک بڑی تعداد لے کر کاشغری کی گوشمالی کے لئے روانہ ہو جائے۔

حکم ملتے ہی خواجہ قاضی چند امراء اور ایک بڑے لشکر کے ساتھ کند کی طرف روانہ ہو گیا۔ دوپہر کے ڈھلنے تک وہ لوگ کند پہنچ گئے تھے۔ کاشغری کو توقع نہ تھی کہ بابر کی فوج اتنی سرعت اور اتنی بڑی تعداد میں اس کی سرکوبی کو پہنچ جائے گی۔

وہ ایک دلیر اور جی دار انسان مانا جاتا تھا۔ مگر اس وقت بابر کی فوج کو یوں اچانک اپنے سامنے پا کر اس کی دلیری اور جی داری دھری کی دھری رہ گئی اور اس کا پتہ پانی ہو گیا۔

اس سے قبل کہ خواجہ قاضی اس کے مٹھی بھر لیٹروں پر ہلا بولتا۔ وہ اپنے چند بڑے سرداروں کو ساتھ، سر جھکائے خواجہ قاضی کے خیمے میں حاضر ہوا۔

”خواجہ میں اپنی کمینگی اور اوچھی حرکتوں کی معافی چاہتا ہوں اور امید رکھتا ہوں کہ میری غلطیوں سے صرف نظر کرتے ہوئے مجھے واپسی کی راہ عطا کر دی جائے گی۔“

خواجہ قاضی نے کوئی فیصلہ دینے سے پہلے بابر سے رابطہ کیا۔ بابر اس وقت ایک اور جنگ میں الجھنے کے لئے آمادہ نہ تھا۔ اس لئے اس نے درگزر کا حکم صادر کر دیا۔

چنانچہ خواجہ قاضی نے ابابکر دوغلت کاشغری سے معافی نامہ اور آئندہ کبھی ایسی حرکت نہ کرنے کا اقرار نامہ تحریر کروا کر اور اس سے لوٹا گیا تمام اسباب لے کر اسے واپس جانے کی اجازت دے دی۔

کاشغری نے جان بخشی پر خواجہ قاضی اور سلطان بابر کا شکریہ ادا کیا اور لٹیروں کی فوج لے کر اپنے وطن ختن و کاشغر کی طرف روانہ ہو گیا۔

(جاری ہے)

allurdupdfnovels.blogspot.com www.freepdfpost.blogspot.com

ظہیرالدّین بابر

اشتیاق فاطمہ عظمیٰ

قسط : 5

اندجان کی فضا سوگوار تھی۔ چند ہی روز قبل اس ملک کا سلطان راہیٔ ملک عدم ہوا تھا اور نوعمر شہزادہ بابر جو ابھی صحیح معنوں میں تخت نشین ہوا بھی نہیں تھا، چاروں طرف سے اپنوں کی لگائی آگ میں گھر گیا تھا۔

پرصد شکر کہ جنگ کے بادل چھٹ گئے تھے۔ حالات کسی قدر قابو میں آچکے تھے۔ صورت حال بہتر ہوتے ہی مرحوم سلطان کی والدہ سلطان شاہ بیگم، قتلق نگار خانم کی والدہ یعنی بابر کی نانی ایسن دولت بیگم جہانگیر مرزا اور آخشی کے محل میں موجود دیگر امراء و سردار آخشی سے اندجان آئے تھے۔

آج مرحوم سلطان عمر سعید مرزا کی عزاداری کی رسمیں ادا کی جارہی تھیں۔ فقراء میں کھانا تقسیم کیا گیا۔ بستر اور کپڑے بھی بانٹے گئے۔ مرزا کی قبر کو پختہ کروا کر مزار کی تعمیر کے سلسلے میں فیصلہ کیا گیا۔

زنان خانے میں، ایک بڑے ایوان میں فرش پر سفید چاندنیاں بچھی ہوئی تھیں۔ ایوان کے مشرقی سرے پر خاکستری نمدے پر سلطان کی والدہ شاہ بیگم اور قتلق نگار خانم بیٹھی تھیں۔

دونوں خواتین کے چہروں سے ملال اور رنج ٹپک رہا تھا۔ نم آنکھوں سے وحشت ہویدا تھی۔ شاہ بیگم کی آنکھوں میں سلطان کے بچپن کے دن پرچھائیوں کی صورت گھوم رہے تھے۔ جب وہ ایک ننھا سا شہزادہ تھا اور ماں کی گود میں بیٹھ کر میٹھی میٹھی باتیں کیا کرتا تھا۔ آج وہ گور میں جا سویا تھا اور ماں خالی گود لئے آنسو بہا رہی تھی۔

قتلق نگار خانم کو سلطان کی رفاقت میں گزارے، ایک ایک لمحے کی یاد آرہی تھی۔ پہلی ہی نگاہ میں نگاہوں کی راہ سے اس کے دل میں اتر گیا تھا۔ پھر ان کی شادی ہوگئی تھی۔ اس نسبت پر وہ کس قدر خوش تھی۔ وصل کے لمحوں نے کیسی شادمانی دی تھی۔ اسے اولاد عطا کی تھی۔ بابر جیسا جری اور زیرک بیٹا اور خانزادہ بیگم جیسی نیک خو خوبصورت بیٹی...... پر اب وہ اس سے بچھڑ گیا تھا۔

بالکل اچانک چشم زدن میں وہ سارے رابطے، سب رشتے توڑ کر اس دار فانی سے کوچ کر گیا تھا۔ کیسی بدنصیبی تھی کہ وہ سر کے تاج کے اجڑنے پر دل کھول کر رو بھی نہ سکی تھی، کہ اپنوں کے ستم سے اپنے لخت جگر کو بچانے کی خاطر وہ سینہ سپر ہوگئی تھی۔

وہ لمحہ لمحہ بابر کے ساتھ رہی تھی۔ اسے حوصلہ دیتی رہی تھی۔ اس کی ہمت بندھاتی رہی تھی۔ مگر آج جب سب اس کی عزاداری کی رسم ادا کرنے جمع ہوئے تھے تو وہ ہفتوں کے رکے آنسوؤں کو روک نہ سکی تھی اور سفید دوپٹے میں چہرہ چھپا کر پھوٹ پھوٹ کر رو دی تھی۔

اس کی والدہ ایسن دولت بیگم جو ایک سمجھدار، سلجھی ہوئی اور باوقار خاتون تھیں، انہوں نے بیٹی کو سینے سے لگاتے ہوئے تسلی دی تھی۔

''بیٹی صبر اور حوصلے کا دامن تھامے رکھنے میں بھلائی اور کامیابی ہے۔ بابر ابھی نوعمر ہے۔ اسے تمہاری رہنمائی اور ہمت افزائی کی ضرورت ہے۔ دل چھوٹا کیے بنا تقدیر کی اس ٹھوکر کو قبول کرتے ہوئے، بیٹے کی کامیابی اور سربلندی کے لئے سینہ سپر ہو جاؤ۔''

اس نے بھیگی پلکوں سے ماں کی جانب دیکھا۔

دیکھا جاتا تو اس کی والدہ درست فرما رہی تھیں۔ جانے والا جاچکا تھا۔ یہ غم اب عمر بھر کا تھا۔ مگر تادیر ماتم کرنے سے کچھ حاصل نہیں ہونے والا تھا۔ سو اس نے اپنی اشکبار آنکھوں کو بے دردی کے ساتھ ہتھیلیوں سے مسل کر خشک کیا اور ایک عزم نو کے ساتھ بابر کے پاس جانے کے لئے اپنی جگہ سے اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔

اس کے ارادے کو بھانپ کر ایسن دولت بیگم بھی اسی کے ساتھ ہی اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔ دونوں خواتین آہستہ روی سے چلتی، بابر کے خاص ایوان کی طرف چل دی تھیں۔

محمد ظہیرالدین بابر اس وقت اپنے خصوصی ایوان میں بیٹھا تھا۔ اس کے پاس چند امراء اور مصاحب موجود تھے۔ جوں ہی خادم نے والدہ سلطان اور ایسن دولت بیگم کی آمد کا اعلان کیا۔ تمام اصحاب سر جھکا کر ایوان سے باہر چلے گئے تھے۔

دونوں بیگمات ایوان میں داخل ہوئیں۔

''آداب والدہ محترمہ اور نانی جان صاحبہ۔'' بابر اپنی نشست سے اٹھ کھڑا ہوا تھا۔ اور اس نے دونوں بزرگ خواتین کے ہاتھ تھام کر پشت پر مہر محبت ثبت کی تھی۔

''خدا اقبال بلند کرے، قدم قدم پر کامیابی بلندی اور عزت نصیب ہو۔'' ایسن دولت بیگم نے اس کا چہرہ تھام کر اس کی روشن اور کشادہ پیشانی پر بوسہ دیتے ہوئے دعاؤں سے اس کا دامن بھر دیا۔

''اب کیا سوچا ہے بیٹا؟'' نشست سنبھال لینے کے بعد ایسن دولت بیگم نے پُرسوچ نظروں سے اس کی جانب دیکھتے ہوئے سوال کیا۔

''جی تمام وقت سوچ بچار میں ہی گزرتا ہے۔'' بابر نے سنجیدگی اور بردباری سے جواب دیا۔ ''سب سے پہلے میں ملک کے نظم و نسق پر توجہ دینا چاہتا ہوں۔''

''یہی بات میں بھی تم سے کہنے آئی تھی۔'' قتلق نگار خانم نے دھیمی آواز میں کہا۔ ''خدا کا شکر ہے کہ جنگوں سے نجات ملی۔ اس باری تعالیٰ نے تمہیں سرخرو کیا۔ جن لوگوں نے ہمارا ساتھ دیا، اپنی صلاحیتوں اور وفاداری سے ملک و حکومت کی حفاظت کی، اب انہیں نوازنے کا وقت ہے۔''

ایسن دولت بیگم نے بھی کچھ اہم مشورے دیئے۔ کچھ دیر بعد وہ دونوں ماں بیٹی، بیٹے سے رخصت ہو کر زنان خانے میں چلی گئی تھیں۔

اگلے دن صبح اندجان کے محل میں دربار کا انعقاد کیا گیا۔ سب سے پہلے باقاعدہ تاج پوشی کی رسم ادا کی گئی۔ پھر تمام امراء و وزراء نے نذرانے گزارے۔ اب سلطان بابر نے عہدے اور مراتب کی تقسیم کا کام شروع کیا۔

اندجان کی حکومت اور سلطنت کی مدار المہامی پر حسن یعقوب کو مقرر کیا گیا۔ حسن یعقوب کو امیر حاجب کا یہ عہدہ ایسن دولت بیگم کے مشورے کی وجہ سے ملا تھا۔ گو کہ حسن یعقوب ایک زیرک اور پھرتیلا انسان تھا۔ وہ ایک بہادر، بہترین تیرانداز اور چوگان کا کھلاڑی تھا۔ مگر اس میں چھوٹی ذہنیت اور فسادی طبیعت کی خامیاں بھی تھیں۔

اوزن حسن کو اخشی کا حاکم بنا دیا گیا اور مرغلان کا صوبہ علی دوست طغائی کو تفویض ہوا۔ دیگر امراء کو کہ جنہوں نے مشکل وقت میں سلطان کا ساتھ دیا تھا اور وفاداری کا ثبوت دیا تھا۔ فرداً فرداً سب کو ان کی قابلیت کے مطابق زمینیں، عہدے، رقمیں اور جاگیریں عطا کی گئیں۔

اس کام سے فارغ ہو کر بابر نے فوج کی تنظیم نو پر بہت احتیاط اور باریک بینی سے توجہ کی۔ نئے تقرر شدہ افسروں اور سرداروں کی خدمات، صلاحیت اور لیاقت کا بھی درست اندازہ قائم کیا گیا۔

اب تنظیم نو کا کام اپنے آخری مراحل میں تھا کہ سیاسی حالات نے ایک اور حیران کن کروٹ لی۔

وسط جولائی کی وہ ایک گرم دوپہر تھی۔ گو کہ بادل چھائے ہوئے تھے، مگر غضب کا حبس تھا۔ ہوا تھم گئی تھی۔ پتے سے پتہ جڑا ہوا تھا۔ لوگ بارش کے لئے دعا گو تھے کہ پانی برسے تو گھٹن میں کمی ہو۔

ایسے میں ترکستان کے شمالی، علاقہ جات پر حاکم، سلطان احمد مرزا کی حالت اچانک بگڑ گئی۔ فرغانہ پر حملہ آور ہونے کے دوران اسے درد شکم اور تپ محرقہ کا عارضہ لاحق ہوا تھا اور اسی بیماری کو بہانہ بنا کر وہ غیر متوقع طور پر اس مہم کو ترک کر کے واپسی کے سفر پر روانہ ہوا تھا۔ جب سے وہ مسلسل بیمار چلا آرہا تھا۔ کبھی طبیعت سنبھل جاتی کبھی بگڑ جاتی، کبھی افاقہ ہو جاتا، کبھی پھر مرض لاحق ہو جاتا۔ تب سے یہ سلسلہ اسی طرح جاری تھا۔ مگر اس گھٹن والی دوپہر اچانک ہی اس کی خاصی طبیعت بگڑ گئی۔ فوری طور پر شاہی طبیب کو طلب کیا گیا۔ طبیب نے نبض دیکھنے کے بعد اعلان کیا۔ ''اب دوا سے زیادہ دعا کی ضرورت ہے۔''

فوری طور پر شاہی مسجد کے امام کو طلب کر لیا گیا۔ زنان خانے میں بیگمات اور کنیزیں تلاوت پاک میں مصروف ہوگئی تھیں۔ صدقہ نکالا جانے لگا۔ امام مسجد مریض کے سرہانے کھڑے ہو کر اس کی مشکل آسان ہونے اور بعد از مرگ مغفرت کی دعائیں کرنے لگا۔

چند ہی لمحوں بعد خاقان نے سیاہ حلقوں میں گھری اپنی زرد آنکھیں کھولیں۔ ایک نگاہ بے بسی سے چاروں طرف ڈالی۔ پھر آنکھیں بند کر لیں اور چوالیس سال کی عمر میں سلطان احمد مرزا راہیٔ ملک عدم ہوا۔

سلطان احمد مرزا کے انتقال کے بعد اس کے امراء نے اتفاق رائے سے ایک قاصد پہاڑی راستے سے سلطان محمود مرزا کے پاس بھیجا۔ کیونکہ مرحوم سلطان احمد مرزا کے کوئی اولاد نرینہ نہ تھی۔ اس لئے مشورے کے بعد امراء نے اس کے چھوٹے بھائی سلطان محمود مرزا کو جو بدخشاں اور ہندوکش کے پہاڑی علاقوں کے اضلاع پر حکمران تھا، تخت کی پیشکش کی۔

سلطان محمود مرزا نے اس پیشکش کو قبول کر لیا اور اپنے ایک بیٹے کو حصار اور دوسرے بیٹے کو بخارا کی حکومت سونپ کر خود سمرقند آگیا اور بغیر کسی مخالفت کے تخت نشین ہوگیا۔

اپنی اور اپنے بھائی کی سلطنت پر قابض ہو جانے کے بعد اس کے وسائل میں بے پناہ اضافہ ہوگیا تھا۔ ایک سخت گیر حکمران ہونے کی وجہ سے اس نے جلدی ہی اپنے تمام صوبوں میں امن و امان قائم کر دیا۔ سمرقند کے امراء کو جلد ہی یہ مایوس کن اور پریشان خیز احساس ہوگیا کہ انہوں نے ایک بدترین شخص کو اپنے حکمران کے طور پر چن لیا ہے۔

سلطان محمود مرزا ایک ظالم اور سنگ دل انسان تھا۔ اس نے ایک ذرا سی بات پر اپنے چچازاد بھائی ملک محمد مرزا کو جو اس کا داماد بھی تھا، اس کے چار ساتھیوں سمیت قتل کروا دیا۔

اس کی اس حرکت سے امراء اس سے بہت بدظن ہوگئے اور اس سے نفرت کرنے لگے۔ اس سے نفرت اور دوری کی دوسری وجہ اس کی بدکاری اور فاسق طبیعت تھی۔ جیسا وہ خود ظالم فاسق تھا ویسے ہی اس کے امراء تھے۔

ملک حصار کے لوگ آٹھوں پہر شراب نوشی اور بدکاری میں مشغول رہتے۔ خاص طور پر خسرو شاہ سے لوگ بہت عاجز آگئے تھے۔ وہ انتہائی درجے کا بدنظر اور بدکار تھا۔ اس کے تمام امراء بھی اسی کردار کے مالک تھے۔

اس شام خسرو شاہ کا ایک خادم ملکی کسی راستے سے گزر رہا تھا۔ تب ہی ایک گھر کے کھلے دروازے سے اس کی نظر گھر میں موجود خاتون پر پڑی۔ وہ خاتون جس کا نام مخدومہ خانم تھا، وہ ایک نیک خو انسان، ملک زوار خان کی بیوی تھی۔ ملکی مخدومہ کے حسن و رعنائی پر یوں فریفتہ ہوا کہ فوراً اندر داخل ہوا۔ مخدومہ کا ہاتھ تھام، زبردستی گھوڑے پر بٹھا، روانہ ہوگیا۔

عورت دہائی دیتی، روتی چلاتی رہی، مگر اس نے ذرا کان نہ دھرا۔

شام کو جب اس کا خاوند ملک زوار گھر آیا اور تمام قصہ اسے پتا چلا تو وہ فوری طور پر خسرو شاہ کی خدمت میں حاضر ہوا اور اس کے خادم ملکی کی شکایت کی۔

''تو یہ کہہ رہا ہے کہ تیری بیوی کو ملکی اٹھا لایا ہے؟'' خسرو شاہ نے مے کا پیالہ لبوں سے ہٹا کر خمار میں ڈوبی آنکھوں سے پریشان حال ملک زوار کی طرف دیکھ کر پوچھا۔

''جی جناب! مخدومہ خانم سے دو سال قبل میں نے شادی کی تھی۔ دو سال سے وہ میرے ساتھ میرے گھر میں تھی...... مگر آج''

''دو سال سے وہ تیرے ساتھ تیرے گھر میں تھی...... ہے نا؟'' خسرو شاہ نے لڑکھڑاتی آواز میں تائید چاہی۔

''جی جناب۔'' ملک زاور نے اثبات میں سر ہلایا۔

''دو سال سے تیرے ساتھ تھی، اب کچھ عرصے اسے ملکی کے ساتھ بھی رہ لینے دے، اس کا بھی دل ہے جو تیری بیوی پر آگیا ہے۔ کچھ دن اسے بھی اس کے ساتھ گزار لینے دے۔''

فریادی سر پیٹتا واپس لوٹ گیا۔ جاتا تو جاتا کہاں۔ خود سلطان محمود مرزا کا حال اس سے کچھ الگ نہ تھا۔ وہ ایک بدترین ظالم اور فاسق آدمی تھا۔ سمرقند میں آتے ہی اس نے لوٹ مار اور قتل و غارت گری کا بازار گرم کر دیا تھا۔

اہل سمرقند پچیس برس سے سلطان احمد مرزا کے سایۂ عاطفت میں امن و چین کی زندگی گزارتے رہے تھے، مگر اس کے چھوٹے بھائی سلطان محمود مرزا نے دو تین مہینوں میں ہی سب کی زندگی اجیرن کر دی تھی۔

کسی مطلق العنان حکمران کی طرح اس نے مال گزاری میں ترمیم کر دی اور جن لوگوں کو جملہ وجوہ کی بنا پر محاصل سے بری رکھا گیا تھا، انہیں بھی ادائیگی پر مجبور کر دیا گیا۔

اس بات پر علماء نے غضبناک ہو کر آواز مخالفت بلند کی۔ اس کی دیگر بدکارانہ حرکتوں کی وجہ سے تمام رعایا اس سے عاجز و بےزار ہوگئی تھی، مگر اس کا اقتدار اس قدر مضبوط تھا کہ اس کو ہلانا محال تھا۔ چنانچہ اس نے عوام الناس کے رونے اور واویلا مچانے پر چنداں توجہ نہ دی اور نہایت بے رحمی سے اپنی روش پر عمل پیرا رہا۔

جلد ہی وہ اپنی حکومت کا دائرہ کار بڑھانے کے لئے اِدھر اُدھر نظر دوڑانے لگا اور اس کا خیال ظہیرالدین بابر کی سلطنت فرغانہ کی طرف گیا۔

اسی شام اس نے اپنے چند مشیروں اور ہم نوالہ و ہم پیالہ رفقاء کار کو طلب کیا تاکہ اس سلسلے میں مشاورت کی جاسکے۔

''سلطان! آپ بالکل صحیح سوچ رہے ہیں۔'' اس کے ایک سردار کابلی خان نے خوشامدانہ لہجے میں کہا۔ ''فرغانہ آپ کے مقبوضات میں ایک قابل قدر اضافہ ہوگا۔''

''بالکل سلطان۔'' ایک اور مصاحب چہکتے لہجے میں گویا ہوا۔ ''ویسے بھی وہاں کا حکمران بابر کم عمر اور ناتجربہ کار ہے۔ اس کے دو سوتیلے بھائیوں کو اس کھیل میں آلۂ کار بنایا جاسکتا ہے۔''

''اور متعدد جاہ پرست امراء بھی ہیں۔'' عبدالقدوس بیگ نامی مصاحب خوشامدانہ لہجے میں بولا۔ ''جو نوعمر بادشاہ کی مرضی کو اپنے مفادات کے مطابق ڈھالنے میں ناکام ہو کر مایوس ہوتے جارہے ہیں۔''

''اس کا مطلب ہے کہ ہم ان امراء میں سے کسی نہ کسی کو توڑنے میں کامیاب ہو سکتے ہیں۔'' امراء کی آراء سننے کے بعد سلطان نے مسرور اور امید بھرے لہجے میں اظہار خیال کیا۔

''کسی امیر کو کیوں؟'' عبدالقدوس بیگ چہک کر بولا۔ ''خود حسن بن یعقوب کو کیوں نہیں۔''

''حسن یعقوب اندجان کا امیر حاجب۔'' سلطان محمود مرزا نے چونک کر سوال کیا۔ ''اسے کیونکر توڑا جاسکتا ہے۔ وہ تو بابر کا بے حد وفادار ہے۔''

''اس کی آپ فکر مت کریں۔'' عبدالقدوس عیاری سے مسکرایا۔ ''اسے میں اچھی طرح جانتا ہوں۔ حسن اتفاق سے وہ میرا رشتے دار ہے۔''

''پھر ٹھیک ہے۔'' سلطان نے فیصلہ کن انداز میں سر ہلایا۔ ''ہم اپنے بیٹے مسعود مرزا کی شادی سے فارغ ہولیں تو پھر اس طرف توجہ کرتے ہیں۔''

سلطان محمود مرزا نے چند دنوں بعد اپنے بڑے بیٹے سلطان مسعود مرزا کی شادی مرحوم سلطان احمد مرزا کی بیٹی صالحہ سلطان بیگم سے بڑی دھوم دھام سے کر دی۔ اس شادی میں سونے چاندی کے پستے بادام تقسیم ہوئے تھے۔ اس نے رشتے داری کے ناتے شگن کا حصہ بابر کے لئے بھی روانہ کیا۔

یہ حصہ عبدالقدوس لے کر اندجان پہنچا اور سب سے پہلے حسن یعقوب سے ملا۔

حسن یعقوب جو اندجان کا حاکم تھا اور عبدالقدوس کا قرابت دار بھی۔ سو کچھ دیر اِدھر اُدھر کی باتوں کے بعد وہ اصل مقصد کی طرف آتے ہوئے بولا۔ ''حسن یعقوب، کیا بابر اپنے امراء کی توقعات پر پورا نہیں اتر سکا؟''

''میں تمہارا مطلب نہیں سمجھا؟'' حسن یعقوب نے چونکتے ہوئے پوچھا۔

''ارے بھائی، مطلب صاف ہے۔'' عبدالقدوس اس کے قریب ہوتے ہوئے سرگوشی میں بولا۔ ''ظہیرالدین بابر اپنی عمر سے ذہنی طور پر کہیں زیادہ چالاک اور سمجھ دار ہے۔ کم عمری کے باوجود حکومت پر اس نے مضبوط گرفت قائم کر رکھی ہے۔ کوئی امیر اس کی مرضی کے بغیر سانس بھی نہیں لے سکتا۔''

''ہاں، یہ تو ہے۔'' حسن یعقوب نے گہرا سانس لیا۔

''نوعمر بادشاہ کو تخت نشین کرواتے وقت امراء کا خیال ہوگا کہ ناسمجھ بچے کو اپنے اشاروں پر نچاسکیں گے۔ اپنی من مانیاں کرسکیں گے۔ مگر یہاں تو معاملہ ہی اُلٹا نکلا۔ یہ گیارہ بارہ سال کا بچہ اپنے باپ سے بھی چار ہاتھ آگے ہے۔ مجھے یقین ہے اس کی جگہ سلطان عمر سعید مرزا ہوتا تو اب تک اپنے بھائی احمد مرزا اور اپنے برادر نسبتی محمود خان کے ہاتھوں اپنی سلطنت کب کی گنوا چکا ہوتا۔ مگر اس بالشت بھر کے بچے نے نہ صرف ان بڑی جنگوں سے بلکہ کاشغری کی چھوٹی بغاوت سے بھی ملک کو کس آرام سے بچا لیا ہے۔ کچھ بھی نہیں بگڑا۔ کوئی بڑا نقصان نہیں ہوا۔ یقین کرو، یہ لڑکا بہت خطرناک ہے۔ ابھی زمین سے اگا نہیں ہے تو یہ عالم ہے۔ کل جوانی کی عمر کو پہنچا تو سوچو کیسی کیسی قیامتیں ڈھائے گا۔''

''یہ تو سب ٹھیک ہے۔'' حسن یعقوب نے قدرے الجھتے ہوئے سوال کیا۔ ''بھلا ان سب باتوں کا اس وقت کیا مذکور؟''

''حسن یعقوب ہوش کے ناخن لو۔'' عبدالقدوس نے اس کے کندھے ہلاتے ہوئے معنی خیز انداز میں سرگوشی کی۔ ''تمام عمر کی خدمتوں اور وفاداریوں کا صلہ حاصل کرنے کا بھی تو موقع ہوتا ہے۔ جب تک سلطان کچی عمر کا ہے، جو چاہو جھپٹ لو۔ مگر تمہارا یہ کچی عمر کا سلطان اندر سے بے حد پکا ہے۔ اس کے ہوتے تم کسی کے کان کا میل بھی نہ لے سکو گے۔''

حسن یعقوب کو اب اس کی بات سمجھ میں آنی شروع ہوگئی تھی۔ اس نے بھنویں سکیڑ کر سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔ ''پھر کیا ہو؟''

''تمہارے سوال کا جواب یہ ہے۔'' عبدالقدوس کی آواز مزید دھیمی ہوگئی تھی۔ ''کہ اگر اپنا بھلا چاہتے ہو تو اس کچی عمر کے پکے سلطان سے نجات حاصل کر کے اس شہزادے کو تخت پر بٹھا دو جو اپنی عمر کی طرح ذہنی طور پر بھی کچا اور ناسمجھ ہے۔''

''تمہارا اشارہ جہانگیر مرزا کی طرف ہے؟'' حسن یعقوب کو خود اپنی آواز کہیں دور سے آتی محسوس ہوئی۔ ''مگر عبدالقدوس تم جانتے ہو، یہ اتنا آسان نہیں ہے۔''

''آسان نہیں ہے تب ہی تو تم سے مدد مانگ رہا ہوں۔'' عبدالقدوس ہلکے سے ہنس کر بولا۔ ''ورنہ میں خود نہ کر لیتا۔'' پھر ذرا توقف کے بعد پُریقین لہجے میں کہا۔ ''اور مجھے ہی نہیں، سلطان محمود مرزا کو بھی پورا یقین ہے کہ یہ بیل تم ہی منڈھے چڑھا سکتے ہو۔ یہ کام صرف تم ہی پایۂ تکمیل تک پہنچا سکتے ہو۔''

''بدلے میں مجھے کیا ملے گا؟'' حسن یعقوب نے کھردرے لہجے میں سوال کیا۔

''وہ سب کچھ، جو تم بابر کے ہوتے حاصل کرنے کا تصور بھی نہیں کر سکتے۔''

عبدالقدوس کے جواب نے حسن یعقوب کو سوچنے پر مجبور کر دیا تھا۔ کافی دیر سوچ بچار اور معاملے کے ہر پہلو پر غور و فکر کے بعد حسن یعقوب نے عبدالقدوس کی معرفت سلطان محمود مرزا سے ایک معاہدہ کر لیا۔ ایک غیر تحریری معاہدہ جس کے پورا ہونے کا اسے یقین تھا۔

حسن یعقوب کو سوچ و خیال کی نئی راہیں دے کر عبدالقدوس اپنی راہ لگ گیا۔

اس کے واپس جاتے ہی حسن یعقوب نے اس منصوبے پر مزید غور و فکر شروع کر دیا تھا۔ اسی سوچ بچار میں کئی مہینے بیت گئے۔ وہ چیونٹی کی چال سے اپنی چال چلنے میں مصروف تھا۔ اس نے بنا کسی مشکل کے بابر کے چند درباریوں کو اپنے ساتھ ملا لیا تھا۔ اب وہ کسی مناسب وقت کا انتظار کر رہا تھا۔ جب وہ اپنے آقا بابر کو ہٹا کر نوخیز شہزادے جہانگیر مرزا کو تخت نشین کروا سکتا۔ اسے امید تھی کہ یہ سب کچھ نہایت آسانی سے ہو جائے گا۔ گو کہ امیروں کو توڑتے وقت اسے اچھی طرح اندازہ ہوگیا تھا کہ اکثر امراء بابر کے بے حد وفادار ہیں۔ بلکہ یہ کہنا مناسب تھا کہ امراء، وزراء اور درباریوں میں اکثریت بابر کے وفاداروں اور جاں نثاروں کی تھی۔

چنانچہ جیسے ہی کچھ امراء کو حسن یعقوب کے ارادوں اور منصوبوں کا اندازہ ہوا، وہ سب ایک دم چوکنا ہوگئے۔ معاملے کی تحقیق کی گئی اور جب بات درست ثابت ہوئی تو خواجہ قاضی، قاسم قوچین، علی دوست طغائی اور ازون حسن، بابر کی نانی، ایسن دولت بیگم کے حضور حاضر ہوئے۔ مشورہ و غور و فکر کے بعد یہ طے پایا کہ حسن یعقوب کو فوری طور پر معزول کر دیا جائے۔

اس وقت ایسن دولت بیگم قلعہ سنگین چافار میں تھیں، جبکہ حسن یعقوب شہر ارک میں موجود تھا۔

ایسن دولت بیگم نے فوری طور پر قاصد کو بھیج کر بابر کو بلوایا۔ بابر کے لئے نانی کی ہر بات حکم کا درجہ رکھتی تھی، سو وہ گھڑی کی چوتھائی میں اپنی نانی کی خدمت میں حاضر ہوگیا۔

''میرے بچے، میرے جگر گوشے، خدا ہمیشہ تمہارے ساتھ رہے اور دشمنوں کے نرغے سے تمہیں ہمیشہ محفوظ و مامون رکھے۔'' مدبر، دوراندیش اور صاحب الرائے بزرگ خاتون نے اپنے چہیتے نواسے کی روشن اور تابناک پیشانی کو چومتے ہوئے دعا دی۔

''شکریہ نانی جان۔'' بابر، ایسن دولت بیگم کے عین مقابل دھری نشست پر بیٹھتے ہوئے مشکور لہجے میں گویا ہوا۔ ''آپ کی دعائیں اور مشورے میرے لئے باعث کامیابی کامرانی ہیں۔ خدا تاقیامت آپ کا سایہ ہمارے سروں پر سلامت رکھے۔''

ایسن دولت بیگم نے ایسی نظروں سے اپنے نوعمر مگر بے حد باشعور اور بہادر نواسے کو دیکھا جس میں رحم سے زیادہ فخر و انبساط تھا۔

بابر ایک طرح سے مسائل و مصائب میں گھر گیا تھا۔ ایک تو اس نوعمری میں شفقت پدری سے محروم ہوگیا تھا۔ دوسرے اس کے ناتواں کاندھوں پر سلطنت کا بوجھ عظیم آپڑا تھا اور جب سے وہ تخت نشین ہوا تھا مصائب و آلام اس پر ٹوٹے پڑ رہے تھے۔

ایسے میں شفیق نانی کا اپنے اس معصوم مشکل میں گرفتار نواسے پر رحم کرنا حق بنتا تھا مگر ایسن دولت بیگم بے حد دانا اور مدبر خاتون تھی، اس لئے اس وقت اسے بابر پر رحم سے زیادہ فخر و غرور محسوس ہو رہا تھا۔

''میرے جری ہونہار۔'' چند لمحوں کی خاموشی کے بعد نانی نے کہنا شروع کیا۔ ''یہ تخت و تاج، یہ حکومت و سلطنت کانٹوں بھری وادی کا دوسرا نام ہے۔ تمہارے سامنے ایک اور مسئلہ درپیش ہے۔ تحمل سے سنو اور تدبر سے فیصلہ کرو۔ پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ ہم سب تمہارے ساتھ ہیں۔''

اس کے بعد ایسن دولت بیگم نے حسن یعقوب کی سازش اور بغاوت کے بارے میں بابر کو اطلاع بہم پہنچائی تھی۔

لمحہ بھر کو بابر کی بڑی بڑی سیاہ بادامی آنکھوں میں حیرت ابھری۔ پھر یہ حیرت افسردگی اور ملال میں بدل گئی تھی۔ حسن یعقوب جیسے وفادار بھی بے وفائی اور غداری پر اتر آئیں تو کار سلطنت چلانا کیونکر آسان ہو سکتا ہے؟

''میرے سلطان! ہمیشہ یاد رکھو۔ پھولوں کے ساتھ کانٹے بھی ہوتے ہیں، اور دانائی کا تقاضا ہے کہ انگلیاں فگار کیے بنا، کانٹوں کو نوچ کر نابود کر دیا جائے۔''

ایسن دولت بیگم نے اس جملے کے ساتھ ہی حسن یعقوب کو کیفر کردار تک پہنچانے کا منصوبہ بابر کے سامنے رکھ دیا تھا۔

اسی دوپہر بابر اپنے وفاداروں کو ساتھ لئے ارک کی طرف روانہ ہوگیا۔ ارک کی فضائیں بوجھل اور خاموش تھیں۔ دم سادھے سہج سہج قدم رکھتی ہواؤں نے قدم بوس ہو کر اپنے نوخیز و نوعمر سلطان کا استقبال کیا تھا۔

اب بابر نے حسن یعقوب کے مکان کا رخ کیا۔ وہ اپنے شکاری عملے کے ساتھ شکار کھیلنے نکلا ہوا تھا۔ مکان پر اس کے ساتھی سردار محمد باقر بیگ اور محمود دولدئی موجود تھے۔ وہ یوں اچانک اپنے سامنے بابر کو دیکھ کر ہکا بکا رہ گئے۔ شمر بوستان جو مکان سے باہر موجود تھا، اس نے فوری طور پر ایک قاصد حسن یعقوب کی طرف روانہ کیا تاکہ اسے بابر کی آمد کی اطلاع ہو جائے۔

بابر نے سارے نمک حرام سرداروں کو گرفتار کر لیا۔ سپاہیوں کو زندان میں ڈال دیا گیا، جبکہ باغی سرداروں کو سمرقند کی طرف روانہ کر دیا گیا۔ ادھر حسن یعقوب کو جونہی خبر ملی، اس نے فوراً سمرقند کا رخ کیا۔

اس فتنے کو فنا کرنے کے بعد سلطان بابر نے اندجان کی حاکمیت قاسم قوچین کے حوالے کی اور ایک بار پھر حسن یعقوب کی طرف متوجہ ہوگیا۔

حسن یعقوب، بابر کی آمد کی خبر پاتے ہی سمرقند کی طرف چل دیا تھا۔ ابھی کند بادام تک ہی پہنچا تھا کہ ایک نیا شیطانی خیال اس کے ذہن میں آیا۔

''ابو رفان۔'' اس نے اپنے قریبی ساتھی، جو اس کے شکاری عملے کا سربراہ بھی تھا، سے مخاطب ہو کر بولا۔ ''سمرقند جانے کی بجائے کیوں نہ ہم آخشی کا رخ کریں اور وہاں فتنہ و فساد بپا کر کے بابر کا سکون غارت کریں۔''

''خیال برا نہیں۔'' ابو رفان مسکرایا۔ ''تو اب ہم فوقان کی طرف سفر کریں گے اور جلد ہی آخشی کے نواح میں پہنچ جائیں گے۔''

آخشی کے نواحی علاقے فوقان پہنچ کر حسن یعقوب نے فسادات کا آغاز کر دیا۔ اس نے قصبے کے کچھ فتنہ پرداز لوگوں کو اپنے گروہ میں شامل کیا اور لوٹ مار اور فتنہ و فساد کا بازار گرم کرنا شروع کیا۔

سلطان بابر کو جوں ہی خبر ملی، اس نے کچھ سرداروں کو فوج لے کر آخشی کی طرف روانہ کیا۔ تاکہ اس فتنے کو جڑ سے اکھاڑ پھینکا جاسکے۔ سردار صحبت خان نے سردار ولی خان کی قیادت میں ایک دستہ قراول کے لئے مقرر کر دیا تھا۔ یہ قراول دستہ اصل فوج سے جدا تھا۔

حسن یعقوب کو جونہی خبر ملی، اس نے راتوں رات اس قراول دستے پر شب خون مارا...... ان کی فرودگاہ کو اطراف سے گھیر لیا اور تیر برسانے شروع کیے۔

بابر کی فوج کا سردار ولی خان فوراً ہی چوکنا ہوگیا۔ سپاہیوں کو بھی ہوشیار کر دیا گیا۔ مگر تاریک رات میں ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہ دیتا تھا۔ ہر سمت شب دیجور کا گھور اندھیرا مسلط تھا اور رات کی سیاہ چادر سے دشمن کے سپاہی تیروں کی بارش کیے جارہے تھے۔

حسن یعقوب خود بھی اعلیٰ درجے کا تیر انداز تھا۔ وہ نہ صرف اپنے سپاہیوں کی قیادت کر رہا تھا بلکہ تیر برسانے میں بھی پیش پیش تھا۔ سیاہی کی چادر تنی ہونے کے باوجود وہ سب آنکھیں پھاڑے تاریکی میں دیکھنے کی ناکام کوشش کے ساتھ تیر پر تیر برسائے جارہے تھے۔

تب ہی اچانک حسن یعقوب کے ایک سپاہی نے کمان میں تیر کسا اور کھینچ کر جو چھوڑا تو لہراتا ہوا دور جانے کی بجائے، کچھ فاصلے پر کھڑے حسن یعقوب کی پشت میں پیوست ہوگیا۔

''بدبخت تو نے یہ کیا کیا؟'' حسن یعقوب نے پلٹ کر اندھیرے میں کھڑے اپنے قاتل کی طرف دیکھنے کی کوشش کی۔ مگر اگلے ہی لمحے وہ زمین بوس ہوگیا تھا۔ تیر پشت سے اس کے دل تک جا پہنچا تھا۔

لحظہ بھر میں اس کی آنکھوں کے سامنے تنا اندھیرا کچھ اور گہرا ہوگیا۔ وہ کراہتا اور تڑپتا ہوا موت کے منہ میں چلا گیا۔ خس کم جہاں پاک۔ اس کی موت کی خبر پھیلتے ہی اس کے سپاہی تاریکی میں جس طرف جس کا منہ اٹھا بھاگ کھڑے ہوئے اور بابر کو اس فتنے سے ہمیشہ کے لئے نجات مل گئی۔

☆......☆......☆

دور آخشی کی مشرقی سمت میں واقع قرمزی پہاڑیوں کی اوٹ سے صبح کاذب کا سنہرا غبار پھوٹ رہا تھا۔ صبح کی تازہ ہواؤں کے مدھر اور ملائم جھونکوں میں بنفشے کے نوشگفتہ پھولوں کی مہک رچی ہوئی تھی۔ بابر کو نماز تہجد ادا کیے کافی دیر ہو چکی تھی۔

حسن یعقوب کے فتنے کے فرو ہونے کے بعد بابر نے مکمل طور پر شرعی بود و باش اختیار کر لی تھی۔ کھانے پینے میں ہر مشتبہ چیز سے پرہیز اختیار کر لیا تھا اور نماز تہجد بھی بہت کم قضا ہوتی تھی۔

نماز تہجد کی ادائیگی کے بعد وہ کچھ دیر تلاوتِ کلام پاک میں مشغول رہا، پھر کتاب اللہ کو حریری جزدان میں لپیٹ کر طاق پر رکھ کر وہ دریچے میں آکھڑا ہوا تھا۔

تازہ ہوا کے مشکبار جھونکوں نے اس کے مشام جان کو تازگی و بالیدگی کا احساس عطا کیا تھا اور وہ دور خاکستری پہاڑیوں کی اوٹ سے سر ابھارتے خاور نو کو دیکھ کر خالق کائنات کی تسبیح کرتا رہا تھا۔

شاہی مسجد سے اذان فجر کی پُرنور اور حیات بخش صدا کے آتے ہی وہ مسجد جانے کے لئے اٹھ کھڑا ہوا۔ اپنے رب عظیم کے سامنے سجدہ ریز ہو کر درخواست کی تھی۔ ''اے میرے بہترین سازگار اور مدد کرنے والے۔ تیری ہی مدد اور حمایت کی وجہ سے اب تک میری بات بنی ہوئی ہے۔ سمرقند کا حکمران ظالم و فاسق محمود مرزا اب بھی میری جان اور میری سلطنت کا دشمن ہے...... تو مجھے اور میری رعیت کو اس کے شر سے محفوظ رکھنا۔ میں صبر اور نماز سے تیری مدد و حمایت کا خواستگار ہوں، تیرے سوا میرا کوئی مددگار نہیں، بے شک تو بہترین کارساز ہے، تو ہی میرا مولا اور تو ہی میرا مددگار ہے۔''

وقت آہستہ روی سے آگے بڑھ رہا تھا۔

اس سے قبل کہ سلطان محمود مرزا اپنی فطری شرانگیزی کے باعث بابر کے لئے کوئی اور فتنہ جگاتا، اچانک ہی وہ بیمار پڑ گیا اور دیکھتے ہی دیکھتے محض چھ دنوں میں، زمین اس کے فاسق وجود سے پاک ہوگئی۔

اس کے مرتے ہی اس کی سلطنت میں ایک شورش پھیل گئی اور قسمت نے ایک دم پانسہ پلٹ دیا۔

کل تک بابر کو جنوب اور مغرب کی طرف سے اپنے اس طاقتور ہمسائے کا خطرہ لاحق تھا جو اس کی مملکت فرغانہ کو ہضم کرنے کے لئے بے چین و مضطرب تھا۔ آج بابر نے اپنے مقابل ایک منتشر سلطنت پائی، جس کے معاملات میں وہ بڑی آسانی سے اپنے مفاد کی خاطر مداخلت کرنے کا حوصلہ کر سکتا تھا۔

جیسے ہی سلطان محمود مرزا کی آنکھیں بند ہوئیں۔ اس کے علاقوں پر قبضے کے لئے اس کے تینوں بیٹوں، مسعود مرزا، باسنغر مرزا اور علی مرزا کے مابین کشمکش شروع ہوگئی۔

اس وقت بڑے دونوں بیٹے وہاں موجود نہیں تھے۔ سلطان مسعود مرزا حصار اور باسنغر مرزا بخارا میں تھا۔ چنانچہ اس موقع سے فائدہ اٹھانے کی امید میں وزیر خسرو شاہ نے سمرقند اور شاہی خزانے پر قبضہ کرنے کا ارادہ کیا۔ لیکن وہ اپنی بدترین اور فاسق حرکتوں کی وجہ سے عوام الناس میں اس قدر نامقبول اور غیر پسندیدہ تھا کہ اس کے ارادے کو بھانپتے ہی عام بغاوت ہوگئی اور لوگوں نے اسے گرفتار کر کے حصار کی طرف روانہ کر دیا۔

امراء کی مجلس میں محمود مرزا کے دوسرے بیٹے باسنغر مرزا کو جانشین تسلیم کر لیا گیا۔ مگر اس کے بڑے بھائی مسعود مرزا نے اس بے انصافی کے خلاف آواز اٹھانے کا فیصلہ کیا، مگر امراء نے اس کی آواز کو نظر انداز کرتے ہوئے باسنغر مرزا کو تخت نشین کروا دیا۔

ابھی باسنغر مرزا بہ مشکل تمام سمرقند کے تخت پر براجمان ہوا تھا۔ کہ نئی پریشانیوں نے اسے چاروں طرف سے گھیر لیا۔ جنید برلاس اور دیگر سربرآوردہ سرداروں نے اس کی حاکمیت کو تسلیم کرنے سے انکار کرتے ہوئے منگولستان کے حکمران خاقان محمود کو مداخلت کی دعوت دی۔

اس دعوت سے خاقان محمود خان کی آنکھوں میں حریصانہ چمک جاگ اٹھی تھی۔ سمرقند جیسا سرسبز و شاداب میوؤں سے بھرا، پھولوں سے اٹا صوبہ حاصل کرنے کی امید یقین بن کر اس کے رگ و پے میں سرایت کرتی محسوس ہوئی۔

اس نے فوری طور پر اپنے سرداروں کو طلب کیا اور تمام رات کی مشاورت کے بعد اس نادر موقع سے بھرپور فائدہ اٹھانے کی خاطر، اپنے ایک انتہائی تجربہ کار اور زیرک سپہ سالار حیدر کلتاش کی کمان میں منگولوں کا ایک لشکر جرار سمرقند پر حملہ کرنے کے لئے روانہ کر دیا۔

سمرقند کے نوآموز سلطان، باسنغر مرزا کو جس کی عمر اس وقت محض اٹھارہ برس تھی۔ جب خاقان محمود کے لشکر کی آمد کی خبر ملی تو وہ متوحش سا آنے والے اس طوفان کا مقابلہ کرنے کے لئے، اپنی سی تگ و دو میں لگ گیا۔ اس نے اپنی وراثت کی حفاظت کی خاطر دشمنوں کا ڈٹ کر مقابلہ کرنے کا فیصلہ کیا۔

سب سے پہلے اس نے اپنے سرداروں اور اپنے سپاہیوں سے ایک بے باکانہ اور مدبرانہ خطاب کیا۔ اس نے اپنے خطاب میں کہا۔

''میرے سردارو، میرے سپاہیو! تم نے اور میری رعایا نے، میرے بڑے بھائی مسعود مرزا کی بجائے میرا انتخاب کیا۔ اس لئے کہ آپ اس کی بہ نسبت مجھ پر زیادہ اعتبار کرتے تھے۔ آج وقت آگیا ہے کہ میں ثابت کرسکوں کہ آپ کا وہ اعتبار غلط نہیں تھا۔ میں آپ کے اعتماد پر پورا اترنے کی خاطر اپنی جان کی بازی لگا دینے کو تیار ہوں۔ مگر اس سے قبل آپ سب کو میرا ساتھ دینا ہوگا تاکہ ہم غاصب دشمن پر ایک کاری ضرب لگا کر اس کی کمر توڑ سکیں۔ ہم حملہ آوروں کو ایسا منہ توڑ جواب دیں کہ وہ آئندہ صدیوں تک ہماری سلطنت کی طرف نگاہ اٹھا کر دیکھنے کی جسارت بھی نہ کر سکیں۔ اور میں یہ اکیلا نہیں کر سکتا اس کے لئے مجھے آپ سب کا ساتھ، وفا اور دلاوری درکار ہے۔''

اس کے ولولہ انگیز خطاب سے لشکر میں ایسی توانائی اور طاقت پیدا ہوئی کہ انہوں نے باہر نکل کر کن بالی کے قریب حملہ آوروں کو زبردست شکست دی کہ دشمن کو بھاگنے تک کا موقع نہ ملا۔ باسنغر مرزا تمام وقت میدان جنگ میں موجود رہا۔ اور اس کی موجودگی میں خاقان کی فوج کے قیدی سپاہیوں کا ایسا قتل عام کیا گیا کہ تین دفعہ اس کا خیمہ ہٹا کر دوسری جگہ نصب کیا گیا۔ کیونکہ زمین لاشوں سے پٹ گئی تھی۔

☆......☆......☆

اندجان کے محل میں، اس کشادہ اور آراستہ ایوان میں جس میں دربار منعقد کیا جاتا تھا۔ فرش پر اعلیٰ درجے کے گداز اور ملائم قالین بچھے تھے۔ سامنے کی دیوار کے ساتھ ایک ہاتھ بھر اونچے ساگوان کی لکڑی کے چبوترے پر رنگین اور خوش نما غالیچے موجود تھے۔

چبوترے کے بیچوں بیچ مخملی توشک پر سفید نمدہ پڑا تھا۔ عنابی اور اعوانی گاؤ تکیوں پر ریشم اور کلابتو سے دیدہ زیب کشیدہ کاری کی گئی تھی۔ ایوان کے بلند و بالا دروازوں پر حریری پردے لہرا رہے تھے اور ہر دروازے کے باہر دو تنومند ہتھیار بند دربان ایستادہ تھے۔

سلطان کی نشست گاہ کے سامنے لمبوترے ایوان میں تمام امراء، وزراء اور مشیران، ضوفشاں خلعات سے آراستہ، سروں پر چمکتے ریشمی امامے اور پگڑیاں باندھے، سر جھکائے مؤدب و مستعد کھڑے تھے۔ شاہی لشکر کے تینوں بڑے سردار بھی دوزانو موجود تھے۔

کچھ ہی دیر بعد دربان کی پکار ابھری تھی۔

''باادب باملاحظہ، سلطان محمد ظہیرالدین بابر تشریف لا رہے ہیں۔''

اگلے ہی لمحے بابر سر اونچا کیے باوقار اور متین انداز میں چلتا دربار میں داخل ہوا۔ اس کے پیچھے اس کے محافظین بے نیام تلواریں لئے اس کے پیچھے چل رہے تھے۔

چبوترے کے سامنے رک کر اس نے حاضرین دربار کی طرف دیکھا۔ تمام درباری ادب سے دُہرے ہوگئے تھے۔ وہ اعتماد اور وقار سے چبوترے کے دو قدمچوں پر قدم دھرتا، چبوترے پر پہنچ کر اپنی شاہی نشست پر براجمان ہوگیا تھا۔

دربار سے ملحق چھوٹے کمرے میں اس کی والدہ قتلق نگار خانم اور نانی ایسن دولت بیگم اس کی حمایت اور حوصلہ افزائی کے لئے موجود تھیں۔

''اس خدائے بزرگ و برتر رحیم و رحمان کے نام سے اپنے دربار کا آغاز کرتا ہوں۔'' چند لمحوں کے توقف کے بعد نوجوان سلطان بابر کی مضبوط آواز ابھری۔ ''آپ سب جانتے ہیں کہ آج ہم یہاں مملکت سمرقند میں چچا جان محترم سلطان محمود مرزا کی اچانک وفات اور پھر ان کے پڑوسی ملک کے خاقان جناب ماموں جان خاقان محمود کے حملے اور سلطان باسنغر مرزا کے مقابلے کے بعد پیدا ہونے والی صورت حال پر غور کرنے کے لئے جمع ہوئے ہیں۔''

تمام درباریوں نے بے حد مؤدبانہ انداز میں اثبات میں سر ہلایا۔

''سمرقند ہمارے آباء امیر تیمور کی شوکت و عظمت کا نشان رہا ہے۔ والد محترم مرحوم سلطان عمر سعید مرزا بھی اس تخت کو حاصل کرنے کی آرزو رکھتے تھے۔ ہمارے دل میں بھی اس آرزو کے چراغ ٹمٹمار ہے ہیں۔''

''بجا فرمایا سلطان معظم۔'' حاتم برگوش نے دھیمی آواز میں جواب دیا۔ ''مگر میں عرض کرنا چاہوں گا کہ اس آرزو کے ٹمٹماتے چراغ کی لو کو بھڑکانے کے لئے پیش قدمی کا تیل دینے سے قبل ہمارے سامنے کچھ اور معاملات اس امر سے زیادہ اہم اور توجہ طلب موجود ہیں جن کو طے کرنا نہایت ضروری ہے۔''

بوڑھے سردار کی بات سن کر بابر نے گردن کو ذرا سا خم دے کر اس کی جانب دیکھا تھا......!

(جاری ہے)

ظہیر الدین بابر

اشتیاق فاطمہ عظمٰی

قسط : 6

حاتم برگوش، سلطان بابر کی پُر جلال نظروں کی تاب نہ لاتے ہوئے ایک دم خاموش ہوگیا۔ اس کے لئے خاموشی اختیار کر لینے کے بعد بابر نے اپنے سامنے کھڑے اندجان کے امیر حاجب قاسم قوچین کو مخاطب کر کے کہا۔ ''آپ کیا فرماتے ہیں امیر صاحب؟''

''سلطان معظم کو ناگوار خاطر نہ گزرے تو میں بزرگ سردار حاتم برگوش کی بات کی نہ صرف تائید کروں گا بلکہ اس بات کو آگے بڑھاتے ہوئے مزید کہوں گا کہ......''

قاسم قوچین کے لحظہ بھر کو خاموش ہونے پر بابر نے تدبر بھرے انداز میں کہا۔ ''آپ جو کچھ کہنا چاہتے ہیں، بلا جھجک کہئے، میں ہمہ تن گوش ہوں۔''

''سلطان معظم کی عنایت ہے۔'' قاسم قوچین نے جھک کر تعظیم پیش کی اور اپنی بات کو آگے بڑھاتے ہوئے بولا۔ ''سمرقند کی فتح کے منصوبے پر توجہ دینے سے قبل کچھ دوسرے معاملات زیادہ توجہ طلب ہیں۔ مثال کے طور پر خجند جس پر ہمیشہ ہی مرحوم سلطان اپنا حق سمجھتے رہے تھے، حالیہ مصائب کے دوران فرغانہ کے تصرف سے نکل گیا...... اور اب سمرقند کا ماتحت ضلع ہے۔ اسی طرح ایک اور صوبہ اتیپہ جو پہلے فرغانہ کا حصہ تھا، اب باستغر مرزا کے بھائی علی مرزا کے پاس ہے، اور سب سے اہم بات یہ ہے کہ کاشغر اور فرغانہ کے درمیان جو قبائل آباد ہیں، ان میں سے ایک قبیلہ خراج کی ادائیگی میں دشواریاں پیدا کر رہا ہے۔'' قاسم قوچین دَم لینے کو دم بھر کو رکا۔ پھر اسی دھیمے انداز میں گویا ہوا۔ ''اگر اس قبیلے کی گوشمالی نہ کی گئی تو اس کی دیکھا دیکھی دوسرے قبائل بھی خراج دینے میں لیت ولعل کرنے لگیں گے۔''

''ہوں۔'' سلطان بابر نے قاسم قوچین کی تمام باتیں نہایت توجہ اور انہماک سے سنی تھیں اور اس کے وجیہہ چہرے پر سوچ کی گہری چھاپ اُبھر آئی تھی۔

ٹھیک انہی لمحات میں اندجان سے دور سمرقند میں سلطان باستغر مرزا اپنے مشیروں اور امراء کے ساتھ مشاورت میں مصروف تھا۔

''میرے والد مرحوم کے وفادار ساتھیو! آپ سب کی مشاورت اور آپ سب کی مدد وحمایت سے فرغانہ کے سلسلے میں جو منصوبے والد گرامی رکھتے تھے، میں نہیں چاہتا کہ سلطان مرحوم کی بے وقت موت کی وجہ سے ان کے دیرینہ خواب شکستہ تعبیر رہ جائیں۔ میں ان کے ادھورے منصوبوں کو پایۂ تکمیل تک پہنچانا چاہتا ہوں۔''

''آپ کا مطلب ہے کہ......'' اس کے باپ کے زمانے کے بوڑھے سردار پیر محمد ایلچی نے دھیمے اور قدرے حیران لہجے میں سوال کیا۔ ''آپ سلطان محمود مرزا کے فرغانہ پر قبضے کے خواب کو شرمندۂ تعبیر کرنا چاہتے ہیں۔''

''ہاں۔'' سلطان باستغر مرزا نے بغیر کسی پس وپیش کے اثبات میں سر ہلایا۔ ''سلطان بابر نوعمر اور ناتجربہ کار ہے۔ والد گرامی جن خطوط پر سوچ رہے تھے، انہی راستوں پر اگر ہم سفر کریں تو جلد ہی فرغانہ ہمارا مقبوضہ ہوگا۔''

''آپ سلطان محمود مرزا کے خواب کو پورا کرنا چاہتے ہیں؟'' ایک دوسرے سردار بوغا قوچین نے قدرے تحسین بھرے لہجے میں کہا۔ ''آپ کا یہ جذبہ قابل قدر اور قابل تحسین ہے۔ نیک اور صالح اولاد ہی والدین کے ادھورے کام پورے کرتی ہے مگر ہمیں اس معاملے میں بہت سوچ سمجھ کر ہاتھ ڈالنا ہوگا۔''

محمود خان سے معرکہ آرائی میں فتح وکامرانی نے باستغر مرزا کو بہت زیادہ با اعتماد اور خوش فہم بنا دیا تھا۔ وہ مضبوط لہجے میں بولا۔ ''آپ کا کہنا بجا ہے مگر اس وقت ہم جس مقام پر ہیں، ہمارے لئے بابر کو ڈرا دھمکا کر بھگا دینا اور فرغانہ کو اپنے تسلط میں لے لینا، ایسا کچھ مشکل امر نہیں ہے۔''

''دشمن کو کبھی کمزور نہیں سمجھنا چاہئے۔'' ایک سنجیدہ اور باوقار سردار، خان ایوب خان نے گمبھیر لہجے میں کہا۔ ''براہ راست کسی جنگ میں کودنے کی بجائے تدبیر ومکر سے کام لینا زیادہ سود مند ہوگا۔''

''وہ کس طرح؟'' باستغر مرزا نے حیرت بھری دلچسپی سے سوال کیا۔

''میں بتاتا ہوں۔'' بوڑھے سردار نے سمجھانے والے انداز میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ''میں عمر سعید مرزا مرحوم کا ایک پرانا خادم جو منگول سردار ہے اور جس کا نام ابراہیم سارو ہے، اسے میں اچھی طرح جانتا ہوں، وہ بچپن سے سلطان عمر سعید کی خدمت میں تھا...... امیری کے مرتبے پر فائز ہوا۔ پھر اپنی بدفطرتی کے باعث وہاں سے نکالا گیا۔ آج کل اسفرہ میں موجود ہے۔ میرا خیال ہے اس سے رابطہ کر کے ہمیں اس کی صلاحیتوں سے فائدہ اٹھانا چاہئے۔''

سلطان باستغر مرزا کئی لمحوں تک بوڑھے سردار ایوب خان کی باتوں پر غور کرتا رہا۔ دوسرے سرداروں نے بھی اس مشورے کی تائید کی تھی۔

کافی سوچ بچار کے بعد آخر وہ فیصلہ کن لہجے میں بولا۔ ''ٹھیک ہے، فرغانہ کی مغربی سرحد پر واقع اسفرہ میں فوری طور پر ابراہیم سارو سے رابطہ قائم کر کے اسے اپنے مفاد کی خاطر اپنے ساتھ ملا لیا جائے اور اس سے مقدور بھر فائدہ حاصل کرنے کی کوشش کی جائے۔''

''جو حکم سلطان عالی مقام۔'' تمام امراء نے سر جھکا کے سلطان کے فیصلے کو تسلیم کیا۔

اسی وقت ایوب خان نے ایک قاصد کو بھیج کر ابراہیم سارو سے رابطے اور ملاقات کی کوشش کی ابتدا کی۔

اس کی کوشش جلد ہی بار آور ثابت ہوئی۔ ابراہیم سارو ان کے ساتھ کام کرنے پر آمادہ ہوگیا تھا۔ چنانچہ اس نے کچھ لوگوں کو اپنے ساتھ ملا کر قلعہ اسفرہ پر قبضہ کر لیا اور بابر کے خلاف علم بغاوت بلند کرتے ہوئے اسفرہ پر سلطان باستغر مرزا کی حکمرانی کا اعلان کر کے اس کے نام کا خطبہ پڑھوا دیا۔

ادھر ظہیر الدین بابر ابھی سوچ بچار میں ہی مصروف تھا کہ سمرقند کو حاصل کرنے کے لئے لشکر کشی کرے یا پہلے سے موجود نسبتاً چھوٹے مسائل کو حل کرے۔ ابھی وہ کسی فیصلے پر پہنچ نہ پایا تھا کہ ابراہیم سارو کی بغاوت اور اس کی قلعہ اسفرہ پر قبضے کی خبر پہنچی۔

بابر نے فوری طور پر اپنے فوجی سرداروں کو طلب کر کے اس سلسلے میں صلاح مشورہ شروع کیا۔

''اس موقع پر ہمیں کیا حکمت عملی اختیار کرنی چاہئے؟'' بابر نے اپنے سامنے مؤدب ومستعد سرداروں کو اجتماعی طور پر مخاطب کر کے کہا۔ ''جہاں تک میرا اپنا خیال ہے، میں سوچ رہا ہوں کہ اس سلسلے میں ہمیں بالکل دیر نہیں کرنی چاہئے۔ اپنا لشکر لے کر اسفرہ پر چڑھ دوڑنا ہی مناسب ہوگا۔''

''آپ بالکل درست سوچ رہے ہیں سلطان معظم۔'' سید قاسم ایشک آغا نے جھک کر سر کچھ اور جھکا کر مؤدبانہ لہجے میں کہا۔ ''ہمیں اپنی شمشیریں بے نیام کر لینی چاہئیں۔''

بابر کے باریک گلابی اور نرم ہونٹوں پر غیر محسوس سی مسکراہٹ لرزی۔ وہ جانتا تھا سید قاسم ایشک آغا شمشیر زنی میں اپنا ثانی نہیں رکھتا تھا اور یہ اس کی عادت تھی کہ وہ اپنی ہر بات میں شمشیر کا ذکر ضرور کرتا تھا۔

''آپ کیا کہتے ہیں سردار احمد تنبل؟'' بابر نے دوسرے سردار کو مخاطب کیا۔

''جی سلطان معظم۔'' احمد تنبل نے ایشک آغا کی بات کی تائید کرتے ہوئے کہا۔ ''آغا کا خیال بہت سعد اور صائب ہے۔ اس وقت سلطان باستغر مرزا، خاقان محمود خان کے مقابلے پر روانہ ہو چکا ہے۔ وہ اس وقت ابراہیم سارو کی کوئی مدد نہ کر سکے گا۔ ہم چیل کی طرح اڑ کر، باز کی طرح اس پر جھپٹ کر اس بغاوت کو ابتدا میں ہی ختم کر سکتے ہیں۔''

دوست محمد طغائی اور دیگر سرداروں کا بھی یہی خیال تھا۔

سو بابر مئی کے آغاز میں اسفرہ پر حملے کے لئے اندجان سے روانہ ہوا اور اسفرہ پہنچ کر اس نے قلعے کا اس طرح محاصرہ کر لیا کہ کہیں کمک اور مدد کا کوئی امکان نہ رہنے دیا۔

ابراہیم سارو اپنا دستہ لے کر قلعے سے نکلا اور دوبدو جنگ کا آغاز ہوا۔ سب سے پہلے فوج سے نکل کر سید قاسم ایشک آغا نے شمشیر زنی کی۔ دشمن کا جو سپاہی اس کی شمشیر کی زد میں آیا، کٹ کر ڈھیر ہوگیا۔

احمد تنبل اور دوست محمد طغائی بھی بہت بہادری سے لڑے۔ اس موقع پر خدا بیردی کو دشمن کا ایک تیر آ کر لگا اور وہ گھوڑے کی پشت سے تیورا کر زمین پر گرا اور جان، جان آفرین کے سپرد کر دی۔

بابر کے سپاہی زرہ بکتر کے بغیر مقابلے پر نکل آئے تھے، اس لئے کافی سپاہی لقمۂ اجل بنے اور کافی زخمی ہوئے۔ ابراہیم سارو کے پاس ایک نہایت مشاق اور ماہر تیر انداز تھا۔ اس کے تیروں سے بابر کے بے شمار سپاہی زخمی ہوئے۔

شام ڈھلے بابر کے سپاہی اپنے خیموں اور ابراہیم سارو کا بچا کھچا دستہ واپس قلعے میں چلا گیا۔

بابر کو توقع تھی، اگلے دن بھی ابراہیم سارو مقابلے پر آئے گا مگر ایسا نہیں ہوا۔ اسے شاید بابر کے لشکریوں کی مہارت اور جذبے کا اندازہ ہوگیا تھا۔ اسی لئے وہ قلعہ بند ہو کر بیٹھ گیا۔

بابر بدستور قلعے کا محاصرہ کئے ہوئے تھا۔ دیکھتے ہی دیکھتے مہینہ گزر گیا۔ بابر کا ارادہ تھا کہ سرنگ لگا کر قلعہ میں داخل ہونے کی کوشش کی جائے۔ سو اس امر کو بروئے کار لانے کے اسباب جمع کرنے میں افراد مصروف ہوگئے۔

دن پر دن گزرتے جا رہے تھے۔ ادھر قلعے میں محصور ابراہیم سارو اور اس کے ساتھیوں کا حال پتلا ہوتا جا رہا تھا۔

باستغر مرزا کی طرف سے کسی مدد کی امید نہ تھی، نہ کوئی رسد کی توقع تھی۔ قلعے میں موجود اشیائے خورونوش آہستہ آہستہ ختم ہو رہی تھیں۔ ابراہیم کی پریشانی لحہ بہ لحہ بڑھتی جا رہی تھی۔

آخر بہت غور وفکر کے بعد وہ خواجہ مولانا کی وساطت سے بابر سے معافی کا خواستگار ہوا۔

بابر نے معاف کر دینے کا عندیہ دیا تو وہ تلوار گلے میں لٹکا کر ننگے سر اور ننگے پاؤں قلعے سے باہر آیا اور قلعے کا دروازہ بابر کے لشکر کے لئے کھول دیا۔ اس نے اطاعت قبول کی اور قلعہ بابر کے حوالے کر دیا۔

اس موقع پر کچھ سالاروں کا مشورہ تھا کہ ابراہیم سارو جیسے نمک حرام اور غدار سے سختی سے نبٹا جائے اور اس کا سر کاٹ کر قلعے کے دروازے پر لٹکا دیا جائے تاکہ دوسرے لوگ اس کے انجام سے عبرت حاصل کریں۔

''یقیناً اس کے ساتھ ایسا ہی کیا جاتا۔'' بابر نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''اگر میں اسے معاف کر دینے کا وعدہ نہ کر لیتا، اب ہم اس کے ساتھ لطف وکرم کا برتاؤ کرنے پر مجبور ہیں۔''

سو ابراہیم سارو کو معاف کر دیا گیا۔

اس طرف سے نبٹ کر بابر نے اب خجند پر حملہ کرنے کا ارادہ باندھا۔ خجند شروع میں فرغانہ کا صوبہ تھا۔ مگر بعد میں اس پر احمد مرزا قابض ہوگیا تھا۔ آج کل وہ باستغر مرزا کی سلطنت کا حصہ تھا مگر اس نے خجند اپنے بھائی علی مرزا کے حوالے کر رکھا تھا۔

اب جبکہ بابر اپنے لشکر جرار کے ساتھ خجند کے قریب پہنچ چکا تھا تو اس نے اس مسئلے کو بھی حل کرنے کا فیصلہ کر لیا اور خجند پر حملہ آور ہوا۔

خجند میں عبدالوہاب شغاول حاکم تھا۔ بابر جونہی شہر میں داخل ہوا، شغاول نے باستغر مرزا سے رابطے کی کوشش کی۔ وہ منگولوں سے الجھا ہوا تھا۔ کوئی دوسری راہ نہ پا کر شغاول بابر کے خیمے میں حاضر ہوا اور بلا تامل شہر اس کے حوالے کر دیا۔

ان دو بڑی کامیابیوں نے نہ صرف سپاہ کا حوصلہ بڑھایا بلکہ بابر کو بھی شادمانی اور خوشی عطا کی تھی۔ جب لشکری اور سلطان بابر فتح کی خوشی منا رہے تھے، تب بابر کو خبر ملی تھی کہ اس کا ماموں خاقان محمود خان، شاہ رخیہ شہر میں موجود ہے۔

شاہ رخیہ، خجند سے زیادہ فاصلے پر نہ تھا۔ سو بابر گہری سوچ میں ڈوب گیا۔

''آپ کیا سوچ رہے ہیں؟'' سید قاسم نے اس کے چہرے کی طرف غور سے دیکھتے ہوئے سوال کیا۔

''میں سوچ رہا ہوں، جب ہم شہر شاہ رخیہ سے اتنے قریب ہیں اور وہاں ماموں جان خاقان محمود خان موجود ہیں، تو کیوں نہ میں ان سے ملاقات کی سعادت حاصل کر لوں۔''

''آپ خاقان سے ملنے جانا چاہتے ہیں؟'' سید قاسم نے حیرت سے پوچھا۔

''تو اس میں حرج ہی کیا ہے۔ وہ میرے بڑے ہیں، بزرگ ہیں، مثل باپ کے ہیں۔ مجھے ان سے ملنے کے لئے ضرور جانا چاہئے۔''

''سلطان معظم! آپ جیسا مناسب سمجھیں۔'' سید قاسم نے سر جھکا کر دھیمے لہجے میں جواب دیا۔ اس کے لہجے سے فکر مندی اور ناخوشگواری کا اظہار ہو رہا تھا۔

''تمہارے خیال میں اس میں کچھ قباحت ہے؟'' بابر نے پوچھا۔

''نہیں، قباحت تو کوئی نہیں۔'' چند لمحوں تک غور کرنے کے بعد سید قاسم نے جواب دیا۔ ''بس مجھے یونہی خیال آیا تھا کہ وہ لوگ کہیں آپ کو کوئی نقصان نہ پہنچائیں۔''

''نہیں، آپ بے فکر رہیے۔'' بابر مسکرایا۔ ''منگول صرف میدان جنگ میں دشمن ہوتے ہیں ورنہ رشتوں کو نبھانے والے ہوتے ہیں۔ وہ مجھے کوئی نقصان نہیں پہنچائیں گے بلکہ اس سے دلوں کی کدورتیں رفع ہو جائیں گی، فاصلے کم ہو جائیں گے۔''

سید قاسم نے سر جھکا دیا تھا۔

ظہیر الدین بابر اپنے ایک حفاظتی دستے کے ساتھ ماموں سے ملاقات کے لئے روانہ ہوگیا۔ خاقان محمود خان شاہ رخیہ سے باہر ایک باغ میں ٹھہرا ہوا تھا۔ اس باغ کو حیدر بیگ نے تعمیر کروایا تھا۔ اسی لئے اس کا نام حیدریہ باغ پڑ گیا تھا۔

خاقان حیدریہ باغ کے بیچوں بیچ ایک بڑے چہار در خیمے میں مقیم تھا۔ خیمے کے دروازوں پر ایرانی مخملی پردے پڑے تھے۔ فرش پر دبیز ایرانی قالین بچھے تھے۔

خیمے کے مغربی حصے میں ریشمیں توشک پر مخملی گاؤ تکیوں کے سہارے خاقان تشریف فرما تھا۔ اس کے پیچھے دو ہتھیار بند خادم کھڑے تھے۔ اسی طرح ننگی تلواریں تانے خیمے کے دروازے پر بھی خدام موجود تھے۔

خیمے کے دروازے پر پہنچ کر بابر گھوڑے سے اتر پڑا تھا۔ سید قاسم اور دوست محمد طغائی اس کے ہمراہ تھے۔ وہ سر اونچا کئے باوقار انداز میں چلتا خیمے کے دروازے سے اندر داخل ہوا۔ سامنے خاقان محمود خان تکیوں کے سہارے بیٹھا تھا۔ بابر نے خیمے میں داخل ہوتے ہی تین بار جھک کر سلام پیش کیا۔

خان بھی احترام میں اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا۔ بابر نے مصافحے کے لئے ہاتھ بڑھایا۔ خان نے بھانجے کے ہاتھ کو اپنے ہاتھ میں لے کر گرم جوشی سے دبایا۔ پھر اس نے بابر کو بے حد شفقت سے بلا کر اپنے پہلو میں بٹھایا اور نہایت نرمی اور محبت سے اس سے محو کلام ہوا اور بہت اصرار اور پیار سے اپنے ساتھ کھانا کھلایا۔

خاقان محمود خان سے ملاقات کر کے بابر کو سکون اور ایک بے نام سی خوشی حاصل ہوئی تھی۔ ماموں سے ملنے کے بعد وہ اماں کے راستے آخشی اور اندجان کی طرف روانہ ہوا۔

آخشی پہنچ کر اب وہ اپنے والد گرامی سلطان عمر سعید مرزا کے مزار کی زیارت کی آرزو رکھتا تھا۔ اس کے امراء بھی اس کے ساتھ تھے۔ قلعے کے انتہائی مغربی سرے پر واقع شاہی گورستان میں سلطان مرحوم ابدی نیند سو رہا تھا۔

شہر خموشاں میں ہر سمت موت کی سی خاموشی تھی۔ ہوا بھی دم سادھے اور دبے دبے قدموں چل رہی تھی۔ جا بجا ایستادہ تناور پیڑ سر جھکائے ساکت کھڑے تھے۔ ہر سمت ایک عجب سی اداسی اور افسردگی پھیلی ہوئی تھی۔

بابر شکستہ قدموں سے چلتا، چاہنے والے باپ کی قبر پر حاضر ہوا تھا اور ہاتھ اٹھا کر آبدیدہ آنکھوں سے فاتحہ خوانی میں مصروف ہوگیا تھا۔

واپسی میں سلطان بابر بے حد اداس اور غمگین دکھائی دے رہا تھا۔ وہ کسی فاتح اور پُر جلال سلطان کی بجائے ایک ایسا نوعمر بچہ لگ رہا تھا جس کے سر سے کچی عمر میں ہی باپ کا سایہ اٹھ گیا تھا۔ وہ بے یار ومددگار اور یتیم رہ گیا تھا۔

سید قاسم کو بھی اپنی آنکھوں میں نمی اترتی محسوس ہوئی تھی اور اس نے ہاتھ کی پشت سے سختی سے آنکھوں کو رگڑ ڈالا تھا۔

وہ رات اداسی اور افسردگی میں کٹ گئی تھی۔

اگلے دن بابر اندجان کے لئے روانہ ہوگیا مگر روانگی سے قبل اس نے نادہندہ رعایا سے خراج وصول کرنے کے لئے فوج روانہ کر دی تھی۔ جونہی بابر پایۂ تخت پہنچا، پیچھے سے اس کی فوج فتح ونصرت کے ساز بجاتی آ پہنچی تھی۔ 20/ ہزار بھیڑیں اور 2/ ہزار گھوڑے قبائلیوں سے حاصل کر کے فوج واپس لوٹی تھی۔

محل میں کامیابی پر شکرانے پڑھے گئے، غریبوں میں کھانا تقسیم کیا گیا۔ ایسن دولت بیگم نے جری نواسے کا صدقہ اتارا۔ بابر جب اپنی والدہ قتلق نگار خانم کے سینے سے لگا تو ماں کی آنکھیں بے اختیار نم ہوگئی تھیں۔

''میرے لعل! تم سے جدا ہو کر یہ دن میں نے جس طرح گزارے، میرا خدا ہی جانتا ہے۔''

''میں نے بھی ہر قدم پر آپ کی کمی محسوس کی۔'' بابر نے ماں کے کان کے پاس منہ لا کر سرگوشی کی۔ ''ہر مشکل لمحے میں خیال آیا، کاش آپ ساتھ ہوتیں۔''

''تو میرے لخت جگر آج ایک وعدہ کرو۔'' قتلق نگار خانم نے بابر کا ہاتھ تھامتے ہوئے مُصر لہجے میں کہا۔ ''اب تم جہاں بھی جاؤ گے، جب بھی جاؤ گے، تمہاری ماں تمہارے ساتھ جائے گی۔''

ایسن دولت بیگم حیرت سے بیٹی کو دیکھ رہی تھیں۔ ''قتلق کیسی باتیں کر رہی ہو؟'' [illegible] ''تم جانتی ہو بابر فتنے دفن کرنے کے لئے میدان کارزار کے سفر پر تھا۔ آگے معلوم نہیں کتنے اور معرکے سر کرنے ہیں۔ بھلا ایسے میں تم......''

''نہیں نانی جان۔'' بابر نے ماں کے سر پر بوسہ دیتے ہوئے مضبوط لہجے میں کہا۔ ''میں اپنی عزیز والدہ کی یہ خواہش رد نہیں کر سکتا۔ آج کے بعد میرے ہر سفر میں امی جان میرے ساتھ ہوں گی۔''

''جیتے رہو میرے بچے۔'' قتلق نگار کی بھیگی آنکھیں ایک دم مسکرانے لگی تھیں۔ ''خداوند کریم تمہیں ڈھیروں کامیابیاں عطا کرے، تمہاری سلطنت وسیع سے وسیع تر ہو جائے اور تم سلطان سے شاہ اور شاہ سے شہنشاہ بن جاؤ۔''

''شکریہ امی جان۔'' بابر بھی مسکرانے لگا تھا اور ماں بیٹے کو خوش دیکھ کر ایسن دولت بیگم کے لبوں پر بھی تبسم بکھر گیا تھا۔

اب آخری مہم اتیپہ کی رہ گئی تھی۔

اتیپہ کو سلطان باستغر مرزا نے اپنے بھائی علی مرزا کو بخش دیا تھا۔ بابر اپنا لشکر لے کر اتیپہ کی طرف روانہ ہوا تو اس کی ماں قتلق نگار خانم بھی اس کے ہم رکاب تھی۔

☆......☆......☆

اتیپہ کے شاہی محل زرنگار میں سلطان علی مرزا سر جھکائے گہری سوچ میں ڈوبا ہوا تھا۔ ابھی کچھ ہی دیر پہلے اسے خبر ملی تھی کہ سلطان ظہیر الدین بابر لشکر لے کر اتیپہ کی طرف محو سفر ہے۔

''سلطان معظم! اس بالشت بھر لڑکے کی آمد کی خبر سن کر آپ اس قدر متفکر کیوں ہوگئے؟'' اس کا مربی اور سرپرست شیخ ذوالنون ارغن اپنے حریری لبادے کو جسم کے گرد لپیٹتا ہوا قدرے تحقیر بھرے لہجے میں بولا۔ ''اس کل کے چھوکرے کے لئے تو میرے اپنے دستے ہی بہت ہیں۔''

علی مرزا کی پُر سوچ آنکھوں کی سوچ کچھ اور گہری ہوگئی۔

''میرا خیال ہے، یہی مناسب ہے۔'' وہ سوچتی ہوئی آواز میں گویا ہوا۔ ''میں اپنے ساتھ مختصر سی فوج لے کر یہاں سے نکل جاتا ہوں، آپ اپنے دستوں اور سرکاری سپاہ کے ساتھ اس شہر کا دفاع کریں، اور بقول آپ کے اس بالشت بھر کے لڑکے کا مقابلہ کریں۔''

''آپ یہاں سے جا رہے ہیں؟'' ذوالنون ارغن قدرے حیرانی سے بولا۔

''ہاں۔'' سلطان علی مرزا اپنی جگہ سے اٹھتا ہوا بولا۔ ''نہ صرف جا رہا ہوں بلکہ فوری طور پر جا رہا ہوں۔''

اس کے بعد سلطان علی مرزا بعجلت تمام وہاں سے چلتا بنا۔

اب شہر کی حفاظت اور دفاع کی ذمہ داری شیخ ذوالنون ارغن پر تھی۔ ارغن ایک مشاق، تجربہ کار اور لائق جرنیل تھا۔ اس نے فوری طور پر اپنے دستوں اور سرکاری افواج کی گنتی کروائی۔ گھوڑے اور اونٹ وافر تعداد میں موجود تھے۔ اس نے شہر پناہ کے سامنے کھلے میدان میں تمام سپاہ کو جمع کر کے صف بندی کا حکم دیا اور خود بھی زرہ بکتر پہن کر گھوڑے کی پشت پر سوار ہو کر میدان کارزار میں چلا آیا۔

دوپہر کے ڈھلتے وقت، بابر اپنی فوج کے ساتھ اتیپہ کے نواح میں پہنچا۔ اس کے جاسوسوں نے پہلے ہی اسے علی مرزا کی روانگی اور ذوالنون ارغن کی فوجی تیاری کی اطلاعات بہم پہنچا دی تھیں۔

چنانچہ بابر نے شہر سے کافی فاصلے پر رک جانا مناسب سمجھا۔ پھر اس نے اپنے چند سپاہیوں کو ارغن کے لشکر کی سن گن لینے کے لئے بھیجا۔ نہ خیمے نصب کئے گئے تھے، نہ سپاہی گھوڑوں سے اترے تھے۔ بابر بھی گھوڑے پر تنا بیٹھا تھا۔ اصل صورت حال جانے بغیر وہ لشکر کو پڑاؤ انداز ہونے کا حکم نہیں دینا چاہتا تھا۔

وہ کم عمر تھا مگر چند ماہ کی جنگ وجدال میں اس نے بہت کچھ سیکھ لیا تھا۔ وہ پیدائشی طور پر جنگجو تھا۔ ایک لائق سپہ سالار اور ایک بہترین فیصلہ کرنے والا سلطان تھا۔

کچھ ہی دیر میں سپاہیوں نے آ کر لشکر کی تعداد اور ارغن کے تیوروں کے بارے میں بتایا۔ بابر اپنی والدہ قتلق نگار خانم کی طرف آیا۔

قتلق چند کنیزوں کے ساتھ اونٹ کے اوپر محمل میں موجود تھی۔ بابر ماں کی خدمت میں حاضر ہوا اور تمام صورت حال ماں کے گوش گزار کی۔

''بابر، میں تمہاری نانی ایسن دولت بیگم جیسی دور اندیش اور دانا تو نہیں ہوں مگر ساری بات سن کر میرا دل کہتا ہے ہمیں واپس لوٹ جانا چاہئے۔''

''امی جان۔'' بابر نے پیار سے ماں کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر اس کی پشت پر مہر عقیدت ثبت کرتے ہوئے کہا۔ ''بخدا میرا دل بھی یہی کہہ رہا تھا، میں اپنی سپاہ کو ایک چھوٹے سے شہر کی خاطر موت کے منہ میں دھکیلنے کو تیار نہیں۔''

اسی وقت بابر نے واپسی کا حکم دیا اور سپاہ میدان جنگ میں اترے بنا ہی واپسی کے لئے پلٹ گئی۔

ابھی وہ اندجان پہنچا ہی تھا کہ اسے خبر ملی کہ اس کے ماموں محمود خان نے اتیپہ پر حملہ کر دیا۔ ارغن، بابر کے لوٹ جانے کے باعث خاصا بے نیاز اور لاپرواہ ہوگیا تھا۔ خاقان محمود نے اس کی لاپروائی کا پورا فائدہ اٹھایا اور اس شدت سے حملہ آور ہوا کہ ارغن کو جان بچا کر بھاگتے بنی اور محمود خان نے اتیپہ پر قبضہ کر لیا۔ اتیپہ پر قابض ہونے کے بعد اس نے شہر محمد حسین دوغلت کے حوالے کیا اور خود اپنی سلطنت کی جانب واپس لوٹ گیا۔

☆......☆......☆

سلطنت خراسان کے دارالحکومت ہرات کے نیلگوں آسمان پر سرمئی اودی بدلیاں مثل آہستہ خرام پرندوں کے تیرتی پھر رہی تھیں۔ ہواؤں کے نرم جھونکوں میں آمد برسات کی ایک خوش کن اور امید بھری نوید تھی۔ ایسے سہانے اور دلکش موسم میں خراسان کا حکمران سلطان حسین بیقرہ اپنے دربار میں اونچے چوکے پر حریری توشک پر زرنگار گاؤ تکیوں کے سہارے خاندانی کروفر کے ساتھ جلوہ افروز تھا۔

سلطان حسین بیقرہ، امیر تیمور کے بڑے بیٹے کی نسل سے تھا اور اپنے خاندان کے شہزادوں میں سب سے زیادہ طاقتور تھا۔ وہ ایک وسیع سلطنت اور پُر شکوہ دربار کا مالک تھا۔ وہ اعلیٰ تعلیم یافتہ علم وفنون کا قدردان، فیاض اور دلیر انسان تھا۔

اس کا دربار تمام ایشیا میں سب سے زیادہ عالیشان وتابناک تھا۔ اس دور کے اور اس اطراف کے دیگر حکمرانوں کی طرح حسین بیقرہ کے دل میں بھی فتوحات کی شدید خواہش ہر دم چٹکیاں لیتی رہتی تھی، دیگر حکمرانوں کی طرح وہ بھی اپنے پڑوسیوں کو نقصان پہنچا کر اپنے علاقوں کی توسیع کے لئے ہمیشہ تیار رہتا تھا۔

سلطنت سمرقند کے مصائب اور مشکلات پر اس کی گہری نظر تھی اور اس وقت وہ اپنے عالیشان دربار میں موجود تھا۔ اس کے دونوں جانب اس کے بیٹے بدیع الزماں بیقرہ اور مظفر حسین بیقرہ بیٹھے ہوئے تھے جبکہ سامنے دونوں طرف اس کے امراء، وزراء، مشیر اور فوجی سردار سر جھکائے مؤدب ومستعد کھڑے تھے۔

آج اس نے یہ دربار سمرقند کے حالات پر تبصرہ کرنے اور اپنے آئندہ کے لائحہ عمل کو مرتب کرنے کے لئے منعقد کیا تھا۔

''خاقان محمود کی منگول فوج کو بھگانے کے بعد اب باستغر مرزا خاصا خوش اور مطمئن دکھائی دیتا ہے۔'' بیقرہ کے بوڑھے وزیر بوغا خان نے دھیمے لہجے میں اپنی بات سلطان کے گوش گزار کی۔

''تو سمجھ لو بوغا خان۔'' سلطان حسین بیقرہ مسکرایا۔ ''ہم اس کے اطمینان اور انبساط کو تادیر قائم نہیں رہنے دیں گے۔ سمرقند کا تخت ہمیں پکار رہا ہے۔ ہمارے آبا کا وہ مسکن جس پر سب سے زیادہ ہمارا حق ہے۔''

''سنا ہے فرغانہ کا سلطان ظہیر الدین بابر بھی اسی نہج پر سوچ رہا ہے۔'' ایک اور وزیر میر صحبت مرزا نے صاف اور واضح انداز میں اطلاع بہم پہنچائی۔ ''اس کا بھی یہی خیال ہے کہ سمرقند کہ جس کا نام ناقابل انقطاع طور پر امیر تیمور کی شوکت وعظمت سے موسوم تھا۔ سو وہ اپنے عظیم مورث کے تخت پر بیٹھنے کا خواب دیکھ رہا ہے۔''

''ہمیں اس چودہ سالہ نوجوان سلطان پر حیرت بھری مسرت ہوئی۔'' موسم کی خوشگواری کا اثر یقیناً سلطان کے مزاج پر بھی پڑا تھا ورنہ اس بات پر وہ غصے سے آگ بگولہ بھی ہو سکتا تھا۔ مگر دربار کے ادھ کھلے دریچوں سے آنے والی ہوا کے بھیگے بھیگے جھونکوں نے اس کے دماغ کو ٹھنڈا کر دیا تھا۔ مسکرا کر بولا۔ ''بابر جب سمرقند پر حملہ آور ہوگا، سو ہوگا...... پر ہم نے فیصلہ کر لیا ہے کہ ہم فوری طور پر اپنی اس موروثی سلطنت کو اپنے تسلط میں کرنے کے لئے روانہ ہو رہے ہیں۔'' پھر اس نے اپنے فوجی سرداروں کی طرف دیکھتے ہوئے مضبوط لہجے میں کہا۔ ''میرے بہادر اور شیر دل سپہ سالارو، اپنے ہاتھ تلواروں کے دستوں پر رکھ لو اور زرہ بکتر پہن کر گھوڑوں کی پشت پر سوار ہو جاؤ۔ ہم جلد ہی سمرقند کی طرف کوچ کرنے والے ہیں۔''

بیقرہ نے اپنے لشکر کو تین حصوں میں تقسیم کیا۔ ایک حصے کا سپہ سالار اس کا بڑا بیٹا بدیع الزماں بیقرہ، دوسرے لشکر کا سپہ سالار چھوٹا بیٹا مظفر حسین بیقرہ اور تیسرے حصے کی کمان اس نے اپنے ہاتھ میں رکھی تھی۔

وہ اپنا لشکر جرار لے کر حصار کی طرف بڑھا اور سلطان مسعود مرزا کے موسم سرما کے مستقر ترمز میں داخل ہوگیا۔ ابھی اس کی فوجیں دریا کے اس پار ہی تھیں کہ سلطان باستغر مرزا کے بڑے بھائی سلطان مسعود مرزا نے اسے دیکھ لیا۔ چنانچہ وہ اپنی سپاہ کے ساتھ نکلا اور دریا کے اس پار خیمہ زن ہوگیا۔

موسم سرما آہستگی سے آگے بڑھ رہا تھا مگر دونوں اطراف کی فوجیں اپنی اپنی جگہ جمی ایک دوسرے کو گھورنے میں مصروف تھیں۔ نہ اُدھر سے حملہ ہوا، نہ اِدھر سے پیش رفت ہوئی، اور اس کشمکش اور ادھیڑ بن میں موسم سرما اختتام پذیر ہوگیا۔

سلطان حسین بیقرہ ایک تجربہ کار سپہ سالار اور ایک زیرک جرنیل تھا۔ وہ اس صورت حال کا گہری نظروں سے جائزہ لے رہا تھا۔ وہ اختتامی جاڑوں کی ایک نسبتاً سرد اور تاریک رات تھی۔ ترمذ کا نیلا آسمان سیاہ بادلوں سے ڈھکا ہوا تھا۔ بادلوں کی سیاہی کی وجہ سے شب دیجور کی ظلمت میں کچھ اور اضافہ ہوگیا تھا۔ سرد ہواؤں کے جھکڑ دریا کی لہروں میں تیزی اور روانی کا باعث بن رہے تھے۔ اطراف واکناف میں ایستادہ تناور پیڑوں سے ہوا کے تیز جھکڑ گزرتے تو عجب بھیانک سا شور بلند ہوتا۔

ایسے میں چھ سو سپاہیوں پر مشتمل ایک دستہ اپنے سردار عبداللطیف بخشی کے تحت دریا کے دوسری طرف واقع حکم کلف کے علاقے سے بالا ہی بالا سفر کرتا دریا عبور کر کے اس کنارے اترا اور اپنی حیثیت مستحکم کر لی۔ مدمقابل فوج اور اس کے سپہ سالار سلطان مسعود مرزا کو اس پیش رفت کی کانوں کان خبر نہ ہوئی۔

یہ خبر سب سے پہلے خان چغانیانی تک پہنچی۔ خان چغانیانی، مسعود مرزا کی فوج کا ایک سردار تھا جو وزیر اعظم خسرو خان کے بھائی ولی کا بے حد مخالف تھا۔ ولی بھی اس وقت فوج میں موجود ایک دستے کا سپہ سالار تھا۔ جونہی یہ خبر چغانیانی تک پہنچی، وہ بے محابہ دوڑتا ہوا سلطان مسعود مرزا کے شاہی خیمے کی طرف گیا اور خیمے کے دروازے پر ایستادہ تلوار بردار دربانوں کو تیزی سے راستے سے ہٹاتا دیوانہ وار خیمے میں داخل ہوا۔

سلطان مسعود مرزا اس وقت اپنے ریشمی اور نرم وگداز بستر میں دراز، آنکھیں بند کئے خواب خرگوش کے مزے لے رہا تھا۔ رات بہت دیر تک وہ جاگتا رہا تھا۔ ملک ورعیت، جنگ وجدال کے مسائل اپنی جگہ تھے، مگر آج کل وہ ایک اور ہی مسئلے کا شکار تھا۔

چند روز قبل وہ سمرقند کے بازار سے گزر رہا تھا کہ بے ساختہ اس کی نگاہ راستے کی دوسری جانب واقع ایک مکان کی طرف اٹھ گئی تھی۔ اس وقت دریچے میں ایک سنہری زلفوں اور سبزی مائل نیلگوں آنکھوں والی سمرقندی حسینہ کھڑی شاہی قافلے کو گزرتے دیکھ رہی تھی۔

جب اس نے دریچے کی طرف دیکھا تو اس پل وہ لڑکی بھی اس کی جانب دیکھ رہی تھی۔ لحظہ بھر کو دونوں کی نگاہیں باہم متصادم ہوئیں اور نظروں کے اس لمحاتی تصادم نے مسعود مرزا کی حالت غیر کر دی۔ وہ دل وجان سے اس سمرقندی دوشیزہ پر فریفتہ ہوگیا۔ اسی وقت اس نے اپنے ایک خادم کو اس لڑکی کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کے لئے روانہ کر دیا۔

کچھ دیر بعد خادم نے آ کر اسے معلومات بہم پہنچائی تھیں۔ اس لڑکی کا نام خجستہ خانم تھا اور وہ شہر کے ایک بڑے تاجر کی بیٹی تھی۔ وہ بچپن سے ہی اپنے چچازاد اخلاص الدین سے منسوب تھی اور عنقریب ان دونوں کی شادی ہونے والی تھی۔

یہ خبر سلطان مسعود مرزا کے دل پر بجلی بن کر گری تھی۔ جو لڑکی پہلی ہی نگاہ میں نگاہوں کی راہ سے اس کے دل میں اتر گئی تھی، وہ عنقریب کسی اور کی دلہن بننے والی تھی۔ وہ یہ بات برداشت کرنا تو درکنار، سننے کے لئے بھی تیار نہ تھا۔

جب سے اس نے خجستہ خانم کو دیکھا تھا، اس کے دن کا چین اور رات کی نیند حرام ہو کر رہ گئی تھی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ اپنی محبوبہ کو کیونکر حاصل کرے۔ خجستہ خانم کا باپ ولید سمرقندی ایک باثروت اور اثر ورسوخ والا تاجر تھا، اس لئے سلطان زور زبردستی سے بھی کام نہیں لے سکتا تھا۔

''سلطان معظم جب سے کوچۂ تاجراں سے گزر کر آئے ہیں، بہت بے کل ومضطرب دکھائی دیتے ہیں۔'' وزیر مملکت شیخ عبداللہ براس کا بیٹا قاسم براس معنی خیز لہجے اور شوخ مسکراہٹ کے ساتھ بولا۔

سلطان ایک سرد آہ بھر کر رہ گیا۔ ''قاسم میرے دوست، تمہیں میں کیا بتاؤں، میرے دل کا کیا عالم ہے۔''

عبداللہ براس کے دونوں بیٹے قاسم براس اور محمود براس سلطان کے بہت منہ چڑھے تھے، باہم ایسی شیر وشکر والی دوستی تھی کہ دوسرے سرداروں خصوصاً ترخانی اور سمرقندی امراء، ان دونوں سے بے حد جلتے تھے۔

''کچھ تو فرمائیے۔ درد کا پتا چلے تو دوا کی کوشش کی جائے۔'' قاسم براس ایک بار پھر معنی خیز انداز میں مسکرایا۔ ''اگر آپ اس حسینہ کا قصہ ہم سے چھپانا چاہتے ہیں تو کوئی شکوہ نہیں، مگر یہ سمجھ لیجئے اس کے حصول کا راستہ یہ ناچیز ہی بتائے گا۔''

''قاسم، اب تک میں نے اس سلسلے میں کسی سے کوئی بات نہیں کی، تمہیں کیونکر پتا چلی یہ بات؟'' سلطان مسعود مرزا قدرے حیران اور سراسیمہ ہو کر بولا۔

''آپ تو جانتے ہیں ہم آپ کے غلام ہیں اور عاشق ہیں اور عاشقین اپنے محبوب کی نگاہوں کو خوب سمجھتے ہیں، جس پل آپ کی نگاہ اس دریچے پر ٹھہری اور اپنا قرار اس حسینہ کی سنہری زلفوں میں الجھا کر مضطرب پلٹی تھی، اسی پل اندازہ ہوگیا تھا کہ آپ کا دل اس خجستہ سمرقندی کی آنکھوں کی نیلی جھیل میں کہیں ڈوب کر رہ گیا ہے۔''

''اوہ براس۔'' سلطان بے تابی سے بولا۔ ''اگر تم سب کچھ جانتے ہو تو وصل کی کوئی راہ نکالو، ملاقات کی کوئی سبیل بتاؤ...... اس سے ملے بنا، اسے دیکھے بنا ہمیں ایک پل قرار نہیں...... اوپر سے یہ خبر ہے کہ عنقریب اس کی شادی ہونے کو ہے۔ دیکھو میرا رقیب اسی شہر میں کیونکر سانس لے رہا ہے۔ اس کے ہونے کا تصور میری سانسوں کو روکنے لگتا ہے۔''

اور اسی رات قاسم براس نے اپنے خاص غلام کو بھجوا کر خجستہ سمرقندی کے منگیتر اخلاص الدین کو قتل کروا دیا تھا۔

جلد ہی خجستہ کو اس قتل کی وجہ معلوم ہوگئی تھی کہ سلطان مسعود کی وجہ سے اس کا بچپن کا منگیتر اور چچازاد موت کے منہ میں چلا گیا تھا۔ وہ اس قدر برافروختہ ہوئی کہ اس نے قسم کھائی کہ وہ مر جائے گی مگر کبھی سلطان کی طرف نگاہ التفات نہ ڈالے گی۔

سلطان مسعود مرزا کو اس بات کا تو اطمینان تھا کہ اس کا رقیب اب دنیا میں موجود نہیں مگر خجستہ کی بے رخی اور بے اعتنائی کا اسے بے حد قلق تھا۔ جوں جوں وہ اس سے نفرت اور دوری اختیار کرتی تھی، اس کا دل اسی کی جانب مائل اور فریفتہ ہوتا جاتا تھا۔

اس وقت وہ لشکر کی ہمراہی میں میدان جنگ میں تھا۔ دریا کے اس پار دشمن کی کثیر فوج تاک لگائے بیٹھی تھی، مگر اب بھی ہر دم اس کے دل ودماغ پر خجستہ بیگم کے خیالات چھائے رہتے تھے۔ ہر سوچ اسی پر ختم ہوتی تھی تو ہر تصور اسی کی تصویر سے سجا ہوتا تھا۔ اس کے خوابوں میں اسی کا پیکر بستا تھا تو اس کے تخیل کی پرواز اس سنگی دریچے پر جا کر ختم ہو جاتی تھی۔ قاسم براس اور خان چغانیانی جیسے لوگ اس کے ہمراز اور مددگار تھے۔

''سرکار! آپ حکم کریں تو گھنٹے بھر میں اس نخوت زدہ حسینہ کو آپ کے قدموں میں لا ڈالوں۔ ایک منٹ میں اس کا سارا غرور وتکبر مٹی میں مل جائے گا۔'' قاسم براس نے قدرے غصیلے لہجے میں کہا۔

سلطان مسعود مرزا تڑپ کر بولا۔ ''خبردار جو اس کی شان میں کوئی گستاخی کی، وہ سمرقند کی نہیں سلطان مسعود مرزا کے دل کی ملکہ ہے۔ ہم اسے زور زبردستی سے نہیں، محبت اور چاہت سے حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ ہم چاہتے ہیں کہ وہ اپنی تمام تر محبتوں اور وفاؤں کے ساتھ خود کو ہمارے سپرد کرے۔''

ابھی وہ اپنی محبوبہ کے دل میں جگہ بنانے کی کوشش کی ابتداء بھی نہیں کر پایا تھا کہ خان چغانیانی دیوانہ وار اس کے خیمے میں داخل ہوا۔ رات دیر تک وہ خجستہ کے بارے میں ہی سوچتا رہا تھا۔ بڑی مشکل سے نیند آئی تھی۔

''سلطان معظم۔'' خان چغانیانی نے بوکھلائے ہوئے انداز میں اسے شانوں سے پکڑ کر ہلایا۔ ''سلطان جلد اٹھیے، غضب ہوگیا، قیامت آ گئی۔''

''کیا ہوا ہے چغانیانی؟'' مسعود مرزا نے حیرت اور ناگوار بھرے انداز میں آنکھیں کھول کر اپنے سردار کی طرف دیکھا۔

''سلطان عالی قدر! ذرا اٹھ کر دیکھئے۔ بدقماش سلطان حسین بیقرہ نے اپنی فوج کا ایک دستہ دریا کے اس پار لا اتارا ہے۔'' خان چغانیانی نے خوف زدہ لہجے میں اطلاع دی۔

''کیا؟'' سلطان کی نیند ایک دم اُڑن چھو ہوگئی۔ وہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔ ''وہ بھلا کس طرح دریا پار کر کے اس جانب آ گئے۔ ہمارے سپاہیوں نے انہیں روکا کیوں نہیں؟''

''کسی کو کانوں کان خبر ہوتی تو کوئی روکنے کی کوشش کرتا۔'' خان چغانیانی سر جھکا کر افسردہ لہجے میں بولا۔ ''انسان نہیں، جنات معلوم ہوتے ہیں، کیسے ہم سب کی آنکھوں میں دھول جھونک کر اس طرف آ نکلے، اب کوئی لمحہ نہیں جاتا کہ ہماری سپاہ پر حملہ کریں گے۔ ان کا سب سے پہلا نشانہ آپ کا ہی خیمہ ہوگا۔''

''کیا بکتے ہو؟'' سلطان خود کو سنبھالتے ہوئے غصے سے بولا۔ ''جاؤ دوسرے سرداروں کو بلاؤ تاکہ مل بیٹھ کر اس مصیبت کا حل تلاش کیا جائے۔''

''سلطان، میرا مشورہ ہے کہ آپ اس جنگ وجدال کی آگ میں کودنے کی بجائے راہِ فرار اختیار کیجئے۔ ذرا سوچئے آپ کو کچھ ہوگیا تو وہ نیلی آنکھوں اور سنہری زلفوں والی دوشیزہ کس کے سہارے زندگی گزارے گی؟''

اس ذکر کے ساتھ ہی اس کا دل نواز چہرہ اس کی آنکھوں میں گھوم گیا تھا۔ لحہ بھر کو اس کا جی چاہا کہ قاسم کی بات پر عمل کرے اور اس لڑائی اور قتل وغارت گری کے میدان کو چھوڑ کر اس محبت کی وادی، اس شہر عاشقاں، اس پھولوں سے سجے دیدہ زیب دریچے میں جا چھپے۔

کچھ ہی دیر میں دوسرے سردار بھی آ پہنچے تھے۔

''میرا خیال ہے کہ اس دستے پر جو دریا کے پار اترا ہے، ہمیں فوراً حملہ کرنا چاہئے۔'' خسرو شاہ کے بھائی ولی شاہ نے مضبوط لہجے میں مشورہ دیا۔ ''ابھی ان کی ساری فوج دوسری طرف ہے، ان کے اس پار آنے میں وقت لگے گا، ان کی آمد سے قبل ہمیں اس دستے کو نیست ونابود کر دینا چاہئے۔''

''واہ کیا مشورہ دے رہے ہو؟'' خان چغانیانی نے ولی شاہ کی طرف ہاتھ اٹھا کر تمسخر اڑانے والے انداز میں کہا۔ ''ذرا جا کر دیکھو بیقرہ کا لشکر دھڑا دھڑ دریا عبور کر رہا ہے۔ ہم جوں ہی حملہ آور ہوں گے، وہ ہمیں گاجر مولی کی طرح کاٹ کر رکھ دیں گے۔''

خان چغانیانی کی باتیں، سلطان کے عشق کے مارے دل پر عجب انداز سے اثر انداز ہو رہی تھیں۔ اسے اپنے رگ وپے میں ایک خوف سا سرایت کرتا محسوس ہو رہا تھا۔ وہ خجستہ سمرقندی کو حاصل کئے بنا مرنا نہیں چاہتا تھا۔ سو اس نے راہِ فرار اختیار کرنے کا فیصلہ کیا۔

''آپ بھلا یہ بات سوچ بھی کس طرح سکتے ہیں؟'' ولی شاہ اس کے فیصلے کو سن کر حیرت اور رنج کے ملے جلے احساس کے ساتھ بولا۔ ''دشمن کا لشکر سر پر کھڑا ہے اور آپ سالار اعظم، اپنے لشکر کو دشمن کے رحم وکرم پر چھوڑ کر راہ فرار اختیار کرنا چاہ رہے ہیں؟ سلطان، ایسا مت کیجئے۔ اس سے لشکر اور اس شہر حصار کو ناقابل تلافی نقصان پہنچ سکتا ہے۔''

مگر سلطان مسعود کچھ سننے کو تیار نہ تھا۔ وہ اپنے چند وفادار خدام کے ساتھ اسی وقت گھوڑے پر سوار ہوا اور اپنے بھائی باستغر مرزا کے پاس سمرقند کے لئے روانہ ہوگیا۔ سمرقند اس کے خوابوں کی سرزمین، اس کی محبوبہ خجستہ خانم کا مسکن تھا۔

ولی شاہ حیرت سے منہ کھولے بھاگتے ہوئے سلطان اور اپنے لشکر کی جانب بڑھتے ہوئے دشمن کے لشکر کو دیکھ رہا تھا۔ (جاری ہے)

allurdupdfnovels.blogspot.com www.freepdfpost.blogspot.com

ظہیر الدین بابر

اشتیاق فاطمہ عظمیٰ

قسط : 7

سلطان حسین بیقرہ نے دریا عبور کیا۔ اس نے اپنے بڑے بیٹے بدیع الزماں کو اس کے رسالے کے ساتھ فی الفور خسرو شاہ کی طرف روانہ کیا۔ خسرو شاہ قندز کے مقام پر ابھی تک مقابلے پر ڈٹا ہوا تھا اور دوسرا رسالہ اس کے چھوٹے بیٹے مظفر بیقرہ کی کمان میں ختلان کی طرف روانہ ہوا اور بقیہ لشکر لے کر وہ خود حصار کی جانب بڑھا۔

سلطان مسعود مرزا کی راہ فرار اختیار کرنے کی خبر اس تک پہنچ چکی تھی۔ اس کے لبوں پر بکھری فاتحانہ مسکراہٹ کچھ اور گہری ہو گئی تھی۔ اس نے فوراً اپنے ایک سردار ابوالحسن کو ایک دستے کے ساتھ سلطان مسعود مرزا کے تعاقب میں روانہ کر دیا۔

ولی شاہ نے پھٹی پھٹی آنکھوں سے یہ سب دیکھا تو وہ اگلے ہی لمحے اپنے گھوڑے پر سوار ہوا اور ختلان کی طرف نکل گیا۔

سلطان حسین بیقرہ مسعود مرزا کی فوج کو پسپا کرتا آگے بڑھا۔ آخر کار مسعود مرزا کی فوج قلعہ بند ہونے پر مجبور ہو گئی اور سلطان حسین بیقرہ نے فوراً ہی حصار کے قلعے کا محاصرہ کر لیا۔

ایسا لگتا تھا جیسے پورا علاقہ سلطان حسین بیقرہ کے قبضے میں چلا جائے گا۔ ایسے میں ان ازبک پیشہ ور سپاہیوں میں جو سمرقندی حکمرانوں کی ملازمت میں تھے، بے چینی اور بے اطمینانی پھیلنے لگی تھی۔ اس شام مہدی خان چماق اور محمد دغلت، حمزہ خان کے مکان میں ملے۔ وہ سب اس صورت حال سے پریشان تھے۔

’’میری سمجھ میں نہیں آ رہا، مجھے کیا کرنا چاہئے؟‘‘ محمد دغلت نے پریشان لہجے میں اظہار خیال کیا۔ ’’ایک دل کہتا ہے کہ سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر سلطان ظہیر الدین بابر کے دربار میں جا کر اس کی ملازمت اختیار کر لوں۔‘‘

’’محمد دغلت۔‘‘ حمزہ خان نے پُرسوچ نظروں سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ’’اگر سلطان بابر ہمیں ملازمت دینے پر آمادہ ہو جائے تو اس وقت اس سے اچھی کوئی اور بات ہو ہی نہیں سکتی۔‘‘

’’اگر تم سب کی یہی رائے ہے تو......‘‘ محمد دغلت نے اپنے سارے ساتھیوں کے چہروں پر طائرانہ نگاہ ڈالتے ہوئے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔ ’’میں کل ہی اپنے ایک قاصد کو سلطان بابر کے دربار میں بھیج کر ہم سب کے حاضر ہونے کی اجازت حاصل کرتا ہوں۔‘‘

’’دیکھو اس کام میں اب بالکل دیر نہیں ہونی چاہئے۔‘‘ مہدی خان نے تنبیہہ کرتے ہوئے کہا۔ ’’جس قدر جلد ہو ہمیں بابر کے دربار میں پہنچ جانا چاہئے۔‘‘

’’سلطان بابر کی طرف سے اجازت ملتے ہی ہم یہاں سے کوچ کر جائیں گے، تیاری مکمل رکھی جائے۔‘‘

اور پھر اجازت ملتے ہی وہ سب اندجان کی طرف روانہ ہو گئے تھے۔

اندجان کا موسم بے حد خوشگوار تھا۔ بابر کے دربار میں سادگی کے ساتھ وقار اور رکھ رکھاؤ کا سماں تھا۔ نوجوان سلطان ظہیر الدین بابر اپنے آبا...... سلاطین تیموریہ کے دستور کے مطابق مخملی توشک پر بیٹھا تھا۔

حمزہ خان، مہدی خان چماق اور دیگر سرداروں کی آمد پر توشک سے ان کی تعظیم کی خاطر اٹھ کھڑا ہوا۔ چند قدم آگے بڑھ کر وہ ان سے بغل گیر ہوا اور ان قابل احترام سرداروں کو اپنے سیدھے ہاتھ کی جانب زرنگار تکیوں کے سہارے بٹھایا۔

وہ تمام سردار اپنے دستوں سمیت بابر کی ملازمت میں آ گئے۔ بابر ان مشاق اور لائق سرداروں کی آمد پر بے حد خوش تھا۔ اسے اپنے خواب کی تعبیر پوری ہوتی محسوس ہو رہی تھی۔ سمرقند پر اس کے حملے کے وقت یہ سردار اس کے لئے بے حد سود مند ثابت ہو سکتے تھے۔

☆......☆......☆

شہر حصار کی رعیت کی طرح، حصار کے آسمان کا رنگ بھی اُڑا اُڑا سا تھا۔ عجب پھیکے رنگوں کی خاکستری اور مٹیالی بدلیاں ایک دوسرے کے پیچھے چہرہ چھپانے کی کوشش میں سرگرداں دکھائی دے رہی تھیں۔ ہوائیں بھی سہمی ہوئی سی دبے پاؤں چل رہی تھیں۔

سلطان حسین بیقرہ نے شہر حصار کا محاصرہ کر رکھا تھا۔ مگر اہل حصار اور قلعے کے اندر موجود فوج کا حوصلہ بہت بلند تھا۔ ہر فرد کا یہی فیصلہ تھا، جان دے دیں گے مگر قلعہ نہیں چھوڑیں گے۔

اُدھر سلطان حسین بیقرہ کا عزم بھی جوان تھا۔ اس نے نا صرف شہر کا محاصرہ کر رکھا تھا بلکہ وہ رات دن قلعہ فتح کرنے کی حکمت عملی تیار کرنے میں مصروف تھا۔ اس کی توپیں رات دن قلعے کی فصیلوں پر گولے داغے جاتی تھیں۔

اس شام شمال کی جانب سے جہاں خود بیقرہ خیمہ زن تھا، توپ کے گولے کچھ اس طرح برسائے گئے کہ ایک برج ٹوٹ گیا۔ اس سے بیقرہ کے سپاہیوں کو فتح کی امید بندھی، ایک سردار موجو خان سلطان حسین بیقرہ کی خدمت میں حاضر ہوا اور باقاعدہ لڑائی کی اجازت طلب کی۔

حسین بیقرہ نے سر کو ہلکا سا خم دے کر سردار موجو خان کی طرف دیکھا۔ ’’یہ کون سا وقت ہے لڑائی کا۔‘‘ اس کی آواز میں ناگواری کا عنصر خاصا نمایاں تھا۔ ’’عشاء کے بعد رات کے اس پہر گھور تاریکی میں جنگ کیا معنی؟‘‘

’’مگر سلطان؟‘‘ سردار کا ولولہ اُبلا پڑ رہا تھا۔ ’’ہمارے لوگوں نے قلعے والوں کو پریشان کر دیا ہے۔ اگر اس وقت ہم دھاوا بول دیں تو......‘‘

’’نہیں۔‘‘ سلطان حسین بیقرہ نے دو ٹوک لہجے میں جواب دیا۔ ’’دھاوا بولنے کا وقت ابھی نہیں آیا۔ ابھی صرف توپوں کا رخ قلعے کی طرف رکھو اور نقب لگانے کا انتظام کرو۔‘‘

اگلے دن سے گولوں کی بارش کے ساتھ نقب لگانے کا کام بھی جاری ہو گیا۔ چار پانچ جگہ سے نقب لگائی گئی۔

شہر کے دروازے کے ساتھ لگائی گئی نقب بہت آگے بڑھ گئی تھی۔ شہر والوں کو جوں ہی پتا چلا، انہوں نے اوپر کی طرف سے محاصرین کی جانب دھواں چھوڑنا شروع کیا مگر محاصرین نے فوراً نقب کا منہ بند کر دیا۔ جس سے یہ دھواں پلٹ کر قلعے والوں کی طرف پھیل گیا۔

دھوئیں کی شدت اس قدر تھی کہ شہریوں کے دم گھٹنے لگے۔ سب گھبرا کر گھروں سے باہر نکل آئے۔ پانی کی مشکیں اور تھیلیاں لا لا کر نقب پر ڈالیں۔ اس طرح دھوئیں میں کچھ کمی آئی اور لوگوں کی جان میں جان آئی۔

ٹوٹا ہوا برج راتوں رات قلعے کے سپاہیوں نے مرمت کر کے درست کر لیا تھا۔

سلطان حسین بیقرہ کی سپاہ جنگ کرنے کو بے قرار تھی، مگر بیقرہ محض دھمکانے، توپوں سے گولے برسانے اور نقب لگانے پر ہی اکتفا کئے بیٹھا تھا۔

اسی طرح تین مہینے بیت گئے۔ اُدھر حسین بیقرہ کا بڑا بیٹا بدیع الزماں جو رسالہ لے کے خسرو شاہ پر حملہ کرنے کے لئے گیا تھا، قندز سے چار فرسنگ کے فاصلے پر پڑاؤ انداز ہوا۔ خسرو شاہ اپنی سپاہ کو درست کر کے قندز سے باہر نکلا اور رات گزرنے کے بعد بدیع الزماں کے لشکر پر حملہ آور ہوا۔ بدیع الزماں کے فوج کے سردار اور امیر خندقوں میں چلے گئے۔ بدیع الزماں کی سپاہ کی تعداد خسرو شاہ سے دگنی تھی۔ ہتھیار اور اونٹ گھوڑوں کی تعداد بھی زیادہ تھی۔

خسرو کے پاس بہ مشکل پانچ ہزار آدمی تھے۔ مگر خسرو شاہ نے اس طاقت اور ولولے سے حملہ کیا کہ بدیع الزماں کے سردار خندقوں سے نکلنے کی ہمت نہ کر سکے۔ خسرو شاہ اور اس کے ساتھیوں نے بدیع الزماں کے سپاہیوں کا قتل عام کیا اور خوب مال غنیمت جمع کیا۔

خسرو شاہ کے سپاہ کے خیموں میں جاتے ہی بدیع الزماں نے پڑاؤ اٹھایا اور اپنے مقتول سپاہیوں کے لاشے چھوڑ، طالقان کی طرف بھاگ کھڑا ہوا۔

خسرو شاہ نے بدیع الزماں کے سپاہیوں کو دفنایا اور اپنے سرداروں کے ساتھ آئندہ کی حکمت عملی پر غور کرنے میں مصروف ہو گیا۔

’’پتا چلا ہے کہ بدیع الزماں طالقان کے مقام پر الغو باغ میں ٹھہر گیا ہے۔‘‘ ایک سردار نے اطلاع بہم پہنچائی۔

’’تو کیا خیال ہے۔ کیوں نہ ہم اس بزدل کا پیچھا کریں اور الغو باغ کو اس کا اور اس کے ساتھیوں کا قبرستان بنا دیں۔‘‘ خسرو شاہ کا بھائی ولی شاہ پُرعزم آواز میں گویا ہوا۔

’’تمہاری بات قابل توجہ ہے۔‘‘ خسرو شاہ نے پُرسوچ نظروں سے اپنے بھائی ولی کی طرف دیکھا۔ پھر کئی لمحوں تک سوچتے رہنے کے بعد اس نے اپنا فیصلہ سنایا۔ ’’یہی مناسب ہے، ہمیں اپنی فوج کو قلول اور اس کی نواحی پہاڑوں کی طرف روانہ کر دینا چاہئے تاکہ وہ دشمن پر چھپ کر حملہ کریں اور ان کا وہاں جینا حرام کر دیں۔‘‘

اور اگلے ہی دن اس نے اپنے بھائی ولی شاہ کی سپہ سالاری میں علی دربان قلی بیگ، قاسم بیگ، سید بم علی، بہلول اور ایوب جیسے جید سرداروں اور عمدہ ہتھیاروں اور بہترین سامان حرب کے ساتھ فوج کو روانہ کر دیا۔

دریائے ختلان کے مقام پر دشمن سے مقابلہ ہوا اور اس کو شکست دی۔ پھر یہ لوگ پہاڑوں میں چلے گئے اور خراسانی لشکر کی واپسی تک اسے تنگ کرتے رہے۔

سلطان حسین بیقرہ کو جب اپنے بیٹوں کی شکست کی خبر پہنچی تو اس نے حصار سے محاصرہ اٹھانے کا فیصلہ کر لیا۔ حصار کی شدید بارشوں نے ویسے ہی اس کا اور اس کی سپاہ کا ناطقہ بند کر دیا تھا۔ چنانچہ اس نے قلعہ والوں کو مصالحت کی دعوت دی۔

اندر سے محمود برلاس باہر آیا۔ ادھر سے حاجی پیر بکاول بڑھا۔ بات ہوئی اور مشاورت کے بعد یہ طے پایا کہ محمود مرزا کی کسی لڑکی کو اگر بیقرہ کے عقد میں دے دیا جائے تو محاصرہ اٹھا لیا جائے گا۔ سو خانزادہ بیگم کی بیٹی نشاط گوہر بیگم کی شادی بیقرہ سے کر دی گئی اور اس نے محاصرہ اٹھا کر قندز کی طرف کوچ کیا۔

دوبارہ بلخ میں پہنچ کر سلطان حسین بیقرہ نے اپنی سلطنت اپنے دونوں بیٹوں میں تقسیم کر دی۔ بدیع الزماں کو بلخ اور مظفر حسین کو استر آباد عطا ہوا۔

☆......☆......☆

ظہیر الدین بابر کو حسین بیقرہ کے واپس چلے جانے کی خبر ملی تو اسے بہت اطمینان اور انبساط کا احساس ہوا تھا۔ اگر سلطان حسین بیقرہ نے سمرقند پر قبضہ کر لیا ہوتا تو بابر کے لئے شہر تیمور پر حملہ کرنے اور کامیابی کے امکانات بہت کم رہ جاتے۔ وہ خاموشی اور گہری نگاہوں سے سمرقند کے حالات کا جائزہ لے رہا تھا۔

اس موقع پر ایک ایسا واقعہ پیش آیا کہ جس نے بابر کے دل کو نئی امیدوں سے لبریز کر دیا۔

ہوا یہ کہ رمضان کے شروع ہوتے ہی سمرقند کے ترخانیوں اور سمرقندی امراء نے سلطان باسنغر مرزا کے خلاف ایک خوفناک سازش کا منصوبہ بنایا۔ باسنغر مرزا حصار کے امراء اور سرداروں سے زیادہ شفقت و محبت کا برتاؤ کرتا تھا۔ قاسم برلاس کے بیٹوں سے اس قدر بے تکلفی اور ذہنی ہم آہنگی تھی کہ ترخانی اور سمرقندی امراء ان سے جلنے لگے تھے۔

ان کا خیال تھا کہ سلطان اہل حصار کو زیادہ فوقیت اور عزت دیتا ہے، چنانچہ درویش محمد ترخان، بخارا سے آیا تو دیگر سرداروں نے اس کے سامنے یہ صورت حال رکھی۔

’’ہوں۔‘‘ بوڑھے ترخان نے تائید بھرے انداز میں سر ہلایا۔ ’’یہ بات مجھے بہت پہلے محسوس ہو گئی تھی۔ سلطان کی تمام تر مہربانیاں حصار کے سرداروں پر ہیں، خاص طور پر برلاس کے بیٹے تو یوں سر چڑھے اور منہ چڑھے ہیں جیسے کہ ان پر سلطان و رعیت کی بجائے عاشق معشوق کا گمان ہوتا ہے۔‘‘

’’وہی تو......‘‘ ایک ادھیڑ عمر کا سمرقندی، ابراہیم قند، تائید بھرے انداز میں زور سے سر ہلاتا ہوا بولا۔ ’’اب ہماری برداشت جواب دے گئی ہے۔ اس مشکل کا کوئی حل تلاش کرنا ہو گا۔‘‘

سب سر جوڑ کر بیٹھے اور یہ طے پایا کہ سلطان باسنغر مرزا کو تخت سے اتار کر اس کے چھوٹے بھائی علی مرزا کو بٹھا دیا جائے۔

اگلی صبح سورج کی پہلی کرن کے ساتھ درویش محمد ترخان، قرشی کی طرف روانہ ہو گیا۔ اس کے ساتھ چند لوگ اور بھی تھے۔ قرشی سے وہ علی مرزا کو ساتھ لے کر پایہ تخت پہنچے۔ ان دنوں باسنغر مرزا باغ نو میں تھا۔ چنانچہ علی مرزا کو تخت نشین کروا کر درویش محمد ترخان باغ نو کے لئے روانہ ہو گیا۔ اس وقت باسنغر مرزا اپنے غلام، حسن شربتی اور قلی قوچین کے ساتھ مکان سے باہر چہل قدمی کر رہا تھا۔ دفعتاً گھوڑوں کی ٹاپوں کی آواز گونجی تو اس نے چونک کر قلی قوچین کی طرف دیکھا۔

’’یہ کیسی آوازیں ہیں؟‘‘

’’شاید کچھ گھڑ سوار جا رہے ہیں۔‘‘ قلی قوچین نے آوازوں کی طرف کان لگاتے ہوئے بتایا۔ ’’آپ حکم کریں تو باہر نکل کر دیکھوں؟‘‘

’’ہاں ذرا جا کر دیکھو۔ کون لوگ ہیں، اور انہیں کیا کام ہے؟‘‘

قلی قوچین جوں ہی باغ سے باہر آیا۔ درویش محمد ترخان کے اشارے پر اس کے آدمیوں نے اسے دبوچ لیا۔ جب کافی دیر بیت گئی تو باسنغر مرزا نے حسن شربتی کو بھیجا اور خود بھی اس کے پیچھے پیچھے چل دیا۔

وہ دونوں ذرا ہی آگے گئے ہوں گے کہ ترخان کے آدمیوں نے ان دونوں کے ہاتھ پیر باندھ کر منہ میں کپڑا ٹھونسا، اپنے گھوڑوں پر لادا اور ارک کی طرف روانہ ہو گئے۔ جہاں علی مرزا پہلے سے موجود تھا۔

ارک پہنچ کر فیصلہ کیا گیا کہ ظہر کے بعد باسنغر مرزا کو کوک سرائے پہنچا دیا جائے۔

’’کوک سرائے؟‘‘ باسنغر مرزا کے چہرے پر ہوائیاں اُڑنے لگیں۔

’’کوک سرائے کا نام سنتے ہی آپ اس قدر ہراساں کیوں ہو گئے؟‘‘ غلام حسن شربتی نے حیران لہجے میں سوال کیا۔

’’کیا تم نہیں جانتے؟‘‘ قلی قوچین نے مضطرب لہجے میں کہا۔ ’’یہ کوک سرائے کیا ہے؟‘‘

’’اتنا تو جانتا ہوں، امیر تیمور نے جو بڑی عمارتیں بنائی تھیں، ان میں سے ایک کوک سرائے بھی ہے، اس سے آگے اور کچھ نہیں جانتا۔‘‘

’’اس عمارت کی عجیب خاصیت ہے۔‘‘ قلی قوچین خود کلامی کے سے لہجے میں بولا۔ ’’یہاں خانوادہ تیمور کے شہزادے کبھی نہیں جاتے، سوائے ان اوقات کے جب انہیں اندھا کیا جاتا ہے یا تانت سے پھانسی دی جاتی ہے یا ان کی تاج پوشی کی جاتی ہے۔‘‘

’’اوہ۔‘‘ حسن شربتی نے متوحش نظروں سے تیموری سلطان باسنغر مرزا کی طرف دیکھا۔ ’’اس کا مطلب ہے کہ......‘‘

’’ہاں۔‘‘ سلطان نے وحشت زدہ لہجے میں کہا۔ ’’وہ مجھے قتل کرنا چاہتے ہیں۔‘‘

’’تو کیا آپ کی جگہ وہ علی مرزا کو حکمراں بنانا چاہتے ہیں؟‘‘ حسن شربتی کے سوال پر قلی قوچین نے رنجور سے انداز میں نفی میں سر ہلایا۔ ’’یہ ترخان اور سمرقندی علی مرزا کو بھی نہ چھوڑیں گے۔‘‘

’’تو اب ہمیں کیا کرنا چاہئے؟‘‘ حسن شربتی پریشانی سے بولا۔

’’میں نے سوچ لیا ہے کہ مجھے کیا کرنا ہے۔‘‘ باسنغر مرزا نے دھیمی آواز میں ان دونوں کو بتایا۔ ’’میں ابھی کچھ دیر بعد طہارت کے بہانے، اس سامنے والے مکان میں جاؤں گا۔ میرے بعد تم دونوں بھی وہیں آ جانا۔‘‘

’’ٹھیک ہے۔‘‘ ان دونوں نے اثبات میں سر ہلایا اور مرزا اپنی جگہ سے اٹھ کر دروازے پر آیا۔ دروازے پر ترخانیوں کے سپاہی پہرے پر موجود تھے۔

’’مجھے طہارت کے لئے جانا ہے۔‘‘ باسنغر مرزا نے سامنے والے مکان کی طرف ہاتھ اٹھا کر اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ’’کیا تم لوگ مجھے اس کے دروازے تک پہنچا دو گے؟‘‘

سپاہیوں نے سوالیہ نظروں سے ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور بے نیازی سے کندھے اُچکا کر مرزا کو جانے کا راستہ مہیا کر دیا تھا۔

مرزا کے پیچھے قلی قوچین اور حسن شربتی بھی اس مکان میں داخل ہو گئے تھے۔ مکان کے اندر داخل ہوتے ہی انہوں نے فرار کے لئے کوئی راستہ تلاش کرنا شروع کر دیا تھا۔

اتفاقاً اس مکان کی پچھلی جانب ایک دروازہ تھا جسے اینٹوں سے بند کیا گیا تھا۔ اینٹیں ہٹا کر بہت آرام سے اس دروازے کے ذریعے باہر جایا جا سکتا تھا۔ مرزا کے ساتھیوں نے فوراً ان اینٹوں کو گرا کر راستہ بنا لیا اور وہ باہر نکل کر فصیل کی طرف دوڑ پڑا۔ فصیل کی موری سے نکل کر وہ مٹیالے ٹیلوں کو پھاندتا، خواجہ کفشیر کے پاس اس کے گھر میں جا کر پناہ گزیں ہو گیا۔

ادھر دروازے پر کھڑے سپاہیوں نے جب دیکھا کہ سلطان کو اندر گئے کافی دیر ہو گئی ہے تو وہ اندر گئے، مگر دیکھا وہاں مرزا کے ساتھی تو موجود تھے مگر مرزا فرار ہو چکا تھا۔

دوسرے دن ترخانی جمع ہو کر خواجہ کفشیر کے مکان پر گئے اور ان سے گزارش کی کہ باسنغر مرزا ان کے حوالے کیا کر دیا جائے۔

’’باسنغر مرزا، میری امان میں ہے۔‘‘ خواجہ نے سنجیدہ لہجے میں جواب دیا۔ ’’اور میں امانت میں خیانت نہیں کر سکتا۔‘‘

ترخانی زبردستی نہ کر سکتے تھے کیونکہ خواجہ بھی کوئی کمزور آدمی نہ تھا۔ دو روز بعد بہت سے امراء، سپاہی اور اہل شہر نے ہجوم کر کے باسنغر مرزا کو خواجہ کے گھر سے باہر نکالا اور پھر علی مرزا کو بھی گھیر کر یہیں لے آئے۔

اسی دوران پتا چلا کہ باسنغر کے وفاداروں نے درویش محمد ترخان کو گرفتار کر لیا ہے۔ علی مرزا تو پہلے ہی یہاں لوگوں کے نرغے میں تھا۔ چنانچہ ایک بار پھر باسنغر مرزا کو حاکم تسلیم کر لیا گیا۔

درویش محمد کو پابہ زنجیر اس کے سامنے لایا گیا۔ سلطان باسنغر مرزا نے اس کے قتل کا حکم دیا اور اگلے ہی لمحے اس کا سر تن سے جدا کر دیا گیا۔

’’سلطان معظم علی مرزا کے ساتھ کیا سلوک کیا جائے؟‘‘ سپاہیوں نے سلطان سے پوچھا۔

سلطان نے قہر آلود نظروں سے اپنے چھوٹے بھائی کی طرف دیکھا جو دوسروں کے سکھانے پر اس سے اس کا تخت و تاج چھیننے پر آمادہ ہو گیا تھا۔

’’اس بدلحاظ کو کوک سرائے لے جا کر اس کی آنکھوں میں دہکتی سلائیاں پھیر کر عبرت کے لئے اندھا کر دیا جائے۔‘‘

چنانچہ علی مرزا کو کوک سرائے لے جا کر اس کی آنکھوں میں دہکتی ہوئی سلائیاں پھیر دی گئیں۔ مگر قسمت یا جراح کے اناڑی پن سے علی مرزا کی آنکھوں کو ضرر نہ پہنچا۔

وہ قدرت کی اس مہربانی اور اپنی قسمت کی یاوری سے ہکا بکا رہ گیا۔ مگر کسی پر یہ بات ظاہر نہ ہونے دی اور اندھوں کی طرح چلتا ہوا خواجہ یحییٰ کے گھر جا پہنچا۔ پھر دو دن بعد یہاں سے بھاگ کر ترخانیوں کے پاس بخارا چلا گیا۔

باسنغر مرزا نے فوج جمع کر کے علی مرزا کی جانب بخارا کی طرف لشکر لے کر چلا۔ ادھر علی مرزا بھی اپنی سپاہ لے کر باہر نکلا۔ گھمسان کا رن پڑا اور فتح علی مرزا کے مقدر میں آئی۔

باسنغر مرزا کے بڑے بڑے فوجی سردار حاجی بیگ خان تیمور اور دیگر گرفتار کر لئے گئے اور اکثر کو موقع پر ہی قتل کر دیا گیا۔ باسنغر مرزا سمرقند کی طرف فرار ہو گیا۔ چنانچہ علی مرزا اسی وقت اس کے پیچھے سمرقند کی طرف روانہ ہو گیا۔

☆......☆......☆

اندجان کے نیلے آسمان پر شام کے سرمئی دھندلکے میں عید کا چاند دکھائی دیا تو اہل شہر سرور سے ایک دوسرے کو عید کی مبارکباد دینے لگے۔ اندجان کے بازار جو سر شام بند ہو جاتے تھے، آج رات گئے تک نا صرف کھلے تھے بلکہ لوگوں کی خوب چہل پہل بھی تھی۔ زیادہ تر لوگ عید میں خورد و نوش کا سامان خرید رہے تھے۔

اندجان کے قلعے میں سلطان بابر نے اپنی والدہ قتلق نگار خانم اور نانی ایسن دولت بیگم کے ساتھ عید کا چاند ملاحظہ کیا تھا۔ پھر پلٹ کر پہلے نانی، پھر ماں کو عید کی مبارکباد پیش کی تھی۔

’’تمہیں بھی ماہ شوال مبارک ہو۔‘‘ ایسن دولت بیگم نے بابر کی کشادہ اور دمکتی پیشانی پر بوسہ دیتے ہوئے مبارک دی۔

’’میرے لعل! تم ایسی ہزاروں عیدیں دیکھو۔‘‘ قتلق نگار خانم کی آواز بھرّا گئی تھی۔ ہر ایسے خوشی کے موقع پر اسے اپنا محبوب شوہر یاد آ جاتا تھا۔

کنیزیں سلطان اور دیگر شاہی بیگمات کی پوشاکوں کی تیاری میں لگی تھیں۔ شاہی باورچی، کل تیار کئے جانے والے خوان اور شیر خورمے کی بابت قتلق نگار خانم سے ہدایات لے رہے تھے۔ محل کے کمروں اور دالانوں کو پہلے سے ہی صاف ستھرا کر کے آراستہ کر دیا گیا تھا۔ سلطان کی خواب گاہ میں نئے پردے اور نئے غالیچے ڈالے گئے تھے۔

اگلے دن فجر کی اذان کے ساتھ ہی محل میں چہل پہل شروع ہو گئی تھی۔ سلطان بابر نیا لباس زیب تن کر کے نماز عید کی ادائیگی کے لئے خواجہ مولانا قاضی اور نعمت برگوش کے ساتھ عید گاہ کی طرف روانہ ہو گیا تھا۔

نماز عید کی ادائیگی کے بعد دستور کے مطابق سلطان کی طرف سے غرباء میں شیر خورما اور کھانا تقسیم کیا گیا تھا۔ محل میں موجود کنیزوں، خواجہ سراؤں اور دیگر خدام کو بھی اشرفیوں کی صورت عیدی دی گئی تھی۔ ہر طرف خوشیاں بکھری ہوئی تھیں۔ ہر چہرہ متبسم تھا اور ہر آنکھ مسکرا رہی تھی۔

بابر نذر گزارنے کی رسم کی ادائیگی کے بعد اپنے کتب خانے میں آ کر بیٹھا ہی تھا کہ ایک خادم نے آ کر اطلاع دی۔

’’سلطان معظم! ایک قاصد اہم خبر لے کر آیا ہے اور آپ سے شرف ملاقات کا متمنی ہے۔‘‘

’’بھیج دو۔‘‘ بابر نے پُرسوچ نظروں سے دروازے کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

اگلے ہی لمحے لمبے چغے اور اونچی ٹوپی والا خبر رساں سر جھکائے مؤدبانہ انداز میں اندر داخل ہوا۔ پہلے اس نے جھک کر اور گھٹنوں کو خم دے کر بابر کو سلام پیش کیا۔ پھر مؤدب ہو کر خاموش کھڑا ہو گیا تھا۔

’’ہاں بولو کیا خبر لائے ہو؟‘‘ بابر نے دلچسپی بھرے لہجے میں سوال کیا۔

’’سلطان معظم!‘‘ خبر رساں دھیمی مگر خاصی اضطراری آواز میں گویا ہوا۔ ’’آپ کے لئے ایک اچھی خبر ہے۔ سلطان باسنغر مرزا اور سلطان علی مرزا کی باہمی لڑائی میں سلطان باسنغر مرزا شکست کھا کر سمرقند کی طرف لوٹ گئے ہیں جبکہ ان کے چھوٹے بھائی علی مرزا ان کے تعاقب میں سمرقند کی طرف گئے ہیں۔‘‘

بابر کی آنکھوں میں حیرت بھری مسرت کی چمک جاگی۔

’’یہ تو بہت اچھی خبر ہے۔‘‘ اس کے باریک گلابی لبوں پر مسرور سی مسکراہٹ لرزی۔ ’’کچھ مسعود مرزا اور خسرو شاہ کے بارے میں پتا ہو تو بتاؤ؟‘‘

’’جی جناب عالی۔‘‘ خبر رساں نے اثبات میں سر ہلایا۔ ’’سلطان حسین بیقرہ کے حصار اور قندز سے واپس چلے جانے کے باعث سلطان مسعود مرزا اور خسرو شاہ اپنی اپنی جگہ خاصے مطمئن اور بے فکر ہو گئے ہیں۔‘‘

’’اس کا مطلب ہے کہ اب یہ دونوں بھی سمرقند پر کمند ڈالنے کے بارے میں ضرور سوچیں گے۔‘‘ بابر نے پُرسوچ نظروں سے اپنی دائیں جانب بیٹھے نعمت برگوش کی طرف دیکھا۔

’’آپ بالکل درست سوچ رہے ہیں۔‘‘ حاجی نعمت برگوش نے تائید بھرے انداز میں سر ہلایا۔ ’’اس موقعے سے مسعود مرزا اور خسرو شاہ پورا پورا فائدہ اٹھانے کی کوشش کریں گے۔‘‘

’’کیا ہمیں اس موقع کو یونہی ضائع کر دینا چاہئے۔‘‘ ہاتھ کے اشارے سے خبر رساں کو واپس جانے کا حکم دینے کے بعد بابر نے بوڑھے درباری نعمت برگوش کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا۔ ’’میں سمجھ رہا ہوں کہ سمرقند کو حاصل کرنے کا اس سے اچھا موقع شاید ہی کبھی حاصل ہو سکے۔‘‘

’’کیا آپ سمرقند پر لشکر کشی کے بارے میں سوچ رہے ہیں؟‘‘ خواجہ قاضی نے دھیمے لہجے میں سوال کیا مگر اس کے سوال سے ہویدا حیرت نے بابر کو قدرے ناخوش کیا تھا۔

’’بھلا اس میں ایسی حیرت کی کیا بات ہے؟‘‘ اس نے سنجیدگی اور دھیمے پن سے سوال کیا۔ ’’مجھے آپ کی حیرت پر حیرت ہے۔‘‘

’’سلطان معظم! میرا یہ مطلب تھا کہ کیا ان حالات میں ہمیں سمرقند کی طرف کوچ کرنا چاہئے جبکہ مسعود مرزا اور خسرو شاہ خود بھی سمرقند کے فراق میں اسی جانب رواں دواں ہیں۔‘‘

’’مسعود مرزا کی طرف سے زیادہ فکر مند ہونے کی ضرورت نہیں۔‘‘ بابر نے دھیمے مگر مضبوط لہجے میں جواب دیا۔ ’’وہ سمرقند کے لئے نہیں بلکہ اس سمرقندی خاتون کے فراق میں، اس طرف گیا ہے، جس کے عشق نے اسے خود سے بیگانہ کر دیا ہے۔‘‘

’’اوہ!‘‘ خواجہ نے متعجب انداز میں سر ہلایا۔ ’’آپ کا مطلب ہے کہ اس خاتون کے حصول کے لئے مسعود مرزا سمرقند کی جانب بڑھا ہے۔ غالباً اس لڑکی کا نام خجستہ خانم ہے اور وہ کسی ولید سمرقندی نامی تاجر کی بیٹی ہے۔‘‘

’’ہاں۔‘‘ بابر نے اثبات میں سر ہلایا۔ ’’وزیر شیخ عبداللہ برلاس ولید کا قریبی عزیز اور بچپن کا دوست ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اب تک مسعود مرزا کسی دوسرے راستے کا انتخاب نہیں کر سکا ہے۔‘‘

سب ہی امراء اور وزراء بابر کے خبر رساں اور جاسوسی کے ادارے کے بے حد معترف تھے۔ اس وقت وہ بابر کی معلومات سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔ اپنے اس سولہ سالہ سلطان پر انہیں فخر محسوس ہو رہا تھا۔

’’اور رہا خسرو شاہ کا معاملہ تو مجھے امید ہے کہ وہ ہم سے دوستی کا ہاتھ ملانا پسند کرے گا۔‘‘ بابر نے اپنی بات مکمل کر کے وزراء کی طرف دیکھا۔ چند لمحوں کے توقف کے بعد اس نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔ ’’خواجہ قاضی اور حاجی برگوش، آپ دونوں سے میری گزارش ہے کہ آپ لوگ تمام سرداروں کو طلب کریں اور انہیں اپنے اپنے دستوں اور رسالوں کو کیل کانٹے سے لیس ہو کر لام پر جانے کے لئے تیار رہنے کا حکم دے دیں۔‘‘

’’روانگی کب تک ہو گی؟‘‘ نعمت برگوش نے پوچھا۔

’’ان شاءاللہ اسی ماہ مبارک کے وسط میں ہم روانہ ہو جائیں گے۔‘‘

اور پندرہ روز کی شبانہ روز تیاریوں کے بعد سولہ شوال کو بابر اپنا لشکر جرار لے کر سمرقند کو فتح کرنے کا خواب اپنی خوابناک آنکھوں میں بسا کر، سمرقند کی طرف محو سفر ہوا۔ اس کے دل میں اپنے مورث تیمور کے تخت پر بیٹھنے کا عزم ہلکورے لے رہا تھا۔

سمرقند کی فصیلوں کے نیچے سلطان علی مرزا پہلے سے ہی خیمہ زن تھا جبکہ سلطان مسعود مرزا، سمرقند سے باہر شہر سبز میں ڈیرے ڈالے پڑا تھا۔ بابر نے بھی ان دونوں بھائیوں سے ذرا ہٹ کر پڑاؤ ڈال لیا۔

ادھر خسرو شاہ نے اپنے چھوٹے بھائی ولی کو سلطان علی مرزا کے ساتھ کر دیا تھا۔ خسرو شاہ کے کہنے پر ہی سلطان علی مرزا نے بابر سے ملنے اور باہمی اتحاد کا فیصلہ کیا تھا۔ اس نے خواجہ یحییٰ کو بابر کے پاس اپنا ایلچی بنا کر بھیجا تھا۔ ’’سلطان معظم!‘‘ خواجہ یحییٰ تقریباً دُہرا ہوتا ہوا گویا ہوا۔ ’’آپ کے چچا زاد بھائی سلطان علی مرزا آپ سے ملاقات کے خواہشمند ہیں۔‘‘

’’بہت اعلیٰ۔‘‘ بابر کے دلکش چہرے پر اطمینان بھری مسکراہٹ بکھر گئی تھی۔ ’’میں بھی اپنے بڑے برادر گرامی سے مل کر خوشی محسوس کروں گا۔‘‘

کچھ دیر تک خواجہ یحییٰ اور نعمت برگوش اور دیگر امراء ملاقات کے معاملے پر گفت و شنید اور غور و فکر کرتے رہے۔ بالآخر ملاقات کا دن اور مقام کا تعین کر لیا گیا۔

چاند تاروں سے محروم سیاہ آسمان سمرقند پر سایہ فگن تھا۔ گہرے بادلوں کے سیاہ پرتو نے رات کی تاریکی کچھ مزید بڑھا دی تھی۔ تیز ہوا کے جھکڑ تیز بارش کے پیامبر تھے۔ مگر وہ پانچ گھڑ سوار رات کی تاریکی اور موسم کی سختی سے بے نیاز مناسب رفتار سے دریائے کوہک کی طرف بڑھ رہے تھے۔ سب سے آگے والے گھوڑے پر سلطان بابر سوار تھا۔ اس نے سیاہ جنگی لباس زیب تن کر رکھا تھا اور سر پر سیاہ پگڑی باندھی ہوئی تھی۔ اس کے ساتھی بھی سیاہ لباسوں میں ملبوس تھے اور رات کی تاریکی کا حصہ دکھائی دے رہے تھے۔

کچھ دور جا کر وہ دریا کے کنارے رک گئے تھے۔ سامنے کی جانب سے بھی کچھ سوار آگے بڑھ رہے تھے۔ اس طرف سے ایک سوار کی مخصوص آواز پر ادھر والے سواروں کی طرف سے ایک مخصوص جواب دیا گیا۔ آنے والے وہی تھے جن کا انتظار تھا۔

سو بابر اور اس کے ساتھیوں کے تھمے ہوئے گھوڑے ایک بار پھر متحرک ہو گئے تھے۔ بابر نے ذرا آگے بڑھ کر اپنا گھوڑا دریا میں اتار دیا تھا۔ اس کے ساتھیوں نے بھی اپنے آقا کی تقلید میں اپنے اپنے گھوڑے دریا میں ڈال دیئے تھے۔

سامنے والے سوار بھی دریا میں اتر چکے تھے۔ کچھ دیر بعد دونوں اطراف کے سوار بیچ دریا میں آمنے سامنے آ ٹھہرے تھے۔

’’سلطان بابر؟‘‘ مقابل سے آنے والے سواروں میں سب سے آگے والے گھڑ سوار نے دھیمی آواز میں، بابر سے اس کے ہونے کی یقین دہانی چاہی۔ ’’کیا میں چچا عمر سعید مرزا کے صاحبزادے اور اپنے چچا زاد بھائی ظہیر الدین بابر سے مخاطب ہوں۔‘‘

’’ہاں میرے برادر گرامی سلطان علی مرزا۔‘‘ بابر نے سر کو ہلکا سا خم دے کر اپنا تعارف کروایا۔ ’’یہ میں ہی ہوں، فرغانہ کا حکمراں عمر سعید مرزا کا ولی عہد، بابر......‘‘

’’آپ کیسے ہیں برادر عزیز؟‘‘ سلطان علی مرزا نے محبت بھرے لہجے میں سوال کیا۔ ’’اس رب کریم کا کرم ہے۔‘‘ بابر نے بھی نرم اور مہذب لہجے میں جواب دیا۔ ’’آپ سنائیے آپ کا مزاج گرامی کیسا ہے؟‘‘

’’مزاج کا کیا پوچھتے ہو۔‘‘ علی مرزا اصل موضوع کی طرف آتے ہوئے گویا ہوا۔ ’’حالات کا پوچھو۔ دن بہ دن حالات بد سے بدتر ہوتے جا رہے ہیں، حالات کو اپنے اختیار میں رکھنے کے لئے آپ سے دوستانہ مراسم کا خواہاں ہوں اور کسی بھی بڑے معرکے کے لئے آپ کی حمایت اور دست گیری کی امید رکھتا ہوں۔‘‘

اوپر بادلوں سے ڈھکا سیاہ آسمان تھا اور نیچے تیز ہواؤں کے تھپیڑوں سے متلاطم دریا...... تیز موجیں عالم اضطراب میں کناروں پر سر پٹخ رہی تھیں اور خاندان تیمور کے دو سلاطین باہم معاہدے کی شقوں پر ہم کلام تھے۔

معاملات کی تکمیل کی خاطر ادھر سے خواجہ قاضی اور اُدھر سے خواجہ یحییٰ کی خدمات حاصل کی گئی تھیں۔

ذرا ہی دیر میں سب کچھ طے پا گیا تھا۔ پھر سلطان علی مرزا جس سمت سے آیا تھا، اسی سمت واپس مڑ گیا جبکہ ظہیر الدین بابر اپنے ساتھیوں کے ساتھ کنارے کی جانب لوٹ آیا تھا۔ دریائے کوہک کے ساتھ ساتھ چلتے کچھ دور آگے جا کر دائیں جانب مڑ کر وہ اپنی لشکر گاہ کی طرف بڑھ گیا تھا۔

اس ملاقات کے کچھ ہی دنوں بعد علی مرزا نے سمرقند کے قلعے سے محاصرہ اٹھا لیا اور اپنا لشکر سمیٹ کر بخارا واپس لوٹ گیا تھا۔

☆......☆......☆

مسعود مرزا نے اپنے مشیروں کے ذریعے پہلے خجستہ کے والد اور پھر وزیر عبداللہ برلاس سے رابطہ کیا تھا۔ محاصرہ اٹھنے کی شرط اس نے صرف خجستہ خانم سے عقد رکھی تھی۔ برلاس نے ولید سمرقندی سے بات کی۔

’’مگر برلاس تم جانتے ہو، خجستہ کی منگنی ہو چکی ہے۔‘‘

’’منگنی ہی تو ہوئی ہے، شادی تو نہیں ہوئی۔‘‘ عبداللہ برلاس نے زچ ہونے والے لہجے میں کہا۔ ’’وطن کی حفاظت اور سلامتی کی خاطر، کیا تم اتنی سی قربانی نہیں دے سکتے؟‘‘

’’خجستہ، اخلاص الدین کی امانت ہے۔‘‘ ولید سمرقندی مصر لہجے میں بولا۔ ’’اور میں امانت میں خیانت کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتا...... اور یہ جانتے ہوئے کہ خود خجستہ خانم، اپنے منگیتر سے بے حد محبت کرتی ہے۔‘‘

’’مگر ماموں جان۔‘‘ دروازے کے اس پار کھڑے اخلاص الدین نے کواڑ دھکیل کر اندر داخل ہوتے ہوئے کہا۔ ’’میں اس گستاخی کی معافی چاہتا ہوں کہ کافی دیر سے دروازے پر کھڑا آپ دونوں کی گفتگو سن رہا تھا۔ اس سے مجھے حالات سمجھنے کا موقع ملا۔ اگر آپ دونوں بزرگوار مجھے اجازت دیں تو میں کچھ عرض کروں؟‘‘

عبداللہ برلاس کو اخلاص الدین کی آمد اور اس طرح اچانک مداخلت پر کوئی حیرت نہیں ہوئی تھی کیونکہ خود اس نے ہی اسے بلوایا تھا۔ البتہ اس کے ماموں ولید سمرقندی کو ضرور حیرت ہوئی تھی۔

’’اخلاص الدین تم، اس وقت اور یہاں؟‘‘

’’جی۔‘‘ اخلاص الدین نے سر جھکاتے ہوئے دھیمی آواز میں جواب دیا۔ ’’ادھر سے گزر رہا تھا، سوچا عبداللہ برلاس صاحب کو سلام کر لوں، اتفاق ہے کہ آپ سے بھی ملاقات کا شرف حاصل ہو گیا۔‘‘

’’اخلاص الدین۔‘‘ عبداللہ برلاس نے قدرے اونچی اور واضح آواز میں اسے مخاطب کیا۔ ’’اب جبکہ تم تمام مسائل سے واقف ہو چکے ہو تو اس سلسلے میں تمہاری کیا رائے ہے؟‘‘

’’آقا۔‘‘ اخلاص الدین نے اپنے دونوں ہاتھ باندھ کر جھکتے ہوئے جواب دیا۔ ’’ملک اور رعیت کی سلامتی کی خاطر ایک منگیتر تو کیا، میں اپنا سارا خاندان اور خود اپنی جان نچھاور کر سکتا ہوں۔‘‘

’’تمہارا مطلب ہے کہ تمہیں اس بات پر کوئی اعتراض نہیں کہ خجستہ کی شادی مسعود مرزا سے کر دی جائے اور ایسا کرنے سے وہ اپنا لشکر لے کر اپنی سلطنت کی طرف لوٹ جائے گا اور جنگ کا خدشہ و خطرہ ٹل جائے گا۔‘‘

’’اگر اس کی یہی شرط ہے تو یہی سہی۔‘‘ اخلاص الدین کی آواز میں نہ کوئی قلق تھا نہ ہی ملال۔

اندر کی جانب کھلنے والے دریچے میں پردے کے اس پار کھڑی خجستہ خانم کے دل پر اخلاص الدین کا جواب نشتر بن کر لگا تھا اور وہ چکرا کر گرنے کو تھی کہ اس کی خادمہ نے اسے تھام لیا۔

’’کیا کرتی ہو بی بی، ابھی چوٹ لگ جاتی، زخم آ جاتا۔‘‘ خادمہ نے سرزنش کرتے ہوئے کہا۔

وہ آبدیدہ ہو کر بولی۔ ’’اناجی! زخم تو ایسا آیا ہے کہ شاید عمر بھر نہ بھر سکے گا۔‘‘

’’چھوڑو بی بی۔‘‘ بوڑھی انا تا ہاتھ جھٹک کر بولی۔ ’’ایسے بے قدرے سے شادی ہونے سے بہتر ہے کہ نہ ہو، ایک وہ قدر دان ہے کہ لشکر لئے شہر کا محاصرہ کئے بیٹھا ہے۔ آفرین ہے اس کی چاہت پر......‘‘

خجستہ خانم نے ہاتھ کی پشت سے آنکھیں مل کر آنسو پونچھے اور دھیمی آواز میں بولی۔ ’’شاید آپ ٹھیک کہتی ہیں اناجی، براہ کرم بابا تک میرا پیغام پہنچا دیجئے۔ میں سلطان مسعود مرزا سے شادی کرنے کے لئے تیار ہوں۔‘‘

اسی شام نہایت سادگی سے خجستہ کا عقد مسعود مرزا سے کر دیا گیا تھا۔

گوہر مقصود کے ہاتھ لگتے ہی مسعود مرزا نے وعدے کے مطابق اپنے لشکر کو کوچ کا حکم دے دیا اور اگلے دن ہی وہ اپنی چہیتی دلہن اور اپنے وسیع لشکر کو سمیٹ کر اپنی سلطنت کو چل دیا تھا۔

☆......☆......☆

موسم سرما کے آغاز کے ساتھ ہی ظہیر الدین بابر نے واپسی کے بارے میں سوچنا شروع کر دیا تھا۔ پوری طرح یخ بستہ موسم ہونے سے قبل ہی بابر نے اندجان کی طرف لوٹ جانے کا فیصلہ کر لیا تھا۔

’’اتنے مہینوں کے محاصرے کے بعد جبکہ دیگر محاصرین ہمارے لئے میدان خالی چھوڑ کر جا چکے ہیں، ہمارا شہر پر حملہ کئے بغیر لوٹ جانا کیا دانش مندی ہو گی؟‘‘ نوجوان سردار صبور خان نے دھیمی اور شائستہ آواز میں اپنا مدعا بیان کیا۔ ’’آقا میرا خیال ہے ہمیں دشمن پر ایک زبردست وار کرنا چاہئے۔‘‘

’’تمہارے جذبے کی میں قدر کرتا ہوں۔‘‘ بابر نے دھیمے اور مسکراتے لہجے میں سردار کی طرف دیکھتے ہوئے جواب دیا۔ ’’مگر تم دیکھ رہے ہو کہ فصیلوں کے اس پار تمام لوگ کیل کانٹوں سے لیس ہیں اور ان کا جذبہ بھی بے حد جوان ہے۔ ادھر چند ہی روز میں سخت جاڑا ہمیں آ جکڑے گا۔ میں نہیں چاہتا کہ اس مقابلے میں جاڑے کی وجہ سے میرے سپاہی بے موت مارے جائیں، اس لئے ہمارا اس وقت واپس لوٹ جانا ہی قرین قیاس ہے...... لیکن یہ کوئی نہ بھولے کہ میں سمرقند کا تخت حاصل کر کے رہوں گا۔ مگر یہ بازی پھر کسی وقت کے لئے اٹھا رکھتے ہیں، اس وقت کوچ کرنا ہی مناسب رہے گا۔‘‘

اور یوں بابر جاڑے کے موسم کے شروع ہوتے ہی اپنا لشکر لے کر اندجان کی طرف روانہ ہو گیا۔ اونچے سنگلاخ پہاڑوں سے گزرتا آخر کار وہ اندجان پہنچ گیا۔

اندجان پہنچتے ہی بابر نے اپنے وزراء، مشیروں اور سرداروں کے ساتھ ایک اجلاس منعقد کیا۔

’’سمرقند کے محاصرے کو ختم کر کے ہمارا اس طرح بے نیل و مرام واپس لوٹ آنے کا یہ ہرگز مطلب نہیں کہ ہم نے سمرقند کو فتح کرنے کا ارادہ ترک کر دیا ہے۔‘‘ بابر نے اپنے سامنے سر جھکائے مؤدب و مستعد امراء و سرداران کی طرف دیکھتے ہوئے بات کا آغاز کیا۔ ’’ہمارا اس وقت بنا جنگ کے واپس آ جانا مصلحت وقت کا تقاضا تھا۔ اب جبکہ ہمارا سلطان علی مرزا سے بھی معاہدہ ہو چکا ہے، اس معاہدے کی رو سے موسم گرما میں، ہم علی مرزا کی افواج کے ساتھ مل کر ایک بار پھر سمرقند پر ہلا بولیں گے۔‘‘

’’میرا خیال ہے موسم گرما اس معرکے کے لئے نہایت مناسب ہو گا۔‘‘ خواجہ قاضی نے تائید بھرے انداز میں کہا۔ ’’اور اس طرح ہمارے پاس کافی وقت ہو گا لشکر کو نئے سرے سے مرتب اور تیاریاں کرنے کے لئے......‘‘

’’صحیح فرمایا آپ نے۔‘‘ ظہیر الدین بابر نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ’’اب ہمارے پاس جاڑے کا پورا موسم ہے جنگی تیاریوں کے لئے، ہم بھرپور تیاری اور پوری طاقت کے ساتھ علی مرزا کی معیت میں موسم گرما میں سمرقند پر حملہ کریں گے۔‘‘

پھر کافی دیر تک تمام امراء، وزراء اور جنگی سردار باہم جنگی تیاریوں پر غور و فکر اور سوچ بچار کرتے رہے تھے۔

موسم سرما سمرقند پر حملے کی تیاریوں میں گزرا۔ بابر نے پوری کوشش کی تھی کہ ان تیاریوں کی خبر سلطان باسنغر تک نہ پہنچ سکے۔ نہایت رازداری کے ساتھ اس نے اپنا لشکر تشکیل دیا۔ نئے ہتھیار، تلواریں، تیر، بھالے اور خنجر ڈھلوائے۔ گھوڑوں کی تعداد میں اضافہ کیا اور سپاہیوں کو سخت تربیت دی گئی۔

ماہ مئی کے آغاز کے ساتھ ہی بابر نے کوچ کا فیصلہ کر لیا۔

اس شام بابری دربار میں تمام امراء و وزراء جمع تھے۔ بابر ریشمی توشک پر بیٹھا تھا۔ اس کے دائیں جانب اوزن حسن اور علی دوست طغائی دو زانو بیٹھے تھے۔ بابر نے دارالخلافہ کے معاملات کو اوزن حسن اور دوست طغائی کے سپرد کرنے کا فیصلہ کیا تھا۔

اس کے اس دانش مندانہ فیصلے پر سب ہی امراء و عمائدین سلطنت نے اتفاق کیا تھا۔ دارالخلافہ کے معاملات ان دونوں زیرک اور تجربہ کار امراء کے حوالے کر کے بابر نے اس میدان کا رخ کیا تھا جہاں اس کا لشکر کوچ کے لئے تیار کھڑا تھا۔

آسمان پر چمکتے ضوفشاں سورج کی حیات افزا روشنی میں تنومند گھوڑوں پر سوار پُرعزم اور توانا سپاہی لام پر جانے کے لئے بے چین و مضطرب تھے۔ ان کی آنکھوں سے یقین اور چہروں سے عزم ٹپک رہا تھا۔

وہ جلد از جلد اپنے آقا بابر کے سمرقند پر حکومت کے خواب کو شرمندۂ تعبیر کرنے میں اپنا کردار ادا کرنے کے لئے مشتاق و بے تاب تھے۔ ان خود سر اور سرکش منگولوں اور ترکوں کو سخت تربیت کے ذریعے ایک منظم سپاہ میں بدل دیا گیا تھا۔

بابر اپنی فوج میں تنظیم کا بے حد قائل تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ سپاہ کی بہتات، ہتھیار و سواری کی افراط سے نہیں بلکہ نظم و ضبط اور تنظیم کے ذریعے جنگیں جیتی جاتی ہیں۔ اس لئے سپاہیوں کو سخت تربیت کی بھٹی میں کندن کیا جاتا تھا۔ کسی بھی شکایت کے ملنے پر ان کے ساتھ سختی سے نبٹا جاتا تھا اور سخت سزائیں دی جاتی تھیں۔

بابر جوں ہی میدان میں وارد ہوا، سپاہیوں کے جوش میں اضافہ ہو گیا۔ وہ اپنے سلطان کی کامیابی و فتح یابی کے لئے نعرے بلند کر رہے تھے اور جلد از جلد میدان جنگ میں جا کر دشمن کو فنا کر دینے کے عزم کا اظہار کر رہے تھے......!

(جاری ہے)

allurdupdfnovels.blogspot.com www.freepdfpost.blogspot.com

ظہیر الدین بابر

اشتیاق فاطمہ عظمیٰ

قسط : 8

سپاہ کا جوش وخروش دیکھ کر بابر کے دلکش چہرے پر فاتحانہ مسکراہٹ بکھر گئی تھی۔

اس کی ماں قتلق نگار خانم ان دنوں صاحب فراش تھی، اور ابھی کچھ دیر قبل جب وہ اپنی ماں سے رخصت لینے اس کے کمرے میں گیا تھا تو اس نے نقاہت بھری آواز میں کہا تھا۔

''بیٹا! میں اپنی علالت کے باعث تمہارے ساتھ نہیں چل سکتی مگر میری دعائیں ہمیشہ تمہارے ساتھ رہیں گی۔ خدا تمہیں کامیابی سے ہمکنار کر کے جلد واپس لائے۔ تم لوٹ کر آؤ گے تو میں اپنے اس دیرینہ خواب کو شرمندۂ تعبیر کرنا چاہوں گی۔''

''آپ کی دعاؤں کا شکریہ۔'' بابر نے ماں کے سامنے سعادت مندی اور عقیدت بھری محبت سے سر جھکاتے ہوئے تشکر بھرے لہجے میں کہا۔ ''آپ کی دعائیں شامل حال رہیں تو ان شاء اللہ فتح ونصرت میرا مقدر بنے گی، اور جہاں تک آپ کے خواب کی تعبیر کا سوال ہے تو والدہ محترمہ میں سمجھا نہیں، بھلا آپ کا ایسا کون سا دیرینہ خواب ہے جو اب تک تشنۂ تعبیر ہے؟''

''میں سمجھاتی ہوں۔'' اس کی بوڑھی مگر خوب سرخ وسفید اور صحت مند نانی ایسن دولت بیگم نے مسکرا کر اس کی جانب بڑھتے ہوئے نرم اور معنی خیز لہجے میں کہا۔ ''ہر ماں کی طرح تمہاری ماں کا دیرینہ خواب تمہارے سر پر سہرا سجانے کا خواب ہے۔''

''اوہ!'' بابر اس غیر متوقع جواب پر ایک دم جھینپ گیا۔ اس کے سرخ وسفید چہرے کی سرخی میں مزید اضافہ ہو گیا تھا۔

''میں چاہتی ہوں کہ اب میں اپنی بیوہ بہن سلطان نگار خانم سے کیا گیا وعدہ وفا کر دوں اور اس کے پاس موجود اپنی امانت کو اپنے بیٹے کی دلہن بنا کرا سے گھر لے آؤں۔'' قتلق نگار خانم کے سپید چہرے پر امید بھری مسرت کی سرخی بکھر گئی تھی۔ ''شاید تمہیں یاد ہو کہ جب تم پانچ سال کے تھے تو تمہاری منگنی تمہاری خالہ زاد ماہ لقا بیگم سے کر دی گئی تھی، اب جبکہ تم ماشاء اللہ عمر بلوغت کو پہنچ گئے ہو تو اس نیک کام میں دیر نہیں ہونی چاہئے۔ خود سلطان نگار اپنی اس ذمے داری سے جلد از جلد عہدہ برآ ہونے کی خواہشمند ہیں کیونکہ خیر سے ماہ لقا بھی اب شادی کی عمر کو پہنچ چکی ہے۔''

''ماہ لقا بیگم؟'' بابر نے حیرت بھرے لہجے میں مانوس سا اجنبی نام دُہرایا۔ گیارہ بارہ سال کی نوعمری میں باپ کے سائے کے سر سے اٹھتے ہی اس کے کاندھوں پر ریاست و حکومت کی بھاری ذمہ داری آ پڑی تھی اور یہی نہیں ہر طرف سے مصائب ومسائل اس کی جانب لپک پڑے تھے۔ بغاوتیں، شورشیں اور کتنی ہی جنگیں ان چھ سالوں میں وہ بھگت چکا تھا۔ ان گوناگوں مسائل میں گم ہو کر اس کمسنی کے انجانے سے رشتے کو وہ بالکل فراموش کر بیٹھا تھا۔ اس پل ماں اور نانی کے یاد دلانے پر نسیان کے طاقچے پر ایک مٹی مٹی سی تصویر دھری دکھائی تو دی تھی مگر لاشعور کے ایوانوں میں بھٹکتی اس بھولی بسری اور انجانی سی یاد کے نقوش غیر نمایاں اور غیر واضح تھے۔ بہت یاد کرنے پر ایک ننھی گڑیا سی لڑکی یاد تو آئی تھی مگر اس کے ساتھ ایک اور چہرہ بھی ابھرا تھا جس کی آنکھوں سے لپکتے نفرت اور ناپسندیدگی کے شعلے، چہرے پر ناگواری اور ناخوشگواری کے تاثرات اور لہجے میں تلوار کی سی کاٹ تھی۔

''خبردار جو میری بہن کو ہاتھ لگایا۔''

بھلا وہ لڑکی کون تھی؟ بابر نے ذہن پر زور دیتے ہوئے یاد کرنے کی کوشش کی۔ ''غالباً وہ ماہ لقا بیگم کی سوتیلی بہن اریبہ بیگم تھی۔'' بابر کو اپنی یادداشت پر لحظہ بھر کو حیرت ہوئی تھی۔

''تو پھر کیا کہتے ہو؟'' اسے سر جھکائے خاموش خیالوں میں گم دیکھ کر اس کی ماں نے اس سے سوال کیا۔ ''کیا میں اپنی بہن کو تمہاری رضامندی کا پیغام بھجوا دوں؟''

''جج…… جی۔'' بابر ماں کے سوال پر چونک کر خیالوں کی دنیا سے باہر آ گیا اور سعادت مندی سے سر جھکا کر بولا۔ ''جیسی آپ کی خوشی، میں کیا عرض کروں، جو آپ مناسب سمجھیں، آپ کے کسی حکم سے میں سرتابی کی جرأت کیونکر کر سکتا ہوں۔''

''جیتے رہو میرے لعل۔'' ماں کے چہرے پر مسرت بھرا تبسم بکھر گیا۔ ''تم سے مجھے یہی امید تھی، خدا تمہیں فتح ونصرت کے ساتھ بخیر وعافیت واپس لائے۔ ان شاء اللہ تمہارے آتے ہی میں اس فرض سے سبکدوش ہونے کی خوشی سے بہرہ مند ہو جاؤں گی۔'' اس نے آگے بڑھ کر اپنے طالع نصیب اور سعادت مند بیٹے کی کشادہ دمکتی پیشانی کا بوسہ لیتے ہوئے مسرور سے لہجے میں اسے بتایا اور اس نے قدرے شرمیلے پن سے سر جھکا لیا۔

اور اس پل، جب وہ اپنے لشکر جرار کے سامنے اپنے وفادار اور توانا اسپ کی پشت پر سرا ونچا کئے بیٹھا تھا اور عقابی نظروں سے اپنی سپاہ کا جائزہ لے رہا تھا تو بالکل اچانک ہی اسے ماں کی بات یاد آ گئی تھی۔

اس کی سترہ سالہ زندگی میں چھنکتی تلواروں، ہنہناتے گھوڑوں اور لاشوں سے پٹے میدان کارزاروں کی کئی داستانیں رقم تھیں مگر کسی خمار آلود آنکھ، دراز سیاہ گیسو، کھنکتی چوڑیوں اور شنگرفی لبوں کی کوئی مختصر سی کہانی کا گزر تک نہ تھا۔ یہ سب سوچنے اور ان رنگین اور سنگین خواب بننے کے لئے نہ حالات سازگار رہے، نہ وقت نے اجازت دی۔

اب تک وہ ایک نوعمر حکمران تھا جو چاروں طرف سے حالات کی ستم ظریفی اور تقدیر کی بے رحمی کے تھپیڑوں میں گھرا ہوا تھا۔ اب جبکہ اس نے جوانی کی وادیوں میں پہلا پہلا قدم رکھا تھا تو اچانک ہی اس کے نوجوان اور کورے دل پر پہلی پہلی دستک ہوئی تھی۔ ایک انجانی، اَن دیکھی، بھولی بسری یاد، سراپا یقین بن کر اس کے دل کے زینے پر قدم بہ قدم آگے بڑھتی چلی آ رہی تھی۔ وہ ننھی سی شفاف آنکھوں اور گلابی نرم رخساروں والی بچی اب عنفوان شباب میں داخل ہو چکی ہوگی۔ جانے اب وہ کیسی ہوگی؟

اور اس کی بڑی بہن اریبہ بیگم؟ کیا اب بھی وہ پہلے کی طرح غصیلی، لڑاکا اور بدلحاظ ہوگی؟ اریبہ بیگم کے بارے میں سوچتے ہوئے بابر کو ایک عجب سی بے چینی اور ناپسندیدگی کا احساس ہو رہا تھا۔ تب ہی اس کے ایک جنگجو سردار خواجہ افضال اپنے گھوڑے کو دوڑاتا بابر کے قریب چلا آیا۔

''سلطان عالی مقام۔'' خواجہ افضال نے سر جھکا کر مؤدبانہ لہجے میں کہا۔ ''لشکر کو کوچ کا حکم عطا ہو تاکہ ہم سمرقند کی فتح کے لئے روانہ ہو سکیں۔''

خواجہ افضال کی آواز نے بابر کو سوچوں کی دنیا سے کھینچ نکالا۔ اس نے چونک کر پہلے سردار، پھر روانگی کے حکم کے منتظر لشکر جرار کی طرف دیکھا اور سر کے ہلکے سے اشارے سے سفر کے آغاز کا حکم صادر فرمایا۔

☆……☆……☆

ارتباط کے وسیع وعریض میدان پر بادلوں سے ڈھکا سیاہ آسمان سایہ فگن تھا۔ میدان میں سلطان باستغر مرزا اور اس کے حریف بھائی سلطان علی مرزا کی فوج آمنے سامنے پڑاؤ انداز تھیں۔

کئی روز بیت جانے کے باوجود ابھی تک جنگ کا آغاز نہیں ہوا تھا۔ باستغر مرزا خود سے آغاز جنگ کے حق میں نہ تھا۔ اسے علی مرزا کی طرف سے ابتداء کا انتظار تھا جبکہ علی مرزا اپنے چچیرے بھائی سلطان ظہیر الدین بابر کے لشکر کی آمد کا منتظر تھا۔ اس رات دریا کے بیچ ان دونوں کے مابین یہی قرار پایا تھا کہ موسم گرما میں وہ دونوں متحد ہو کر باستغر مرزا سے معرکہ آرائی کریں گے۔ علی مرزا کو اطلاع مل چکی تھی کہ بابر اپنا لشکر لے کر اندجان سے نکل چکا ہے اور کسی بھی لمحے اس کی آمد متوقع تھی۔

مگر باستغر مرزا، علی مرزا کے سکوت سے سخت مضطرب اور بے کل تھا۔ دو بڑے لشکروں کے پڑاؤ انداز ہونے کے باوجود ہر سو ایک پُراسرار خاموشی چھائی ہوئی تھی، ہوائیں بھی دم سادھے دبے پاؤں چل رہی تھیں۔ میدان میں ترتیب سے نصب خیموں کے بیچ الاؤ روشن تھے۔ عارضی اصطبل میں گھوڑے بندھے تھے اور اپنے کھروں سے زمین کرید کر اپنی بے چینی کا اظہار کر رہے تھے۔ سپاہی گو کہ خیموں میں اپنے بستروں پر استراحت فرما رہے تھے مگر اکثر کی آنکھیں نیند سے محروم تھیں۔ ایک بے یقینی اور بے خبری کا عالم تھا۔ فضا میں خوف اور مایوسی کی پرچھائیاں لرزاں تھیں۔ کسی کو پتا نہ تھا کہ اگلے پل کیا ہونے والا ہے؟

اس وقت سلطان باستغر مرزا اپنے شاہی خیمے میں، عالم اضطراب میں ٹہل رہا تھا۔ زمین پر دبیز قالین بچھے تھے اور سلطان کے پیروں میں گداز مخملی جوتی تھی، اس کے باوجود اسے اپنے تلوؤں میں ارتباط کی پتھریلی زمین کے نکیلے پتھر چبھتے محسوس ہو رہے تھے۔ قرمزی رنگ کے حریری لبادے میں وہ خاصا مضطرب اور بے کل سا پشت پر ہاتھ باندھے چہل قدمی میں مصروف تھا۔

جب سے اسے پتا چلا تھا کہ علی مرزا بابر کے لشکر کا انتظار کر رہا ہے، اس کے خوف میں اضافہ ہو گیا تھا اور حوصلے مزید پست ہو گئے تھے۔ وہ شروع سے ہی رزم سے زیادہ بزم کا رسیا تھا۔ وہ ایک جنگجو سپہ سالار سے زیادہ عاشق زار شاعر تھا۔ اور جب سے اس کی زندگی میں خجستہ خانم آئی تھی، اس کے ہاتھ تلوار اٹھانا ہی بھول گئے تھے۔

اسے اپنی اس محبوب شریک حیات کے دلنشین چہرے، مشکبار گیسوؤں اور تراشیدہ شنگرفی لبوں کے علاوہ کچھ یاد نہ تھا اور اس پل وہ رنجیدہ وملول تھا کیونکہ اس سنگلاخ میدان کی بجائے وہ اپنی حور شمائل محبوب کی فسوں خیز آغوش میں رہنے کا متمنی وخواہاں تھا۔

تب ہی شمال کی جانب سے غبار سا اٹھا تھا۔ بابر کا مخبر دستہ طوفانی رفتار سے باستغر مرزا کے لشکر کی طرف اڑا چلا آ رہا تھا۔ باستغر مرزا کے لشکری اس افتاد سے بے خبر نیند کی آغوش میں سمٹے ہوئے تھے۔ اچانک ہی بابر کے دستے نے باستغر مرزا کی فوج پر فرغانہ کے اس اُڑن دستے نے شب خون مارا۔

اس سے قبل کہ باستغر مرزا کے جنگجو سردار کچھ سمجھ پاتے، کچھ سوچتے اور کوئی احتیاطی تدبیر اختیار کرتے، ایک قیامت صغریٰ گزر گئی۔ لشکر کے سپاہیوں کی اچھی خاصی تعداد نیند میں ابدی نیند سو گئی۔ بابر کے سپاہی آندھی کی طرح آئے اور سیلابی ریلے کی طرح شدید نقصان پہنچا کر مال غنیمت کا ایک انبار اپنے ساتھ بہا کر لے گئے۔

حادثے کی خبر جب لشکر کے میدانی سپہ سالار خواجہ افضال کو ہوئی تو وہ گھبرایا ہوا سلطان باستغر مرزا کے خیمے کی طرف دوڑا۔

''سلطان عالی مقام! غضب ہو گیا۔'' خیمے میں داخل ہوتے ہی وہ چڑھی ہوئی سانسوں کے درمیان خوفزدہ لہجے میں گویا ہوا۔ ''بابر کے اُڑن دستے نے ہماری فوج پر شب خون مارا ہے۔''

''اوہ'' سلطان کی بے خواب آنکھوں میں خوف کے سائے مزید گہرے ہو گئے۔ ''کتنا نقصان ہوا؟''

''بہت زیادہ۔'' سردار نے مایوس اور افسردہ لہجے میں جواب دیا۔ ''اصل اعداد وشمار میں تو وقت لگے گا مگر اندازے سے کہا جا سکتا ہے کہ سیکڑوں سپاہی ہمیشہ کے لئے سوتے رہ گئے۔ وہ ہزاروں گھوڑے، ہتھیار اور دیگر مال واسباب لوٹ کر لے گئے۔''

''اُف!'' باستغر مرزا خیمے کے مغربی کونے میں بچھے مخملی نمدے پر ڈھے سا گیا۔ اس کے چہرے سے مایوسی اور آنکھوں سے وحشت ٹپک رہی تھی۔

''سلطان معظم۔'' کئی لمحے بیتنے کے باوجود جب سلطان نے کوئی جواب نہ دیا تو سردار افضال خان نے دوبارہ اسے پکارا۔ ''میں آپ کے حکم کا منتظر ہوں۔ فرمائیے اب کیا حکمت عملی اختیار کی جائے؟''

سلطان باستغر مرزا نے فوراً کوئی جواب نہیں دیا۔ اس کے چہرے پر بکھری مایوسی میں کچھ اور اضافہ ہو گیا تھا۔ کئی لمحوں تک گہری سوچ میں ڈوبے رہنے کے بعد اس کی مایوسی اور دہشت میں ڈوبی آواز ابھری۔ ''خواجہ افضال خان! مجھے سوچنے کے لئے تھوڑا وقت درکار ہے۔''

''سلطان معظم۔'' اسے سوچوں میں گم اور متردد دیکھ کر افضال خان نے دھیمی اور ہراساں آواز میں کہا۔ ''ہمارے پاس وقت بہت کم ہے۔ بابر کے دستے دوبارہ ہمارے لشکر پر دھاوا بول سکتے ہیں۔ میری گزارش ہے کہ آپ جلد از جلد حکم صادر فرما دیجئے کہ اب ہمیں کیا کرنا ہے؟''

سلطان نے اضطراری انداز میں خیمے کے ادھ کھلے دروازے سے شمال کی جانب دیکھنے کی کوشش کی مگر اس کے خیمے کے سامنے دور تک پھیلے اس کی سپاہ کے خیموں نے اسے دشمن کے تیز رفتار دستوں کی پیش رفت کو اس کی نظروں سے اوجھل رکھا تھا۔

کئی لمحوں تک وہ تاریکی میں آنکھیں پھاڑے بدحواس سا گھورتا رہا، پھر جیسے وہ کسی حتمی فیصلے پر پہنچ گیا۔

اس نے پلٹ کر گھبرائے ہوئے انداز میں خواجہ افضال کو مخاطب کیا۔ ''خواجہ، پڑاؤ اٹھا لو۔ سپاہیوں کو حکم دو کہ فوراً خیمے اٹھا کر گھوڑوں کی پشت پر سوار ہو جائیں، ہم ابھی اسی وقت واپس جا رہے ہیں۔''

لحظہ بھر کو خواجہ افضال خان کی آنکھوں میں حیرت لہرائی۔ اسے سلطان سے اس طرح کے فیصلے کی قطعی توقع نہ تھی۔ مگر اگلے ہی لمحے اس نے دُہرا ہو کر سر تسلیم خم کیا اور تیزی سے باہر چلا گیا۔

انتہائی افراتفری کی حالت میں پڑاؤ اٹھایا گیا اور سپاہی بہ عجلت تمام لشتم پشتم اپنا اسباب وہتھیار سنبھالتے گھوڑوں پر سوار ہوئے اور دارالخلافہ کی طرف روانہ ہو گئے۔

صبح کاذب کے دھندلے اجالے سے قبل، میدان صاف ہو چکا تھا۔ خیموں کے درمیان جلتے الاؤ راکھ کے ڈھیر میں تبدیل ہو چکے تھے، کسی کسی الاؤ سے اٹھتا دھواں محفل اجڑ جانے پر ماتم کناں دکھائی دے رہا تھا۔ گھوڑوں کے عارضی اصطبل میں گھوڑوں کی لید اور بچا کھچا چارہ اور مطبخ میں چولہوں میں ادھ جلے چیلے اس بات کے غماز تھے کہ کچھ دیر قبل یہاں کوئی لشکر قیام پذیر ہوا تھا۔

ظہیر الدین بابر میدان کارزار میں وارد ہوا تو اس دلچسپ صورت حال نے اسے خاصا محظوظ کیا تھا۔ اسے یہ تو اندازہ تھا کہ سلطان باستغر مرزا شاعرانہ مزاج کا ایک عاشق صفت انسان ہے مگر اسے یہ اندازہ نہ تھا کہ وہ یوں آناً فاناً میدان چھوڑ بھاگے گا۔

لشکر کے پڑاؤ سے اندازہ ہونے کے بعد وہ سلطان علی مرزا سے ملنے اس کے شاہی خیمے میں گیا۔ علی مرزا، بابر سے چند سال ہی بڑا تھا۔ دونوں خوبرو اور ذیشان شہزادے ایک دوسرے سے بغلگیر ہو کر ملے تھے۔

''میں اپنے عم زاد سلطان بابر کو خوش آمدید کہتا ہوں۔'' سلطان علی مرزا نے بابر کو سینے سے لگاتے ہوئے مسرور لہجے میں کہا۔

''شکریہ برادر محترم۔'' بابر نے بھی اخلاص بھرے اور مؤدبانہ لہجے میں کہا۔ ''آپ کو یہاں دیکھ کر دل کو تقویت اور مسرت حاصل ہوئی، خدا آپ کو سلامت رکھے۔''

علی مرزا، بابر کا ہاتھ تھام کر اسے اپنے مخملی اور گداز نمدے تک لے گیا اور نہایت اپنائیت اور محبت سے اسے اپنے ساتھ بٹھایا۔ ان کے بیٹھتے ہی ایک خادم نے چاندی کی گول سینی ان کے سامنے لا رکھی، جس میں پیالوں میں گرم، خوشبودار وخوش ذائقہ قہوہ اور رکابیوں میں تلا ہوا نمکین خشک میوہ دھرا تھا۔

ابھی دونوں سلاطین نے قہوے کا پہلا گھونٹ ہی بھرا تھا کہ علی سید کا خاص مشیر عبدالملک خان اندر داخل ہوا۔

''سلطان معظم۔'' اس نے سر جھکا کر بے حد مؤدبانہ لہجے میں کہا۔ ''سلطان باستغر مرزا کے لشکر کے کچھ منگول سردار اپنے دستوں کے ساتھ باہر موجود ہیں، وہ آپ دونوں معزز سلاطین کی ملازمت اختیار کرنے کے خواہاں ہیں۔''

''اوہ!'' علی مرزا کے دلکش چہرے پر پُرتمکنت مسکراہٹ ابھری۔ ''انہیں شامل ملازمت کر لیا جائے۔''

''مگر بھائی……'' بابر نے بے اختیار ہاتھ اٹھا کر کہا۔ ''منگولوں کو ملازمت دینے سے پہلے ہمیں خوب اچھی طرح سوچ لینا چاہئے۔ میں ان کی فطرت سے اچھی طرح واقف ہوں۔ یہ پیشہ ور سپاہی ہارتے ہوئے فریق کا ساتھ چھوڑنے پر ہمیشہ کمربستہ رہتے ہیں، یہ ناقابل اعتماد ہیں۔ یہ نظم وضبط سے بے بہرہ، وحشی اور شقی القلب منگول ہمارے لشکر میں شامل ہوئے تو ہماری سپاہ کا نظم وضبط بھی برباد کر دیں گے۔''

''تمہارا مشاہدہ حیرت انگیز اور مشورہ قابل قدر ہے۔'' علی مرزا، بابر کی صلاحیتوں سے ہمیشہ مرعوب رہا تھا۔ اس پل بھی وہ تحسین بھرے لہجے میں گویا ہوا۔ ''مگر برادر! اس وقت ان منگولوں کو تنہا چھوڑ دینا بھی کوئی دانشمندانہ فیصلہ نہ ہوگا۔ ہم انہیں اپنے لشکر میں ملازمت ضرور دیں گے مگر ان کی کسی خطا پر سخت احتساب کا عمل بھی جاری رکھا جائے گا۔''

بابر نے بڑے بھائی کے فیصلے پر سر تسلیم خم کر دیا۔

اگلے دن بابر اور علی مرزا کی مشترکہ فوج نے سمرقند پر چڑھائی کی تھی اور بغیر کسی بڑے معرکے کے شیراز ان کے قبضے میں آ گیا تھا۔ یہ ایک بڑی فتح تھی۔ بابر اور علی مرزا دونوں ہی بے حد خوش اور اگلی کامیابی کے لئے پُرامید تھے۔

لشکری بھی فتح وکامیابی کے نشے میں چور شیراز کے گلی کوچوں میں دندناتے پھر رہے تھے۔ کل تک سلطان باستغر مرزا کے لشکر میں شامل منگول سپاہی آج بابر کے لشکر کا حصہ بن کر اس کامیابی کو اپنا کارنامہ تصور کر رہے تھے۔ ان کی چھوٹی چھوٹی وحشی آنکھوں میں غرور وتکبر کے رنگ کچھ اور گہرے ہو گئے تھے۔ وہ بدمست ہاتھیوں کی طرح بازاروں میں دندناتے پھرتے، جس دکان سے چاہتے، اپنی پسند کی چیز اٹھا لیتے، دکاندار کے کچھ کہنے پر اسے آنکھیں دکھا کر خاموش کر دیتے۔ لمحہ بہ لمحہ ان کا حوصلہ بڑھتا جا رہا تھا۔

اس سہ پہر دو منگول سپاہی ایک نصرانی کے میکدے سے مفت کی شراب پی کے نشے میں ڈولتے ڈگمگاتے باہر نکلے۔ سامنے ہی تین بوڑھے سڑک کے کنارے کھڑے اس بدترین صورت حال پر تبصرہ کر رہے تھے۔

''میرا بیٹا بصر کہتا ہے کہ اب ہمیں شیراز کو خیرباد کہہ دینا چاہئے۔'' ایک بوڑھے نے مایوس لہجے میں اپنے ساتھیوں کو بتایا۔ ''ان منگول سپاہیوں کے ہوتے اس شہر میں رہنا مشکل سے مشکل ہوتا جا رہا ہے۔''

''سلطان بابر اپنی فوج کے نظم وضبط کا بے حد خیال رکھتا ہے۔'' دوسرے بوڑھے نے کہا۔ ''اگر اسے اطلاع پہنچا دی جائے تو ان وحشیوں کی گوشمالی ہو سکتی ہے۔''

''کیا کہا بدبخت بڈھے۔'' نشے میں لڑکھڑاتے دونوں منگول سپاہیوں کے کانوں تک ان بوڑھوں کی آواز پہنچ گئی تھی۔ ان کے کرخت چہروں پر غصہ پھیل گیا۔ ''تم کیڑوں جیسے انسان، تم سلطان بابر تک ہماری شکایت پہنچاؤ گے۔ تمہاری جرأت کیسے ہوئی یہ سوچنے کی؟''

''تم دونوں اس وقت نشے میں ہو۔'' ایک بوڑھے نے رسان بھرے لہجے میں کہا۔ ''بہتر ہوگا اس وقت تم دونوں یہاں سے چلے جاؤ۔''

''ہم چلے جائیں؟'' منگول سپاہیوں نے اپنی چھوٹی چھوٹی آنکھیں نکال کر کہا۔ ''یہ شہر ہم نے فتح کیا ہے، اب یہ شہر ہمارا ہے۔''

''تم نے شہر فتح کیا ہے، مگر شہریوں کو نہیں خریدا۔'' دوسرے بوڑھے نے غصے سے جواب دیا۔ ''ہماری روحیں، ہمارے دل اور ہماری زبانیں آزاد ہیں۔''

''اوہ۔'' ایک منگول نے طنز بھرے لہجے میں کہہ کر اپنے ساتھی کی طرف دیکھا۔ ''تبدل خان۔ تم نے سنا، ان کی روح، دل اور زبان آزاد ہیں، اب تم ہی کہو ہمیں کیا کرنا چاہئے؟''

''ابھی یہ خود دیکھ لیں گے کہ ہم کیا کر سکتے ہیں۔'' دوسرے منگول نے [illegible] خنجر کھینچتے ہوئے کہا۔ پھر تیر کی تیزی سے سب سے آگے کھڑے بوڑھے کی طرف بڑھا۔ اس کا جبڑا دبا کر اس نے اس کی زبان باہر کھینچی اور خنجر کے ایک ظالمانہ وار سے اس کی زبان جڑ سے کاٹ دی۔ اس کے منہ سے خون کا فوارہ چھوٹ پڑا۔ وہ بڈھا تیورا کر زمین پر گرا اور مرغ بسمل کی طرح تڑپنے لگا۔ اس اثنا میں خنجر بہ کف منگول دوسرے بوڑھے کو زمین پر گرا کر اس کے سینے پر سوار ہو چکا تھا۔ اس نے خنجر سے نہایت بے رحمانہ انداز میں اس کا سینہ چاک کیا، اس کا دل باہر نکال لیا، پھر خنجر کے وار کر کے اس نے اس کے دل کے ٹکڑے کر دیئے تھے۔

اپنے ساتھیوں کے اس بربریت بھرے انجام کو دیکھتے ہوئے تیسرے بوڑھے کے چہرے پر ہوائیاں اُڑنے لگی تھیں۔ اس نے بھاگنے کے لئے پر تولے ہی تھے کہ دوسرے منگول نے اسے دبوچ لیا۔

''ابے تو کہاں بھاگتا ہے، ابھی تو تیری آزاد روح کو قید کرنا ہے۔'' دوسرے منگول نے تلوار نکال کر چشم زدن میں اس کا سر تن سے جدا کر دیا۔

تینوں بوڑھے خون وخاک میں لتھڑے زمین پر پڑے تھے۔ ذرا فاصلے پر ایک بوڑھے کا جواں سال بیٹا بصر کھڑا یہ سب منظر دیکھ رہا تھا۔ وہ چیختا ہوا ان کی جانب دوڑا مگر اس کے قریب پہنچنے سے پہلے ہی وحشی منگول اپنا کام دکھا چکے تھے۔ لوگوں نے بصر کو پکڑ لیا۔

اس کا ایک واقف کار علی موسیو دھیمے لہجے میں بولا۔ ''خود کو سنبھالو بصر، یہ منگول انسان نہیں وحشی درندے ہیں، تمہارے باپ اور اس کے دوستوں کی طرح لحظہ بھر میں یہ تمہیں بھی قتل کر دیں گے۔''

''تو…… تو…… کیا ہم اس ظلم اور بربریت کے خلاف کچھ نہیں کر سکتے؟'' بصر لوگوں کی گرفت سے آزاد ہونے کے لئے زور لگاتا ہوا چیخ کر بولا۔ ''میرا باپ میری آنکھوں کے سامنے قتل کر دیا گیا، میرے خدا، میں کیا کروں؟''

''سلطان بابر کا ایک سردار میرا واقف کار ہے۔'' علی موسیو دھیمی آواز میں بولا۔ ''سنا ہے سلطان بابر بے حد منصف اور نظم وضبط کا قائل سلطان ہے، اگر ہم اس تک ان وحشیوں کی شکایت پہنچانے میں کامیاب ہو گئے تو مجھے امید ہے کہ انہیں ان کے کئے کی سزا ضرور ملے گی۔''

علی موسیو، بصر اور چند اور لوگوں کو لے کر اس طرف چل دیا جہاں سلطان علی مرزا اور سلطان ظہیر الدین بابر کی فوجیں خیمہ زن تھیں۔

علی موسیو کا واقف کار سردار مغرب خان اتفاق سے اس وقت سلطان بابر کے خیمے میں موجود تھا۔ جب خادم نے اسے اطلاع پہنچائی کہ ایک شخص علی موسیو اپنے چند ساتھیوں کے ساتھ منگول سپاہیوں کی لوٹ مار اور بربریت کی شکایت لے کر آیا ہے۔

''منگول سپاہیوں کی شکایت؟'' سردار مغرب خان چونک کر بولا۔ ''بھلا کیا کیا منگول سپاہیوں نے؟''

''اگر اجازت ہو تو شکایت لے کے آنے والے صاحبان کو میں سلطان کی خدمت میں حاضر ہونے کا شرف عطا کر دوں؟'' خادم نے دھیمی آواز میں گزارش کی۔

''مگر اس وقت؟'' مغرب خان سلطان کے آرام کے ان لمحوں میں مخل ہونے کے خیال سے متذبذب ہوا۔

''اجازت ہے؟'' اس کے تذبذب کو محسوس کرتے ہوئے بابر نے گمبھیر آواز میں حکم دیا۔ منگول سپاہیوں کی لوٹ مار اور بربریت کا ذکر سنتے ہی اس کے چہرے پر غصہ آ گیا تھا۔ وہ دل سے منگولوں کو سخت ناپسند کرتا تھا۔

اگلے ہی لمحے بصر خان کے ساتھ علی موسیو اندر داخل ہوا۔

ساری بات سن کر بابر کے چہرے کا غصہ مزید بڑھ گیا۔ اس کی آنکھوں سے شعلے نکلنے لگے۔

''فوری طور پر ان وحشی منگولوں کو پیش کیا جائے۔'' اس کی پُرجلال آواز پر سپاہی دوڑ پڑے اور کچھ ہی دیر میں ان دونوں منگول سپاہیوں کو پکڑ کر سلطان کی خدمت میں پیش کر دیا گیا۔

''تمام منگول سپاہیوں کو جمع کر کے ان کے سامنے ان دونوں وحشی درندوں کو قتل کر کے ان کی بوٹی بوٹی کر دی جائے۔'' بابر نے سپاٹ آواز میں حکم دیا۔ ''میں اپنے لشکر میں اس طرح کی بربریت اور بدنظمی برداشت نہیں کر سکتا۔''

بابر کو ہمیشہ ہی اپنے سپاہیوں کے انضباط اور خود ضبطگی پر بڑا ناز رہا تھا۔ آج ان منگول غارت گروں کی وجہ سے اس کے ناز پر پہلی ضرب پڑی تھی۔

کچھ ہی دیر میں بابر کے حکم پر عملدرآمد کر دیا گیا۔

منگولوں کے اس وحشیانہ برتاؤ کی سزا انہیں دے دی گئی تھی، ان کی بوٹی بوٹی کر دی گئی تھی۔ گو کہ ان کے عبرتناک انجام سے منگول خوفزدہ ہو گئے تھے مگر دل ہی دل میں وہ بابر کے اس اقدام سے ناخوش ہوئے تھے اور انہوں نے دل میں ٹھان لی تھی کہ موقع ملتے ہی اس امر کا انتقام لیں گے۔

☆……☆……☆

قلعہ شیراز، قاسم دولدائی کے زیر تسلط تھا۔ بابر نے اس شہر کا انتظام ابراہیم سارو کے سپرد کر دیا۔ اگلے دن قاسم دولدائی، ویدلاغری، حسن خان، محمد سنبل اور محمد ولیس، اپنے خدام اور سپاہیوں کے ساتھ سلطان بابر کے حضور پیش ہوئے۔

''سلطان عالی قدر۔'' قاسم دولدائی نے قدرے دُہرا ہوتے ہوئے مؤدبانہ انداز میں عرض کی۔ ''ہم سلطان باستغر مرزا کے راہ فرار اختیار کرتے ہی اس سے الگ ہو گئے تھے، اب آپ کو اپنے سامنے موجود پایا تو اس موقع کو مبارک اور باعثِ خوش بختی محسوس کر کے آپ کی خدمت میں حاضر ہو گئے ہیں۔ ہمیں ملازمت عطا کر کے خدمت گزاری کا موقع فراہم کر دیجئے۔ آقا ہم آپ کے بے حد شکر گزار ہوں گے۔''

نوجوان بابر نے شہر شیراز کے نئے منتظم ابراہیم سارو کی طرف دیکھ کر پوچھا۔ ''کیا کہتے ہیں، ابراہیم سارو؟ کیا ان لوگوں پر اعتبار کیا جا سکتا ہے؟''

''سلطان معظم!'' ابراہیم سارو نے مؤدبانہ عرض کی۔ ''اگر یہ قابل اعتبار ثابت نہ ہوئے تو خود اپنے لئے نقصان دہ ثابت ہوں گے۔ میرا خیال ہے کہ انہیں خدمت کا ایک موقع ضرور ملنا چاہئے۔''

شیراز کے سابقہ منتظم قاسم دولدائی نے مشکور نظروں سے قاسم سارو کی طرف دیکھا اور احترام بھرے انداز میں سر جھکا لیا۔

☆……☆……☆

اب بابر کی اگلی منزل، اس کے جد امجد تیمور کا شہر سمرقند تھا۔

بابر نے لشکر کو نئے سرے سے تیار کرنے کا حکم دیا۔ بابر کے انتظام اور لشکریوں پر زبردست گرفت کی وجہ سے شہری رفتہ رفتہ اس فوج بلاخیز سے مانوس ہوتے جا رہے تھے۔ کچھ مسلمان تجار منافع کی امید پر لشکرگاہ میں اپنا تجارتی سامان فروخت کرنے کے لئے لانے لگے تھے۔ لشکریوں خاص طور پر منگول سپاہیوں کو توقع تھی کہ شہر کے فتح ہوتے ہی وہ شہر پر ٹوٹ پڑیں گے۔ خوب لوٹ مار کر کے مال غنیمت کے ڈھیر لگا لیں گے مگر بابر نے اس امر کو سختی سے ممنوع قرار دے دیا تھا۔ کوئی ایک تنکا بھی نہ اٹھا سکا تھا۔

سپاہ اپنے سلطان کا حکم ماننے پر مجبور تھی۔ مگر منگول سپاہی اس کڑے نظم وضبط سے عاجز وبیزار ہو چکے تھے۔ چنانچہ ایک دوپہر لشکرگاہ میں آنے والے تجار پر دھاوا بول دیا۔ کسی بھی تاجر کے پاس کچھ نہ چھوڑا، سب کچھ لوٹ لیا۔

اس اجمال کی اطلاع سلطان بابر تک پہنچی تو غصے سے اس کا چہرہ سرخ ہو گیا۔

''حسن شیر! میں پوچھتا ہوں آخر یہ سب کیونکر ہوا؟'' اس نے آگ بگولہ ہوتے ہوئے لشکرگاہ کے منتظم سردار حسن شیر سے دریافت کیا۔

''میرے آقا۔'' حسن شیر نے بھیگے بلے کی طرح خوف زدہ ہو کر گڑگڑاتے لہجے میں کہا۔ ''یہ سب کچھ، کچھ عاقبت نااندیش منگول سپاہیوں کی ہوس خیزی کے باعث ہوا۔ اس بدانتظامی کے لئے میں آپ سے بے حد شرمندہ ہوں اور اس سانحے کی تلافی کا وعدہ کرتا ہوں۔''

''حسن شیر۔'' بابر نے سر جھکائے اور خوف سے زرد پڑتے سردار کی طرف شعلے برساتی نظروں سے دیکھا۔ ''جاؤ اور منگول سپاہیوں کو حکم دو کہ اگلے دن کا پہلا پہر شروع ہونے سے پہلے لوٹی ہوئی ہر چیز واپس کر دیں۔ حتیٰ کہ روئی کا ایک گالا اور ٹوٹی ہوئی سوئی کی ایک نوک بھی فوج کے کسی آدمی کے پاس نہ رہے۔ سب کچھ ان کے مالکوں کے پاس پہنچ جائے۔''

بابر کی فوج کا نظم وضبط اس اعلیٰ پائے کا تھا کہ اگلے دن کا پہلا پہر بھی نہ گزرا تھا کہ لوٹا ہوا سامان ان کے مالکوں کو لوٹا دیا گیا۔

اب بابر کا رخ سمرقند کی طرف تھا۔ کوچ کے بعد بابر کا لشکر یورت خان کے مقام پر پڑاؤ انداز ہوا۔ یہ مقام سمرقند سے تین کوس کے فاصلے پر تھا۔

پڑاؤ کے اگلے دن ہی ابراہیم بیگ نے دھاوا بولا۔ خیابان کے مقام پر زبردست معرکہ آرائی ہوئی۔ ابراہیم بیگ خود بھی زخمی ہوا۔

چند دن بعد نواح برناؤ میں لڑائی لڑی گئی۔ بابر کے سردار میر شاہ قوچین نے شمشیر زنی کے زبردست جوہر دکھائے۔ وہ لڑتا ہوا دشمن کی صف میں جا گھسا اور پھر اچانک ایک تلوار اس کی گردن میں آ لگی۔ وار کچھ اس طرح کا تھا کہ اس کی آدھی گردن کٹ گئی، تاہم شہ رگ بچ گئی تھی۔

بابر میر شاہ قوچین کے اس طرح شدید زخمی ہونے پر خاصا فکرمند ہوا۔ وہ اپنے لائق سپہ سالاروں اور دلیر سپاہیوں کی دل سے قدر کرتا تھا۔

اسی رات اس نے اپنے چیدہ چیدہ اور قابل اعتبار سرداروں کو اپنے خیمے میں طلب کر کے اس صورت حال پر مشاورت کی۔

''مہینے سے اوپر ہو گیا۔'' اس نے متفکر لہجے میں اپنے سرداروں کو مخاطب کیا۔ ''لڑائی بھی چل رہی ہے، مقابلے بھی جاری ہیں مگر حاصل وصول کچھ نہیں۔ ہمارے جوان اور سردار زخمی ہو رہے ہیں اور جان سے جا رہے ہیں۔''

''بجا فرما رہے ہیں آپ۔'' عمر رسیدہ اور لائق سپہ سالار عمر فراز تاش سر جھکا کر افسردہ مگر تائید بھرے لہجے میں بولا۔ ''اب ہمیں ان چھوٹی موٹی معرکہ آرائیوں سے کچھ آگے سوچنا ہوگا۔''

تب ہی خیمے کے دروازے پر ایستادہ نیزہ بردار خادم نے اندر جھانک کر مؤدبانہ عرض کی۔ ''ایک خبر رساں سلطان محترم سے ملاقات کا متمنی ہے۔''

سلطان بابر نے چونک کر اپنے سپہ سالاروں کی طرف دیکھا۔ سب کی آنکھوں میں خبر رساں کو اندر طلب کر لینے کا عندیہ پا کر سلطان نے سر کی جنبش سے اسے اندر بھیجنے کا اشارہ کیا۔ اگلے ہی لمحے ایک نوجوان مؤدب ومہذب انداز میں اندر داخل ہوا۔ اس نے گھٹنوں کو خم دے کر سلطان کو تعظیم پیش کی۔ پھر تقریباً دُہرا ہوتے ہوئے عرض کی۔ ''سلطان معظم، سمرقندیوں نے اپنا ایک نمائندہ میرے پاس بھیجا ہے۔ میں اسے اپنے ساتھ لایا ہوں، وہ آپ کی خدمت میں کچھ عرض کرنا چاہتا ہے۔''

سلطان کی رضامندی پا کر خبر رساں تیزی سے باہر کی جانب پلٹا۔ اگلے ہی لمحے وہ ایک ادھیڑ عمر، باوقار اور سنجیدہ سے سمرقندی کو ساتھ لئے اندر داخل ہوا۔

''سلطان عالی مقام۔'' آنے والے سمرقندی نے جھک کر بابر کو تعظیم پیش کی۔ ''ہم سب اہل سمرقند اس روز روز کی جنگ وجدال سے تنگ آ چکے ہیں، سب نے مجھے اپنا نمائندہ بنا کر آپ کے پاس بھیجا ہے تاکہ میں آپ سے گزارش کر سکوں کہ آج رات، رات گہری ہوتے ہی آپ اپنے جید سرداروں اور سپاہیوں کو غار عاشقاں کی طرف بھیجئے، ہم قلعہ ان کے حوالے کر دیں گے۔''

سمرقندی کے جانے کے بعد بابر اور اس کے سپہ سالار دیر تک اس کی اس پیشکش کے بارے میں سوچتے رہے اور بہت غور وخوض کے بعد بابر نے غار عاشقاں کی طرف جانے کا فیصلہ کر لیا۔

''سلطان معظم۔'' بہت کم عمری سے محل میں پرورش پانے والا سپہ سالار محمود کوہ سنگ نے دھیمی مگر خدشوں سے پُر آواز میں گزارش کی۔ ''اس دعوت پر آپ تشریف نہ لے جائیں، میں اپنے ساتھ چند وفاداروں کو لے کر غار عاشقاں جاتا ہوں، ہو سکتا ہے یہ دعوت کسی فریب پر مبنی ہو۔''

''کوہ سنگ درست کہہ رہے ہو۔'' بوڑھے سردار حاجی بگول نے تائید بھرے انداز میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ''میرا بھی یہی مشورہ ہے کہ محض چند لوگوں کو ہی اس طرف جانا چاہئے۔''

بابر نے بزرگوں کے مشورے پر سر جھکا دیا۔

☆……☆……☆

اس رات شام سے ہی آسمان پر سیاہ بادل گھر گھر کر آ رہے تھے، جس کے باعث رات کی سیاہی میں کچھ اور اضافہ ہو گیا تھا۔ ایسے میں سات گھڑ سوار اور پانچ پیدل سپاہی پل سفاک سے گزر کر مقام موعود کے قریب جا ٹھہرے۔ ہر طرف موت کا سا سکوت تھا۔ آنے والے چوکنا اور مستعد تھے۔ ان کی نگاہیں قلعے کے ذیلی دروازے کی سمت لگی تھیں، تب ہی پچھلی جانب واقع خاکستری پہاڑیوں میں چھپے بیٹھے دشمن کے سپاہی ایک دم گھڑ سواروں اور پیدل سپاہیوں کی طرف لپکے۔

اندازہ ہوتے ہی گھڑ سواروں نے گھوڑوں کو ایڑ لگائی اور واپسی کے لئے پلٹ گئے تھے مگر پیادہ سپاہیوں کو انہوں نے پکڑ لیا اور چشم زدن میں سب کو موت کے گھاٹ اتار دیا۔

سمرقندیوں کی اس فریب کاری کی وجہ سے بابر کو اپنے کئی وفادار اور دلیر سپاہیوں سے ہاتھ دھونے پڑے تھے۔ اس کے چہرے پر جلال اور آنکھوں میں ملال لرزاں تھا۔

''میں جلد اپنے وفاداروں کا بدلہ ان غداروں سے لوں گا۔'' بابر نے کرب بھرے انداز میں آنکھیں بند کرتے ہوئے رنجور سے انداز میں کہا۔

☆……☆……☆

شہر سمرقند کے محاصرے کو سات مہینے بیت چکے تھے۔ پورے موسم گرما میں فوجی کارروائیاں جاری رہی تھیں اور قلعہ بند فوج کی حالت رفتہ رفتہ دگرگوں ہوتی جا رہی تھی۔ مد مقابل کے حملوں کا مقابلہ کرنے کی صلاحیت اور ہمت دن بہ دن روبہ زوال تھی۔ پہلے وہ قلعے سے نکل کر محاصرین پر حملہ آور ہونے کا حوصلہ کرتے تھے۔ مگر پھر پے در پے پسپائی کے بعد وہ فصیل ہی میں قید ہو کر رہ گئے تھے۔

''اشیائے خورد ونوش بھی رفتہ رفتہ ختم ہوتی جا رہی ہیں۔'' سلطان باستغر مرزا کے مشیر خاص ابو اغلا طمش نے دھیمی آواز میں شہر کے حالات کے بارے میں بیان کرتے ہوئے کہا۔ ''عوام کا حوصلہ دن بہ دن پست ہوتا جا رہا ہے۔ لوگ مایوس اور بددل ہوتے جا رہے ہیں۔''

''ہوں۔'' باستغر مرزا نے ادھ کھلے دریچے سے آسمان کی طرف دیکھتے ہوئے، مایوس سے انداز میں ہنکارا ابھرا۔ ''میں خود بھی حالات کی نزاکت کو سمجھ رہا ہوں، بہتری کی امید بھی رفتہ رفتہ دم توڑتی جا رہی ہے۔''

''سلطان عالی قدر! تو ایسے میں ہمیں کیا کرنا چاہئے؟'' مشیر نے خائف اور متوحش لہجے میں سوال کیا۔

''تم دیکھ رہے ہو طمش۔'' باستغر مرزا نے دریچے کی طرف پشت کرتے ہوئے ابو اغلا طمش کی طرف دیکھا۔ ''میرے اپنے خاندان والے ہی میری مدد سے گریزاں ہیں۔ میرا سگا بھائی علی مرزا میرا دشمن بنا ہوا ہے اور میرا چچیرا بھائی ظہیر الدین بابر لشکر لئے میرے شہر کا محاصرہ کئے ہوئے ہے۔'' سلطان باستغر مرزا کے لہجے سے شکستگی اور دل گرفتگی کا اظہار ہو رہا تھا۔

وہ کئی لمحوں تک سر جھکائے کچھ سوچتا رہا تھا، پھر گہری سانس لے کر بولا۔ ''اب ایک ہی راستہ رہ گیا ہے۔ آخری کوشش کے طور پر میں ترکستان کے گورنر شیبانی خان سے مدد کی درخواست کرنے کا ارادہ کر رہا ہوں۔''

''شیبانی خان؟'' ابو اغلا طمش نے چونک کر سر اٹھایا اور قدرے گھبرائے ہوئے لہجے میں بولا۔ ''سلطان معظم! میں نہیں سمجھتا کہ شیبانی خان اس مشکل وقت میں ہمارے کام آ سکتا ہے۔ وہ ایک خود غرض اور مفاد پرست انسان ہے۔ بہت ممکن ہے کہ وہ خود سمرقند حاصل کرنے والوں کی صف میں آ کھڑا ہو۔''

''خدا نہ کرے جو ایسا ہو۔'' باستغر مرزا نے دہل کر کہا۔ ''مگر اب تم ہی بتاؤ ہمارے پاس دوسرا اور کون سا راستہ ہے؟''

''آپ جیسا مناسب سمجھیں۔'' بوڑھے مشیر نے سر جھکاتے ہوئے کہا۔

باستغر مرزا کی آنکھوں سے جھانکتی سوچ کچھ اور گہری ہو گئی تھی۔ وہ خود بھی شیبانی خان سے مدد مانگنے کے حق میں نہ تھا۔ وہ اسے اچھی طرح جانتا تھا۔ وہ گو کہ ایک شہزادہ تھا جس نے شمال مغربی صحرا کے خانہ بدوش ازبک قبیلوں کو ایک مضبوط گروہ میں تبدیل کر دیا تھا۔ شیبانی خان ایک لالچی، خود غرض اور حرص کا بندہ تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ مواقع ملتے ہی اسی لئے ہیں کہ عقلمند ان سے بھرپور استفادہ کر سکیں۔ جو لوگ موقع سے فائدہ نہیں اٹھاتے، وہ احمق اور ناکام لوگ ہوتے ہیں۔

سلطان باستغر مرزا شیبانی کی فطرت، عادات اور حرکات سے اچھی طرح واقف تھا۔ اس کے باوجود وہ اسے مدد کے لئے آواز دینے پر مجبور ہو گیا تھا۔ اس کے سوا اور کوئی راستہ بھی تو نہ تھا۔ سو اس نے اگلے ہی دن اپنے ایک خاص آدمی عین الحق مریری کو شیبانی کی طرف روانہ کیا۔

شیبانی نے شمالی مغربی صحرا کے خانہ بدوشوں کو جوڑ کر ایک سلطنت کی بنیاد رکھی تھی۔ مگر یہ نوزائیدہ سلطنت اپنے وحشی اور قدامت پرست عناصر ترکیبی کی دشمنی اور رقابت کے باعث تباہ ہو گئی تھی اور اپنے خاندان کی آخری امید شیبانی خان کو اپنے برے دنوں میں وطن سے باہر ملازمت تلاش کرنا پڑی۔ وفادار ساتھیوں کی ایک مختصر جماعت کے ساتھ کبھی وہ ایک حکمران اور کبھی دوسرے حکمران کو اپنی خدمات فروخت کرتا رہا اور اس دوران جوں جوں موقع ملتا رہا، وہ اپنے ذرائع بڑھاتا رہا اور اپنے مفادات کے حصول میں بے ضمیری اور بے رحمی سے مصروف رہا۔ سرکی جنگ میں اس نے اپنے حکمران سلطان احمد مرزا کو دھوکا دیا تھا اور اس دغابازی پر بطور انعام خاقان اعظم نے اسے ترکستان کا گورنر بنا دیا تھا۔ اسی وقت سے وہ عمومی طور پر آل تیمور اور خصوصی طور پر ظہیر الدین بابر کے ایک زبردست دشمن کی حیثیت سے نمایاں ہوا۔ اس کی طاقت، چالاکی اور بے رحمی نے اسے انتہائی خطرناک اور خوفناک حریف بنا دیا تھا۔

جب باستغر مرزا کا نمائندہ شیبانی خان کے پاس پہنچا تو وہ گہری سوچ میں ڈوب گیا۔ ایک طرف باستغر مرزا تھا، ایک نااہل اور قدرے بے وقوف حکمران جو حسن کی رعنائیوں میں ڈوب کر چین کی بانسری بجانے کا خواہاں تھا تو دوسری طرف بابر تھا۔ آل تیمور کا ایک نمایاں نام جس نے چھوٹی سی عمر میں کتنے ہی معرکے سر کر لئے تھے اور آج ایک بڑا لشکر لئے سمرقند کا محاصرہ کئے ہوئے تھا۔

یہ سچ تھا کہ شیبانی خان کو بابر سے بے حد کدورت اور نفرت تھی۔ اس کی ایک وجہ یہ تھی کہ اس نے اسے ہمیشہ ہی تر نوالہ سمجھا تھا مگر کوشش کے باوجود آج تک وہ اسے کھا نہ سکا تھا۔ مگر وہ دلی طور پر یہ شدید تمنا رکھتا تھا کہ کسی بھی طرح بابر کو شکست وریخت سے دوچار رکھا جائے۔ وہ فرغانہ کے کم عمر والی کے لئے ایک ناقابل تسخیر دیوار بن جانا چاہتا تھا مگر اس پل جبکہ موسم سرما کی آمد آمد تھی، وہ اپنے لشکر کو سمرقند کے سرد میدانوں میں لے جانے سے ہچکچا رہا تھا۔

شیبانی خان کی سوچ بچار میں وقت لگا تو باستغر مرزا نے اپنا ایک اور ایلچی ولد خان اس کی خدمت میں بھیج دیا۔ محض ستائیس دنوں میں باستغر مرزا نے تیرہ ایلچی شیبانی کے پاس بھیجے اور اس سے مدد کے لئے درخواست کی۔ شیبانی خان، سلطان باستغر مرزا کی پریشانی کو سمجھ رہا تھا۔ چنانچہ بہت غور وخوض اور سوچ بچار کے بعد اس نے سلطان باستغر مرزا کی مدد کا فیصلہ کر لیا تھا۔

ادھر بابر نے سردیوں کی آمد کے پیش نظر اپنے مشیروں اور صلاح کار امیروں سے مشورے کے بعد یہ طے کیا تھا کیونکہ سمرقند کی فتح یقینی ہے، چند دنوں کی اور بات ہے، آخر کار فتح ہمارا مقدر ہوگی۔ مگر کیونکہ جاڑا شروع ہونے والا ہے، اس لئے کھلے میدانوں میں رہنا مشکل اور تکلیف دہ ہوگا، چنانچہ شہر کے باہر کھلے میدان میں پڑے رہنے سے بہتر ہے کہ کسی قلعہ کو سردیوں کا مستقر بنا لیا جائے۔ سو اس سلسلے میں قلعہ قشلاق کا انتخاب کیا گیا تھا۔ چنانچہ تمام سپاہ کھلے میدانوں سے خواجہ دیدار کے قلعے میں منتقل ہو گئی۔ قلعہ میں سپاہیوں کی رہائش کے لئے مکانات وغیرہ بنانے کے لئے مقامات تجویز کئے گئے۔ راج، مزدور اور منتظم مقرر کئے گئے۔ مکانات کی تعمیر شروع ہو گئی۔ جیسے ہی مکانات تیار ہوئے، بابر اپنا لشکر لے کر اس قلعے میں منتقل ہو گیا۔

جس وقت شیبانی خان اپنا لشکر لئے سلطان باستغر مرزا کی مدد کی خاطر سمرقند کے نواح میں پہنچا تو بابر کے لشکر کو تتر بتر پایا۔ موسم سرما کے مکانات میں منتقل ہونے کی فکر میں کچھ لوگ رباط خواجہ، کچھ لوگ کانہ اور کچھ شیراز گئے ہوئے تھے۔

مگر بابر کو جوں ہی شیبانی خان کی آمد کی خبر ہوئی، اس نے سپاہ کو یکجا کر کے صفیں درست کیں۔ اسی دوران بابر کو اطلاع ملی تھی کہ جن شریر سرداروں نے بابر کے لوگوں کو قلعہ حوالے کر دینے کا جھانسہ دے کر غار عاشقاں بلوا کر دھوکے سے قتل کر دیا تھا، ان میں سے چند سردار سمرقند سے فرار کی نصف شب کے وقت قلعے کے چور دروازے سے نکلیں گے۔ یہ خبر بابر کے سینے میں انتقام کی آگ لگا گئی تھی۔ ان دھوکے باز سرداروں نے اس سے اس کے بہترین سپاہی چھین لئے تھے اور اس وقت وہ انہیں سزا دیئے بغیر سکون سے نہیں بیٹھ سکتا تھا۔ گو کہ سر پر شیبانی خان کھڑا تھا۔ مگر پھر بھی بابر نے قلعے کے چور دروازے پر ہلہ بولنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔

(جاری ہے)

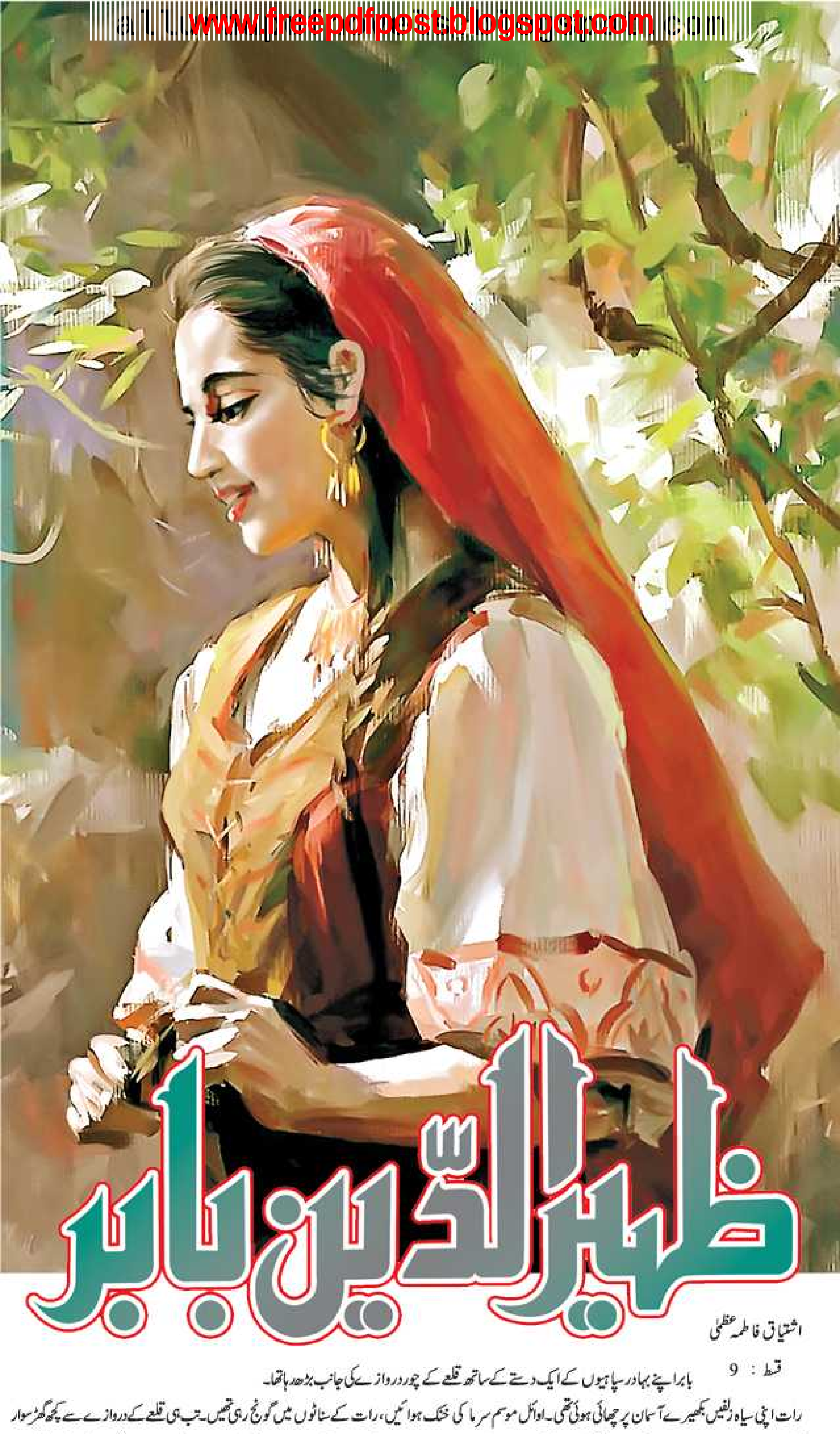

ظہیرالدین بابر

اشتیاق فاطمہ عظمٰی

قسط : 9

بابر اپنے بہادر سپاہیوں کے ایک دستے کے ساتھ قلعے کے چور دروازے کی جانب بڑھ رہا تھا۔

رات اپنی سیاہ زلفیں بکھیرے آسمان پر چھائی ہوئی تھی۔ اوائل موسم سرما کی خنک ہوائیں، رات کے سناٹوں میں گونج رہی تھیں۔ تب ہی قلعے کے دروازے سے کچھ گھڑسوار باہر نکلے۔ یہ وہ سردار تھے جنہوں نے کچھ عرصے قبل ایک پُرفریب پیغام کے ذریعے بابر اور اس کے سپاہیوں کو غارِ عاشقاں کی طرف آنے کی دعوت دی تھی۔ جس کے نتیجے میں بابر کو اپنے کچھ بہترین سپاہیوں کی زندگی سے ہاتھ دھونے پڑے تھے۔

رات کے ان تاریک لمحوں میں بابر ان شریر سرداروں کو ان کے کئے کی سزا دینے آیا تھا۔ سمرقند کے سردار جوں ہی قلعے کے چور دروازے سے باہر نکلے، بابر نے اپنے بہادر سپاہیوں کے ساتھ ان پر دھاوا بول دیا۔

انہیں اس حملے کا گمان تک نہ تھا۔ وہ تو قلعے کے حالات سے تنگ آ کر بخارا کی طرف راہِ فرار اختیار کرنے کی خاطر قلعے سے نکلے تھے جبکہ قلعے کے دروازے پر بابر کی صورت ان کی موت کھڑی تھی۔ دیکھتے ہی دیکھتے ان سرداروں کو اپنے کئے کی سزا مل گئی تھی۔

اس کام سے فارغ ہو کر بابر اپنے ساتھیوں کے ساتھ اپنے ٹھکانے کی طرف روانہ ہو گیا تھا۔

ادھر شیبانی خان کو سلطان باسنغر مرزا کے پیغام پر پیغام مل رہے تھے، مدد کی درخواست پر درخواست کی جا رہی تھی۔ بالآخر شیبانی نے مجبور ہو کر سمرقند کی طرف کوچ کا فیصلہ کر لیا۔

’’خان! سنا ہے علی مرزا اور ظہیرالدین بابر کے پاس وسیع لشکر اور وافر ہتھیار موجود ہیں۔ بابر اپنے منظم و مرتب لشکر کا بہترین سپہ سالار مانا جاتا ہے، ایسے میں ہمارا اس کے مدمقابل جانا کیا مناسب ہوگا؟‘‘ شیبانی خان کے دست راست نور بدر تابانی نے دبے دبے لہجے میں اپنے خیالات کا اظہار کیا۔

’’تابانی۔‘‘ شیبانی حسب عادت عیاری سے مسکرایا۔ ’’تم جانتے ہو شیبانی خان نے کبھی گھاٹے کا سودا نہیں کیا...... چلتے ہیں، چل کر دیکھتے ہیں کہ صورت حال کیا ہے۔ جنگ کرنے یا نہ کرنے کا فیصلہ میدان جنگ میں جا کر کریں گے۔‘‘

’’بہت خوب۔‘‘ تابانی کے متفکر چہرے پر اطمینان بھری مسکراہٹ بکھر گئی تھی۔

شیبانی خان اپنا لشکر لے کر منزل پر منزل مارتا سمرقند کے نواح میں آٹھہرا۔ اپنے تئیں اس نے سوچا تھا کہ اس کی یوں اچانک آمد پر بابر کے سپاہی بدحواس ہو اٹھیں گے اور وہ محاصرین پر اچانک حملہ آور ہو کر بابر اور اس کے لشکر کو تتر بتر کر دے گا مگر یہاں آ کر وہ لمحہ بھر کو بھونچکا رہ گیا تھا۔

بابر کی فوج میں اس قدر نظم و ضبط اور حوصلہ و ولولہ تھا کہ وہ اس لشکرِ جرار پر حملہ کرنے کی جرأت نہ کر سکتا تھا۔

اُدھر جوں ہی باسنغر مرزا کو شیبانی کی آمد کی خبر ہوئی تو اس کے ڈوبتے دل کو خاصی تقویت ملی تھی۔ اس نے فوری طور پر ایک قاصد کو شیبانی کے پاس بھیجا۔

’’سلطان چاہتے ہیں کہ آپ جنوب کی طرف سے بابر پر حملہ کریں اور مشرق کی طرف سے سلطان پیش رفت کریں گے۔ یوں دو اطراف سے بھرپور حملے کے سامنے بابر کا حوصلہ جھاگ کی طرح بیٹھ جائے گا۔‘‘ پیام پا کر شیبانی نے پُرسوچ نظروں سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔ ’’قلعے کے اندر فوج کی کیا حالت ہے؟‘‘

’’بہت بری حالت ہے۔‘‘ پیامبر بے ساختہ بولا۔ ’’چھ مہینوں کے سخت محاصرے نے قلعے کے اندر قحط کی سی صورت پیدا کر دی ہے۔ سپاہیوں کے پیٹ خالی اور تن لباس سے عاری ہیں۔ انتہائی ناگفتہ بہ حالت ہے۔‘‘

’’ہوں۔‘‘ شیبانی نے پُرسوچ انداز میں ہنکارا بھرا اور اپنے مشیر خاص نور بدر تابانی کی طرف معنی خیز نظروں سے دیکھا۔

’’کیا کہتے ہو تابانی؟ اس صورت میں کیا ہمیں محاصرین پر حملہ کرنا چاہئے؟‘‘

’’میرا نہیں خیال کہ یہ حملہ سودمند ثابت ہوگا۔‘‘ تابانی نے بلاتردد جواب دیا۔

’’بابر، باسنغر مرزا اور اس کے قلعے کے اندرونی حالات سے یقیناً باخبر ہوگا۔ اسے پتا ہے کہ قلعے کی سپاہ کے پاس حملے کی طاقت نہیں، اس لئے وہ اپنی پوری قوت ہمارے حملے کو روکنے پر صرف کر دے گا اور اس طرح ہمیں بہت زیادہ نقصان پہنچنے کا احتمال ہے۔‘‘

’’تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔‘‘ شیبانی نے مطمئن انداز میں ہلکی مسکراہٹ سے جواب دیا۔ پھر وہ پیامبر سے مخاطب ہوا۔ ’’اپنے سلطان سے کہو اس وقت بابر کی فوج سے جنگ کرنا دانش مندی نہیں ہوگی۔‘‘

☆......☆......☆

’’دانش مندی۔‘‘ شیبانی کا جواب سن کر باسنغر مرزا کا چہرہ غصے سے بگڑ گیا۔ ’’وہ صحرائی گدھا آج یہاں سمرقند کے دروازے پر بیٹھ کر دانش مندی کی بات کر رہا ہے۔ اگر اسے بابر کی فوج کا ایسا ہی خوف تھا تو یہاں آنے کی ضرورت کیا تھی۔‘‘

’’غلطی ہوئی۔‘‘ باسنغر مرزا کی بات جب شیبانی خان تک پہنچی تو اس کی بھنویں نخوت سے تن گئیں۔ ’’مجھے باسنغر مرزا جیسے ناشکرے اور بدمزاج انسان کی گزارش پر یہاں آنا ہی نہیں چاہئے تھا۔ خیر اب بھی کچھ نہیں بگڑا، میں اپنی فوج لے کر آج ہی واپسی کے لئے روانہ ہو جاؤں گا۔‘‘

’’بلاوجہ اتنا طویل سفر کیا۔‘‘ تابانی افسردگی سے سر ہلا کر بولا۔

’’نہیں تابانی۔‘‘ شیبانی خان مسکرایا۔ ’’یہ سفر بیکار نہیں گیا۔ یہاں آ کر مجھے اندازہ ہوا کہ سمرقند پھلوں اور پھولوں سے بھرا شہر، اگر نوعمر بابر فتح کرنے کی ہمت کر سکتا ہے تو ہمارے سپاہیوں کی تلواروں کو زنگ تو نہیں لگا، ہم ایک بار پھر یہاں آئیں گے اور پوری شان سے سمرقند پر قابض ہوں گے۔‘‘

شیبانی کی واپسی کی خبر نے باسنغر مرزا کی رہی سہی ہمت بھی توڑ دی۔ محاصرے کو سات مہینے گزر چکے تھے اور وہ زیادہ عرصے تک مقابلہ نہیں کر سکتا تھا۔ چنانچہ باسنغر مرزا نے وہی راستہ چنا جو اس وقت ممکن تھا۔ وہ اپنے چند نیم فاقہ زدہ ساتھیوں کو لے کر ایک رات چپکے سے محل سے نکل گیا اور اپنے سابق وزیر خسرو خان کے پاس قندز میں پناہ کی امید لئے جا پہنچا۔

باسنغر مرزا کے فرار کے بعد اب بابر کی زندگی کے سب سے سہانے خواب کے شرمندۂ تعبیر ہونے میں کوئی شے حائل نہ تھی۔ وہ لشکر گاہ سے نکل کر اپنے آباؤ اجداد کے شہر کی جانب روانہ ہوا۔ شہر کے دروازے کھول دیئے گئے تھے۔

ظہیرالدین بابر کے استقبال کے لئے امراء اور سردار سر جھکائے مؤدب و مستعد کھڑے تھے۔ بابر شاہانہ وقار کے ساتھ سمرقند اور اس کے مضافات پر قابض ہو گیا۔

اس کے بہی خواہ علی مرزا نے بخارا فتح کر لیا تھا۔

سمرقند کی فتح بابر کی دیرینہ آرزو کی تکمیل تھی۔ اس کی خوشی کی انتہا نہ تھی۔ تیمور کا یہ شہر اس کے خوابوں کا شہر تھا۔ اس کے شاندار محلات، مساجد، باغات، مدارس اور فصیلیں، یہ سب اس کے لئے خوش کن اور دل آویز تھے۔ سمرقند کی فتح اس کی زندگی کی تمام فتوحات پر بھاری تھی۔

گو کہ فتح خوش آئند تھی مگر حالات دگرگوں تھے۔ بابر کے لئے اپنی نئی رعایا اور پرانے سپاہیوں کو ایک ساتھ مطمئن کرنا ناممکن تھا۔ دونوں ہی طویل محاصرے سے بدحال و بے دم ہو چکے تھے۔ لوٹ مار کی ممانعت فوجیوں کے لئے ناقابل برداشت تھی۔ انہوں نے اپنی تنخواہوں کے لئے ہنگامہ شروع کر دیا۔ نیم فاقہ زدہ شہر سے رقم اور مال غنیمت کی امید عبث تھی۔ بابر کے سپاہی گروہ در گروہ اس کا ساتھ چھوڑ کر اندجان جانے لگے۔

ادھر بابر اوزن حسن کو اندجان کا حاکم بنا کر چھوڑ آیا تھا۔ اس نے بابر کے باغی سپاہیوں کو نا صرف پناہ دی بلکہ یہ مطالبہ بھی سامنے رکھ دیا کہ اندجان اور آخشی کے شہر بابر کے بھائی جہانگیر کے حوالے کر دیئے جائیں۔ یہ لوگ چھوٹے شہزادے کو اپنے مفادات کے حصول میں ایک آلۂ کار کے طور پر استعمال کرنا چاہتے تھے۔

بابر کے انکار پر اوزن حسن نے فوج تیار کی اور اندجان کے قلعے کا محاصرہ کر لیا۔ وفادار فوج علی دوست طغائی کی سربراہی میں مقابلے پر ڈٹ گئی لیکن بابر کو فوری پیغام بھیجا۔

’’آپ نے سمرقند، اندجان کی طاقت سے لے لیا ہے، اگر اندجان آپ کے ہاتھ میں رہا تو سمرقند پر دوبارہ بھی قبضہ کیا جا سکتا ہے۔‘‘

انہی دنوں بابر خارش اور پھوڑوں کی ایک موذی بیماری میں مبتلا ہو گیا تھا۔ اس کا سارا جسم پانی بھرے آبلوں سے بھر گیا تھا۔ حتیٰ کہ منہ میں بھی چھالے تھے جن کے باعث وہ کچھ کھا پی نہ پاتا تھا۔ طبیب روئی بھگو کے اس کے منہ میں پانی ٹپکایا کرتے۔ دن بہ دن وہ کمزور و لاغر ہوتا جا رہا تھا۔ اس کے سب ساتھی امراء و بہادر سردار اس کی زندگی سے مایوس ہو کر اپنے بارے میں سوچنے پر مجبور ہو گئے تھے۔

باغیوں کو جونہی بابر کی بیماری کی خبر پہنچی تو انہوں نے سن گن لینے کے لئے ایک جاسوس کو روانہ کیا۔ جاسوس نے جا کر اطلاع دی کہ سلطان بابر بستر مرگ پر ہے۔ یہ خبر پاتے ہی قلعہ بند فوج کے حوصلے جواب دے گئے اور انہوں نے ہتھیار ڈال دیئے۔

چند ہی دنوں میں بابر کی طبیعت سنبھل گئی۔ دیکھتے ہی دیکھتے وہ تندرست ہوتا چلا گیا...... مگر شاید اب بہت دیر ہو چکی تھی۔ وہ جونہی اندجان کی طرف بڑھا، پتا چلا اس کی سلطنت دشمنوں کے قبضے میں جا چکی ہے۔ اس کے سمرقند سے نکلتے ہی سمرقند بھی اس کے ہاتھ سے نکل گیا تھا۔ دشمنوں نے اس کے چچازاد بھائی علی مرزا کو بخارا سے بلا کر سمرقند اس کے حوالے کر دیا تھا۔

بابر کے پاس اب صرف ایک چھوٹا سا فوجی کیمپ رہ گیا تھا۔ اس نے اپنے ماموں خاقان محمود خان سے مدد کی درخواست کی۔ محمود خان فوج لے کر اس کی مدد کو آموجود ہوا۔ وہ محمود خان کی فوج کے ساتھ اپنے سپاہی لے کر آخشی کی طرف بڑھا ہی تھا کہ محمود خان نے اچانک ہی نگاہیں بدل لیں اور اپنی فوج لے کر اپنے بھانجے کا ساتھ چھوڑ کر واپس چلا گیا۔

اب بہت سخت حالات کا سامنا تھا۔ ایک ایک کر کے بابر کے سپاہی کھسکنے لگے۔ یہاں تک کہ صرف چند سو وفادار جو ہر مصیبت اور شکست میں اس کے ہم قدم رہے تھے، رہ گئے۔

اوپر نیلا بے رحم آسمان تھا اور نیچے سخت سنگ دل زمین...... ہر طرف مایوسی اور بے یقینی کی کیفیت پھیلی ہوئی تھی۔ بابر کی پُرعزم آنکھیں مایوسی کے اشکوں میں ڈوب گئی تھیں۔ اس وقت اسے اپنی پیاری ماں قتلق نگار خانم کی یاد شدت سے آئی تھی۔

اس پل اگر وہ اس کے قریب ہوتیں تو وہ ان کی مشفق گود میں سر چھپا کر زار و قطار روتا۔ اچانک ہی اس نے فیصلہ کیا کہ اوزن حسن سے مطالبہ کرے کہ اس کی ماں، نانی اور دیگر اہل خانہ کو اس کے پاس اس کے فوجی کیمپ میں بھیج دیا جائے۔ اس کا پیغام ملتے ہی بابر کی والدہ، نانی اور اس کے ساتھ موجود وفادار سپاہیوں کے اہل خانہ کو اس کے فوجی کیمپ پر بھیج دیا گیا۔

بابر، ماں اور نانی سے مل کر اشکبار ہو گیا تھا۔

’’ہمت مت ہارو میرے بیٹے۔‘‘ قتلق نگار خانم نے اسے سینے سے لگاتے ہوئے اس کے کان میں سرگوشی کی۔ ’’بادشاہوں کی زندگی میں ایسے بہت سے نشیب آتے ہیں مگر آخر کار فراز ہی ان کا مقدر ہوتا ہے۔ بہت جلد تم پھر مقدر کی بلندیوں پر ہو گے۔‘‘

ماں کی شفقتیں اور حوصلہ افزائی بھی بابر کی دل گرفتگی اور احساس شکستگی کم نہ کر پا رہی تھی۔ قتلق نگار خانم بیٹے کی زودرنجی اور مایوسی سے سخت متفکر تھی۔

’’والدہ۔‘‘ اس شام وہ اپنی ذہین اور دانشمند ماں ایسن دولت بیگم کے ساتھ باغیچے میں چہل قدمی کر رہی تھی، تب ہی اس نے ماں کو مخاطب کر کے کہا۔ ’’بابر کی دل شکستگی بے حد مایوس کن ہے۔ میں سخت پریشان ہوں، سمجھ میں نہیں آتا کہ اسے کس طرح سمجھایا جائے۔‘‘

’’اب ایک ہی راستہ ہے۔‘‘ ایسن دولت بیگم نے کسی غیر مرئی نقطے پر نگاہ جماتے ہوئے پُرسوچ لہجے میں کہا۔ ’’کہ اس کی تنہا اور مایوس زندگی میں کسی ہم سفر کی شمولیت یقیناً اس کے سفر میں امید اور خوشیوں کا باعث ثابت ہوگی۔‘‘

’’میں سمجھی نہیں۔‘‘ قتلق نگار خانم چلتے چلتے اچانک رک گئی۔ ’’کیا آپ کا اشارہ بابر کی شادی کی طرف ہے؟‘‘

’’ہاں۔‘‘ ایسن دولت بیگم مسکرائی۔ ’’میں آج ہی سلطان نگار خانم کو پیام بھجوا دوں گی، جس قدر جلد ممکن ہو وہ ماہ لقا بیگم کو لے کر یہاں آ جائے۔ اب بابر اور ماہ لقا دونوں ہی شادی کی عمر کو پہنچ چکے ہیں۔ پانچ سال کی عمر میں جو نسبت طے ہوئی تھی، اب اسے رشتۂ ازدواج میں منسلک کرنے کا وقت آ گیا ہے۔‘‘

’’ماشاء اللہ۔‘‘ قتلق نگار خانم کے اداس چہرے پر مسرت کے رنگ بکھر گئے۔ مگر اگلے ہی لمحے اس کی آنکھوں سے فکرمندی اور پریشانی جھانکنے لگی تھی۔ ’’والدہ! بھلا اس بے سروسامانی اور افتاد کے دور میں کیسی شادی؟ بھلا یہ کیونکر ممکن ہوگا؟ اپنے لاڈلے کے سر پر سہرا سجانے کے میں نے کیسے کیسے خواب دیکھے تھے مگر اس مشکل اور کٹھن وقت میں......‘‘

’’تم فکر مت کرو۔‘‘ ایسن دولت بیگم نے دھیمی اور سمجھانے والی آواز میں کہا۔ ’’سلطان نگار کوئی غیر نہیں، تمہاری بہن ہے اور شوہر کے انتقال کے بعد وہ بھی مشکل حالات سے گزر رہی ہے۔ اس وقت اس کے پاس ماہ لقا اور اریبہ بیگم کے سوا اور کوئی نہیں...... اور یاد رکھو، بابر ہمیشہ اس حال میں نہیں رہے گا، اس کے مقدر میں بلندی لکھی ہے، آج نہیں تو کل وہ بادشاہ بنے گا۔ اس لئے یہ چند روزہ پریشانی کوئی معنی نہیں رکھتی، جس قدر ممکن ہو تیاری کر لو۔ میں آج ہی سلطان نگار کو بلوانے کے لئے قاصد روانہ کر رہی ہوں۔‘‘

’’جیسی آپ کی مرضی والدہ۔‘‘ قتلق نگار خانم نے سر تسلیم خم کرتے ہوئے کہا اور اس کی بجھی آنکھوں میں امید اور انبساط کے دیئے جگمگانے لگے۔ اس کے چہیتے بیٹے کے سر پر سہرا سجانے کا وقت آ گیا تھا۔ کسی بھی ماں کی طرح اس کے لئے بھی یہ خوشی بہت بڑی خوشی تھی۔

پیغام ملتے ہی سلطان نگار خانم اپنی بیٹی ماہ لقا بیگم اور لے پالک بیٹی اریبہ بیگم اور چند خدام اور خادماؤں کے ساتھ اپنے ٹھکانے سے روانہ ہو گئی۔ چند دنوں بعد یہ چھوٹا سا قافلہ خجند پہنچ گیا۔

’’بھلا ہم یہاں کس لئے آئے ہیں؟‘‘ عقاب کی طرح تیز اور چمکتی آنکھوں والی اریبہ نے حیرت سے بگھی کے پردے کو سرکا کر اس معمولی سے مکان کی طرف دیکھا جس کے دروازے پر کوچوان نے بگھی روکی تھی۔ ’’بھلا یہ کس کا مکان ہے؟‘‘

’’بابر کا......‘‘ سلطان نگار خانم نے ذرا جھک کر بگھی کے پردے سے مکان کی طرف دیکھا۔ مکان کی ہیئت دیکھ کر اسے بھی ملال ہوا تھا۔ مگر اگلے ہی لمحے وہ لبوں پر امید بھری آواز میں بولی۔ ’’ظہیرالدین کو والد محترم نے بابر کا خطاب دیا تھا جس کا مطلب ہے بہادر، دلاور، شیر ببر...... اور شیر ببر جنگل پر حکومت کے لئے پیدا ہوتا ہے، اسی طرح بابر حکمرانی کے لئے دنیا میں آیا ہے۔ یہ افلاس اور بے سروسامانی بھی چند روزہ ہے۔ آؤ بگھی سے اترو۔‘‘

بابر کے ذکر پر ماہ لقا کے حسین اور معصوم چہرے پر حیرت بھری مسرت بکھر گئی تھی۔

جب اس کی بابر سے منگنی ہوئی تھی، اس وقت وہ شیرخوار بچی تھی۔ بعد میں کبھی اتفاق نہیں ہوا کہ وہ اپنی خالہ یا خالہ زاد سے مل سکتی۔ ایک آدھ بار اس کا ذکر آیا بھی تو اریبہ کی پیشانی کے بلوں نے اسے زیادہ دلچسپی لینے کی جرأت نہ ہونے دی۔

اریبہ کو سلطان نگار نے پالا تھا۔ جب وہ چار برس کی تھی تب ماہ لقا بیگم پیدا ہوئی تھی۔ اریبہ کی فطرت میں عجب سی جارحیت اور قابض ہو جانے کی خامی تھی۔ وہ اپنی سوتیلی ماں کو ہی نہیں، ماہ لقا بیگم کو بھی اپنی ملکیت سمجھتی تھی اور کسی قیمت پر اس کی بابر سے شادی کے حق میں نہیں تھی۔

’’آپ نے پہلے تو یہ ذکر نہیں کیا۔‘‘ اس کے لہجے میں بے نام سی شکایت تھی۔ ’’وہاں سے اٹھ کر دروازے پر پہنچ گئے تو اب آپ بتا رہی ہیں کہ......‘‘

’’پہلے بتا دیتی تو ہم کون سی تیاریاں کر لیتے؟‘‘ سلطان نگار بیگم نے آہ بھر کر جواب دیا۔ ’’ہمارے حالات بھی قتلق نگار بیگم سے کچھ مختلف نہیں۔ تمہارے بابا اور چچاؤں نے بابر کے ساتھ جو رویہ روا رکھا تھا، اس کے بعد تو میں اس رشتے سے مایوس ہی ہو گئی تھی۔ مگر صد شکر کہ میری بہن اپنی زبان پر قائم رہی۔ پیغام ملتے ہی مجھ پر تو شادیٔ مرگ کی سی کیفیت طاری ہو گئی تھی۔ اس لئے تم سے کچھ نہیں کہہ سکی۔ اب بتا رہی ہوں، میں یہاں ماہ لقا اور بابر کی شادی کے لئے آئی ہوں۔‘‘

’’مگر امی جان۔‘‘ اریبہ بیگم قدرے ہچکچاہٹ بھرے لہجے میں بولی۔ ’’ابھی ماہ لقا بیگم کی عمر ہی کیا ہے؟ بھلا ابھی سے شادی کا فیصلہ آپ نے کیونکر کر لیا؟‘‘

’’سچ کہتی ہو۔‘‘ سلطان نگار خانم نے ایک بار پھر آہ بھری۔ ’’ماہ لقا سے پہلے تمہاری شادی ہونی چاہئے تھی، تم اس سے بڑی ہو۔‘‘

’’نن...... نہیں۔‘‘ وہ بری طرح سٹپٹا کر بولی۔ ’’میرا یہ مطلب نہیں تھا۔ آپ جانتی ہیں، میں نے کبھی شادی نہ کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔ میں کبھی آپ کو تنہا چھوڑ کر نہیں جاؤں گی۔ کاش ماہ لقا بھی اسی طرح کا فیصلہ کر سکتی۔‘‘ اریبہ کا چہرہ اُتر گیا تھا۔

اسے روزِ اوّل سے بابر پسند نہیں آیا تھا۔ پہلی بار دیکھتے ہی اسے بابر سے ایک عجب سی نفرت محسوس ہوئی تھی، شاید اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ اس کی لاڈلی بہن کو ہمیشہ کے لئے لے جانے کا حق پا چکا تھا۔

سلطان نگار خانم دونوں بیٹیوں کو ساتھ لئے جوں ہی مکان میں داخل ہوئی، اس کی ماں ایسن دولت بیگم اور قتلق نگار خانم نے آگے بڑھ کر اپنے معزز مہمانوں کا استقبال کیا۔

’’میری بچی، میری لاڈلی۔‘‘ ایسن دولت بیگم نے بازو پھیلا کر سلطان نگار کو اپنی محبت کی پناہ میں لے لیا۔ ’’کیسی ہو میری جان؟‘‘ اسے سینے سے لگا کر وہ ممتا بھرے لہجے میں پوچھ رہی تھی۔

’’آپ کی دعائیں شامل حال ہیں۔‘‘ سلطان نگار خانم بعد مدت کے ماں اور بہن سے مل کر آبدیدہ ہو گئی تھی۔

’’ماشاء اللہ۔‘‘ قتلق نگار خانم، ماہ لقا بیگم کو دیکھ کر حیرت بھری مسرت سے بولی۔ ’’کتنی پیاری اور دلکش ہو گئی ہے، یہ اپنی ماہ لقا بیگم۔‘‘

’’شکریہ۔‘‘ ماہ لقا نے شرما کر آنچل میں چہرہ چھپا لیا اور سلطان نگار خانم نے اس کی طرف سے بہن کا شکریہ ادا کرتے ہوئے پوچھا۔ ’’یہ سلطان بابر کہاں ہیں۔ ذرا ہم بھی تو اپنے بیٹے کو دیکھیں کہ وہ کیسا ہو گیا ہے۔ امید ہے کہ ماہ لقا چاند ہے تو بابر سورج ہوگا اور ان شاء اللہ یہ چاند سورج کی جوڑی خوب مبارک اور کامیاب ثابت ہو گی۔‘‘

’’خدا کرے ایسا ہی ہو۔‘‘ ایسن دولت بیگم نے ہاتھ اٹھا کر دعائیہ انداز میں کہا اور خادمہ کو اشارہ کیا تاکہ مہمانوں کو ان کا کمرہ دکھا سکے۔

’’تم لوگ سفر سے آئی ہو، تھکی ہوئی ہو، منہ ہاتھ دھو کر ناشتہ کر لو۔ پھر کچھ دیر آرام کے بعد بابر سے مل لینا۔‘‘

’’جو حکم امی جان۔‘‘ سلطان نگار خانم اپنی دونوں بیٹیوں کو لئے اندر کی جانب بڑھ گئی۔

’’ماہ لقا کو دیکھ کر مجھے بہت خوشی ہوئی والدہ۔‘‘ قتلق نگار خانم نے مسرت بھرے لہجے میں ماں سے کہا۔ ’’بہت پیاری اور شرمیلی لڑکی ہے۔ آپ نے دیکھا بابر کے ذکر پر شرم و حیا سے سرخ ہو گئی تھی۔‘‘

’’ہاں، خدا کرے خوش بخت بھی ثابت ہو۔ بابر کو اس کی لٹی جاگیر واپس مل جائے اور یہ دربدری کا دور اختتام پذیر ہو۔‘‘

ایسن دولت بیگم کی بات سن کر قتلق نگار خانم نے ’’آمین‘‘ کہا اور بابر کو مہمانوں کی آمد کی خبر دینے چل دی۔

رات کے کھانے سے کچھ دیر قبل قتلق نگار خانم اپنے وجیہ و شکیل شاندار و باوقار بیٹے کو لے کر بہن سے ملوانے گئی۔

دروازے پر دستک کی آواز سن کر دروازہ اریبہ بیگم نے کھولا۔ اپنے سامنے قتلق نگار خانم کے ساتھ ایک خوبرو، سنجیدہ اور ذی وقار نوجوان کو دیکھ کر وہ لحظہ بھر کو ٹھٹکی تھی اور اگلے ہی لمحے اس کی تیز آنکھوں نے بابر کو پہچان لیا تھا۔

لحظہ بھر کو اس کی آنکھوں میں حیرت لہرائی تھی اور اگلے لمحے وہ حیرت نفرت میں تبدیل ہو گئی۔ بچپن سے آج تک وہ بابر سے نفرت کرتی آئی تھی۔ پہلے وہ اس سے اس لئے نفرت کرتی تھی کہ وہ اس سے اس کی ننھی بہن چھین کر لے جانا چاہتا تھا۔ مگر آج یہ بات اس لئے تکلیف دہ اور اذیت ناک تھی کہ اتنا حسین و جمیل وجیہ و شکیل نوجوان اس کا نہیں بلکہ اس سے چار سال چھوٹی ماہ لقا بیگم کا شوہر بننے والا ہے۔

سلطان نگار خانم بابر کو دیکھ کر، اس سے مل کر حیرت بھری مسرت سے دوچار ہوئی تھی اور اسے اپنی بیٹی کی خوش بختی پر ناز ہوا۔

ادھ کھلے دریچے سے جھانکتی ماہ لقا بیگم کا دل بھی بے ساختہ دھڑک اٹھا تھا۔ ہوش سنبھالنے کے بعد سے اب تک جب بھی بابر کا ذکر آیا، اریبہ نے ہمیشہ ہی اس کی برائی کی تھی۔ مگر آج وہ سراپا دلکشی و رعنائی بنا اس کی نظروں کے سامنے کھڑا تھا۔ اس کی بے ریا آنکھیں اور معصوم چہرہ اس بات کا غماز تھا کہ وہ کبھی برا ہو ہی نہیں سکتا تھا۔

اگلے دن شام کو عصر و مغرب کے درمیان ظہیرالدین بابر اور ماہ لقا بیگم کی نکاح کی رسم ادا کر دی گئی۔ گھر میں موجود خادماؤں اور خدام کے علاوہ بابر کے وفادار سپاہیوں میں بھی چھوہارے تقسیم کئے گئے تھے۔

نیلے آسمان پر چودہویں کا ماہ مکمل جگمگا رہا تھا اور نیچے بابر کی خواب گاہ میں ماہ لقا اپنی بھرپور رعنائیوں اور تجلیوں کے ساتھ بابر کے سامنے موجود تھی۔

’’ماشاء اللہ۔‘‘ بابر نے اپنی حسین و دلکش شریک حیات کا چاند سا چہرہ دیکھ کر بے ساختہ کہا۔ ’’میں نے کبھی سوچا نہیں تھا کہ آپ اس قدر حسین ہوں گی۔‘‘

ماہ لقا نے سرخ زرتار آنچل کی اوٹ سے اس کی طرف دیکھا اور شرما کر نگاہیں جھکا لی تھیں۔

☆......☆......☆

اگلے دن شام کو ولیمے کی تقریب منعقد ہوئی تھی۔

بابر کی ویران اور پریشان زندگی میں ایک دم بہاریں اور رونقیں گھل گئی تھیں۔ ماہ لقا ایک معصوم فطرت اور سیدھی سادی لڑکی تھی۔ وہ بابر کی خشک اور بے رنگ زندگی میں خوشی اور رعنائی بن کر داخل ہوئی تھی۔

مگر اریبہ بیگم کے لئے بابر اور ماہ لقا کی خوشی ناقابل برداشت تھی۔ وہ ہر لمحہ یہی سوچتی رہتی تھی کہ کس طرح ان دونوں کے بیچ نفرت اور فاصلہ پیدا کرے۔

☆......☆......☆

جاڑے کا موسم گزر گیا۔

بابر کے لئے اب تک کسی منزل کا تعین نہیں ہوا تھا۔ سو وہ اپنی بدنصیبی کے بورے سمیٹ کر جنوبی اورتیا کے گرمائی مرغزاروں میں چلا گیا۔

اچانک اس کی بدنصیبی کے دروازے پر قسمت نے دستک دی۔

اس سہ پہر نماز عصر کے وقت ایک تنہا نوجوان عمر دراز گھوڑا دوڑاتا ہوا اس کی خدمت میں پیش ہوا۔ یہ دوست محمد طغائی کا پیش خدمت تھا، جس نے بابر کی بیماری کی خبر سن کر جلد بازی اور نادانی سے قلعہ دشمن کے حوالے کر دیا تھا اور اب اس پل دوست محمد نے بابر سے اپنے پیامبر کے ذریعے معافی کی درخواست کی تھی اور لطف و کرم کی التجا کے ساتھ مرغیلان شہر کی پیش کش کی تھی۔

بابر کے لئے یہ خبر کسی بڑی خوشخبری سے کم نہ تھی۔ وہ اپنے دو سو چالیس سپاہیوں کے ساتھ فوراً ہی مرغیلان کی طرف روانہ ہو گیا تھا۔ یہ چھوٹا سا قافلہ تیسرے دن سحر کے وقت شہر کے دروازے پر جا پہنچا تھا۔ دوست محمد طغائی نے دروازے پر بابر کا استقبال کیا تھا۔

ایک مختصر گفت و شنید کے بعد معافی کے وعدے پر طغائی نے بابر اور اس کے ساتھیوں کے لئے دروازہ کھول دیا تھا۔ بابر ایک بار پھر ایک فصیل بند شہر پر قابض ہو گیا تھا۔

بابر نے اپنے معتمد ایلچیوں اور سپاہیوں کو رسد کی تلاش میں دیہات کا گشت لگانے کے لئے روانہ کیا۔ ہر جگہ سے اسلحہ بردار لوگ اس کے لشکر میں آ کر شامل ہونے لگے۔

بابر نا صرف اپنی پُرکشش شخصیت بلکہ نظم و ضبط کی وجہ سے ہر دلعزیز ہوتا چلا گیا۔

جلد ہی بابر نے اندجان کی طرف آنکھیں لگا دی تھیں جہاں اوزن حسن اور احمد تنبل نے جہانگیر کے نام پر کٹھ پتلی حکومت قائم کر رکھی تھی اور بے بس رعیت پر مظالم ڈھا رہے تھے۔ انہوں نے مرغیلان کے محاصرے کی کوشش کی لیکن کامیابی حاصل نہ کر سکے۔ اسی دوران شہر آخشی کے عوام محافظ فوج کے خلاف اٹھ کھڑے ہوئے اور بابر کے لئے انہوں نے اپنے شہر کا دروازہ وا کر دیا۔

حالات دن بہ دن بہتر سے بہتر ہوتے جا رہے تھے۔ جلد ہی اندجان کا حاکم بابر سے آملا۔

اب پوری سلطنت بابر کے ساتھ ہو گئی تھی۔ ایک بار پھر بابر فرغانہ کا مالک ہو گیا تھا۔ احمد تنبل زقند بھاگ گیا اور اوزن حسن نے آخشی میں پناہ لی اور بابر سے معافی کا خواستگار ہوا۔

بغاوت کے تمام نشانات ایک ایک کر کے مٹتے چلے جا رہے تھے۔ ایسا محسوس ہونے لگا تھا جیسے بابر کی تمام مصیبتوں کا خاتمہ ہو گیا ہے۔

مگر درحقیقت یہ بات نہ تھی۔

جن باغی سرداروں نے بابر کی اطاعت قبول کی تھی، ان میں سے بیشتر منگول تھے۔ بابر ذاتی طور پر منگولوں کی وحشیانہ طبیعت اور لوٹ مار کی عادت کے باعث انہیں پسند نہ کرتا تھا۔

سمرقند مہم کے دوران ان کو قابو رکھنے کے لئے اس نے سخت اقدامات کئے تھے۔ یہاں بھی اس نے سختی سے لوٹ مار کے واقعات کو رونما ہونے سے روکا تھا اور غریب دہقانوں کی جان و مال کی حفاظت کے بارے میں بے حد فکرمند تھا۔ جب اسے پتا چلا کہ ان کرائے کے منگول سپاہیوں نے قرب و جوار کے غریب عوام اور دہقانوں کو لوٹا ہے تو اس نے اپنے اعلیٰ عہدیداروں کے کہنے پر حکم دیا کہ تمام لوٹا ہوا مال واپس لوٹا دیا جائے۔

اس کا یہ حکم منگولوں کے لئے قابل قبول نہیں تھا۔ خود بابر کو بھی جلد ہی احساس ہو گیا کہ اس کا یہ سخت حکم جلد بازی پر مبنی تھا۔ ابھی جہانگیر کا فتنہ پوری طرح ختم نہیں ہوا تھا۔ ایسے میں اپنے سپاہیوں سے بگاڑنا کوئی دانشمندی نہ تھی۔

منگولوں نے بغاوت کر دی اور بلاتوقف تنبل کے ساتھ شامل ہونے کے لئے روانہ ہو گئے۔

ایک بار پھر جنگ شروع ہو گئی۔ قاسم خان کی قیادت میں بابر کے ایک دستے نے زبردست شکست کا منہ دیکھا۔ تنبل ایک ماہ تک دارالخلافہ کا محاصرہ کئے رہا۔ جب اسے کوئی کامیابی نہ ہوئی تو وہ دوسرے شہر کی جانب چلا گیا۔

ایک بار پھر بدنصیبی بابر کے ہمرکاب تھی۔ اس کے دو بڑے سردار علی دوست طغائی اور قنبر علی اپنے نوجوان آقا کو حد سے زیادہ مطلق العنان ہو جانے کی اجازت دینے کو تیار نہ تھے۔ یہ ان کے مفاد میں نہ تھا کیونکہ اس طرح بابر ان کے اثر سے بالکل آزاد ہو سکتا تھا۔ اس وجہ سے انہوں نے فرغانہ کے علاقے کو بابر اور اس کے چھوٹے بھائی جہانگیر کے درمیان تقسیم کرنے پر اصرار شروع کر دیا۔

بابر کو طیش تو بہت آیا مگر وہ اس وقت اپنے سرداروں سے ناتا توڑنے کی جسارت نہ کر سکتا تھا، سو اسے اپنے سرداروں کی بات ماننی پڑی۔

بابر کے مقرر کردہ حاکم اندجان، دوست طغائی کا اس کامیابی سے دماغ آسمان پر جا پہنچا۔ اس نے ایک خودمختار حاکم کی طرح حکمرانی شروع کر دی۔ اس نے ایک سلطان کی طرح استقبالیہ ضیافتیں اور ایک دسترخوان عام شروع کر دیا۔

بابر یہ سب کچھ خاموشی سے دیکھ رہا تھا۔ یہ سب اس کے لئے ناقابل برداشت تھا۔ مگر وہ برداشت کرنے پر مجبور تھا۔

اچانک ہی سمرقند سے خبر آئی۔

بابر کے سمرقند سے نکلنے کے بعد اس کے حلیف چچازاد بھائی علی مرزا نے سمرقند پر قبضہ کر لیا تھا اور اب تک اس کے نواح پر حکمرانی کر رہا تھا مگر دھیرے دھیرے قندز کا گورنر خسرو شاہ طاقتور ہو رہا تھا۔ اس کی نظریں سمرقند پر جمی ہوئی تھیں۔

سلطان علی مرزا کا طاقتور ترخانوں سے جھگڑا ہو گیا تھا کیونکہ سمرقند و بخارا کی تمام مال گزاری انہوں نے اپنے ہاتھوں میں لے لی تھی۔

سلطان علی مرزا کے خفا ہونے پر انہوں نے خان اعظم کے کچھ منگولوں کو مدد کے لئے بلوایا مگر ان منگولوں نے انہیں سخت مایوس کیا۔ تب تھک ہار کر انہوں نے بابر کے پاس ایک قاصد بھیج کر سمرقند کی پیشکش کی۔

☆......☆......☆

موسم بے حد خوشگوار تھا۔ نیلے آسمان پر روئی کے گالے کے سے بادل باہم آنکھ مچولی کھیل رہے تھے۔ ہواؤں میں نرمی اور سرخوشی بسی ہوئی تھی۔ بہت عرصے بعد بابر کو ایک اچھی خبر ملی تھی۔ اسے سمرقند کے ترخانوں نے سمرقند پر حملہ آور ہونے اور سمرقند حاصل کر لینے کی پیشکش کی تھی۔

’’مگر بیٹا! اس وقت تمہارے پاس اتنی فوج اور سامان حرب نہیں ہے کہ تم سمرقند پر حملہ کر سکو۔‘‘ بابر کی دانش مند نانی ایسن دولت بیگم خاصی فکرمند تھیں۔ ’’ایسا نہ ہو سمرقند کی فتح کی امید پر تم یہاں سے نکلو اور یہ شہر بھی تمہارے ہاتھ سے نکل جائے۔‘‘

’’نانی جان ٹھیک کہہ رہی ہیں بابر۔‘‘ اس کی بڑی بہن خداوندزادہ بیگم کتنے ہی برسوں بعد اس کے پاس آئی تھی۔ ابھی اس نے اپنے لاڈلے بھائی کو جی بھر کر دیکھا بھی نہ تھا کہ وہ پھر سے لام پر جانے کے لئے کمربستہ تھا۔ ’’بہتر یہی ہے کہ یہیں بیٹھ کر تقدیر کے دروازے کے کھلنے کا انتظار کرو۔‘‘

’’ہمشیرہ۔ تقدیر کا دروازہ کبھی خود نہیں کھلتا۔‘‘ بابر نے اپنی باوقار بہن کی طرف دیکھتے ہوئے جواب دیا۔ ’’یہ دروازہ جدوجہد اور کوششوں سے کھولنا پڑتا ہے۔ مواقع کہیں پڑے ہوئے نہیں مل جاتے، انہیں تلاش کرنا پڑتا ہے، جھپٹنا پڑتا ہے، اور میں یہ موقع ضائع نہیں ہونے دوں گا۔‘‘

☆......☆......☆

’’بابر پھر سے لام پر جانے کی بات کر رہے ہیں۔‘‘ بابر کی نئی نویلی دلہن ماہ لقا بیگم کا چہرہ اتر گیا۔

’’وہ یہاں موجود ہوتا ہے، تب بھی تمہارے ساتھ کب ہوتا ہے۔‘‘ اس کی بہن اریبہ بیگم نے دل جلے انداز میں جواب دیا۔ ’’گھر سے باہر اپنے فوجی سرداروں اور حکومتی انتظامات میں مصروف ہوتا ہے، اور اگر گھر میں ہوتا ہے تو اپنی نانی ماں اور اب یہ بہن...... ان میں گھرا رہتا ہے۔ ماہ لقا، مجھے کبھی کبھی یوں لگتا ہے کہ بابر کے دل میں تمہارے لئے کوئی جگہ نہیں۔‘‘

’’ایسا نہیں ہے آپا۔‘‘ ماہ لقا جلدی سے گھبرا کر بولی۔ ’’وہ بے شک، بہت مصروف رہتے ہیں مگر انہیں جب بھی موقع ملتا ہے، میرے حقوق اور میری ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہونے کی کوشش کرتے ہیں۔ وہ بھی کیا کریں، حالات ہی ایسے ہیں۔‘‘

’’حالات کا اثر صرف تمہارے لئے ہے۔‘‘ اریبہ جل کر بولی۔ ’’اپنی نانی، ماں اور بہن خداوندزادہ کے ساتھ وہ کتنا وقت گزارتا ہے۔ میں نے تو اسے دن کے وقت کبھی تمہاری طرف رخ کرتے نہیں دیکھا۔‘‘

’’دراصل آپا......‘‘ ماہ لقا نے جواز پیش کرنا چاہا۔

مگر اریبہ نے جھٹک کر اس کی بات رد کر دی۔ ’’بس رہنے دو۔ میں سب دیکھ رہی ہوں۔ امی جان نے جاتے وقت مجھے یہاں اسی لئے چھوڑا تھا کہ میں تمہارے حالات پر نظر رکھ سکوں مگر افسوس تم نری بے وقوف ثابت ہوئیں۔ اپنے شوہر کو اپنے قبضے میں کرنے کی بجائے تم نے اسے اس کی ماں اور نانی کے حوالے کر دیا۔ اور تو اور اب اس کی یہ چہیتی بہن بھی سر پر سوار ہو گئی ہے...... چہ خوب یک نہ شد دو شد۔‘‘

ماہ لقا نے افسردگی کے ساتھ سر جھکا لیا۔ سچ بھی تھا جب سے خداوندزادہ بیگم آئی تھی، بابر مزید مصروف ہو گیا تھا۔ گو کہ وہ ایک اچھے دل کی مالک تھی۔ مگر اریبہ کی زہرپاشی دھیرے دھیرے اس کے دل کو مسموم کر رہی تھی۔ اب اسے بھی اپنے شاندار شوہر سے شکایتیں ہونے لگی تھیں۔

’’سنا ہے آپ پھر سے سمرقند پر حملہ کرنے کا منصوبہ بنا رہے ہیں؟‘‘ رات گئے بابر اس کے کمرے میں آیا تو اس نے قدرے خشک لہجے میں سوال کیا۔

’’یہ مردوں کے کرنے کے کام ہیں، خواتین کو ان باتوں میں الجھ کر پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔‘‘ بابر نے ماہ لقا کے چاند چہرے کو اپنی نرم انگلیوں سے چھوتے ہوئے کہا۔

’’نانی بیگم، ایسن دولت بیگم اور والدہ سلطان قتلق نگار خانم بھی غالباً خواتین ہیں۔‘‘ ماہ لقا نے قدرے طنزیہ لہجے میں جواب دیا۔ ’’اور وہ آپ کی دانشمند بہن خداوندزادہ...... وہ بھی ایک نوجوان خاتون ہیں مگر وہ سب جب بابر کے معاملات میں آپ کی مشاورت کرتی ہیں تو آپ کو کوئی اعتراض نہیں ہوتا۔ میرے ایک بے ضرر سے سوال پر آپ نے یوں ٹکا سا جواب دے دیا۔ اریبہ آپا ٹھیک ہی کہتی ہیں۔ آپ مجھے اپنی گھر کی خواتین کے مقابلے میں حقیر سمجھتے ہیں۔‘‘

’’اریبہ؟‘‘ بابر نے چونک کر بیوی کے غصے سے تمتماتے چہرے کی طرف دیکھا۔ ’’اریبہ بیگم کو کس نے حق دیا کہ وہ ہمارے ذاتی معاملات میں دخل اندازی کرے؟‘‘ بابر کی شفاف پیشانی پر ابھرتی لکیروں نے ماہ لقا کو قدرے ہراساں کر دیا تھا۔ اس کا ہاتھ تھام کر جلدی سے بولی۔ ’’نن...... نہیں، آپ غلط سمجھے، آپا کا یہ مطلب نہیں تھا۔ خیر چھوڑیں، بتائیں آج دن بھر آپ کہاں مصروف رہے۔ میں کب سے آپ کی راہ تک رہی ہوں۔ آج کل میری طبیعت بھی گری گری رہتی ہے۔ خدا جانے کیا مرض ہے۔‘‘

’’کوئی مرض نہیں ہے۔‘‘ بابر اس کے دمکتے چہرے کی طرف دیکھ کر مسکرا کر بولا۔ ’’شاداب اور صحت مند دکھائی دے رہی ہو۔ اس کے باوجود اگر کچھ شبہ ہے تو والدہ سے کہوں گا، وہ طبیبہ کو بلوا کر تمہیں دکھلا دیں۔‘‘

اور طبیبہ نے معائنے کے بعد خوشخبری سنائی تھی۔

’’والدۂ سلطان! مبارک ہو، آپ دادی بننے والی ہیں۔‘‘

’’کیا واقعی؟‘‘ قتلق نگار خانم کے چہرے پر مسرت روشنی بن کر بکھر گئی۔

محل میں سب ہی لوگ خوش تھے مگر اریبہ کا چہرہ اترا ہوا تھا۔ وہ یہ خبر سن کر سلگ کر رہ گئی تھی۔ وہ اوّل دن سے ماہ لقا اور بابر کے بیچ نفرت بڑھا کر اسے اپنے ساتھ اپنی ماں کے پاس لے جانا چاہتی تھی۔ اسی مقصد کے حصول کی خاطر وہ یہاں پڑی تھی مگر اب ماہ لقا کے اُمید سے ہونے کی خبر نے اس کی امیدوں پر پانی پھیر دیا تھا۔

’’آنے والا بچہ ہمارے لئے بخت آور ثابت ہو، اور ہم آخر کار سمرقند کو دوبارہ حاصل کر لیں۔‘‘ بابر نے امید بھری نظروں سے ماہ لقا کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

اور ماہ لقا محض سر ہلا کر رہ گئی تھی۔

’’بچے کی پیدائش کو بھی وہ فتح سے جوڑ رہا ہے۔‘‘ موقع ملتے ہی اریبہ نے ماہ لقا کے کان بھرنے شروع کر دیئے۔ ’’بتاؤ تم اس حال میں ہو اور وہ سمرقند فتح کرنے کے لئے روانہ ہونے کو تیار بیٹھا ہے۔ یہ جنگیں اتنی آسان تو نہیں ہوتیں، کل کلاں کو اس کو کچھ ہو گیا تو...... تمہارا کون پرسانِ حال ہوگا؟‘‘

’’خدا نہ کرے کہ انہیں کچھ ہو۔‘‘ ماہ لقا نے دہل کر کہا۔ ’’آپا آپ کبھی کبھی بہت زودرنج ہو جاتی ہیں۔ اللہ نے چاہا تو وہ کامیاب لوٹیں گے اور اپنے بچے کے ساتھ ایک شاداب زندگی گزاریں گے۔‘‘

’’تم بس اسی طرح احمقوں کی جنت میں رہتی رہنا۔‘‘ اریبہ منہ بنا کر بولی اور ماہ لقا اس کا منہ دیکھ کر رہ گئی تھی۔

ادھر بابر اپنے چنیدہ دستے لے کر سمرقند کی طرف روانہ ہوا۔ ادھر شیبانی خان ایک زبردست لشکر لے کر بخارا پر قابض ہو گیا اور نہایت تیز رفتاری سے سمرقند کی طرف بڑھا۔

بابر اپنی مختصر فوج کے ساتھ سمرقند کی قلعہ بند فوج کے ساتھ معرکہ آرائی نہیں کر سکتا تھا، اس لئے وہ اس وقت تک دور ہی رکا رہا جب تک کہ کسی بھی خواہ اور دوست کی طرف سے کمک نہ آ جائے۔

بابر کی کسی طرف سے کوئی مدد نہ آئی اور شیبانی خان یہ دوڑ جیت گیا۔ اس نے قلعے کا محاصرہ کر لیا۔ قلعے کے اندر علی مرزا کی ماں مخدومہ بیگم منتظم تھی۔ سلطان علی مرزا شدید ذہنی دباؤ کا شکار بستر استراحت پر پڑا تھا۔

ایسے میں شیبانی خان نے مخدومہ بیگم کو پیغام بھجوایا۔

’’قابل احترام خاتون مخدومہ بیگم صاحبہ، میں آپ کی صلاحیتوں کا معترف ہوں۔ مگر میں جانتا ہوں علی مرزا بیمار ہے اور آپ شہر کا اور قلعے کا انتظام چلا رہی ہیں۔ میری گزارش ہے کہ آپ قلعے کا دروازہ کھول دیں۔ میں آپ کو اپنی شریک حیات بنا کر تاحیات قلعے کا مالک بنا دوں گا اور آپ کے بیٹے علی مرزا کو اپنے علاقوں میں سے کوئی علاقہ عطا کر دوں گا جہاں وہ عزت و سکون کے ساتھ زندگی بسر کر سکے گا۔‘‘

’’مجھے شیبانی خان کی پیشکش میں فریب کی بو آتی محسوس ہو رہی ہے۔‘‘ ملکہ مخدومہ کا ایک سپہ سالار خان محمد دھیمی آواز میں بولا۔ ’’بہتر ہے کہ آپ اس کی کسی بات پر توجہ نہ دیں۔‘‘

’’خان محمد۔‘‘ مخدومہ بیگم نے اپنے بوڑھے سپہ سالار کی طرف دیکھا۔ ’’میں کیسے اس کی بات پر دھیان نہ دوں۔ تم دیکھ رہے ہو اب ہمارے پاس کوئی راستہ نہیں بچا ہے۔ اس طرح شاید میرا علی مرزا زندہ بچ جائے۔‘‘ ماں کی رندھی آواز میں بے نام سی امید لرزاں تھی۔

’’یہ آپ کا خیال ہے۔‘‘ خان محمد نے دل میں سوچا مگر ہونٹوں پر لایا نہیں۔ ’’آپ کا حکم ہو تو میں خود آپ کا پیغام لے کر شیبانی کے پاس چلا جاؤں؟‘‘

’’ہاں یہی مناسب رہے گا۔‘‘ مخدومہ نے دھیمی آواز میں جواب دیا۔

خان محمد خان جب شیبانی کے پاس پہنچا تو اس وقت وہ اپنے سرداروں کے ساتھ محفل ناؤنوش سجائے ہوئے تھا۔ خان محمد اس کی خدمت میں حاضر ہوا اور ملکہ کی رضامندی کی خبر دی۔

’’او...... ہو ہو...... ہاہاہ۔‘‘ خان محمد کی بات سنتے ہی شیبانی خان نے وحشیانہ انداز میں قہقہے لگانے شروع کر دیئے۔ ’’میرے جری سردارو...... سنو، تم سب کے لئے ایک زبردست خبر ہے۔ سلطان علی مرزا کی ماں قلعے کا دروازہ ہمارے لئے کھولنے کے لئے تیار ہے...... مگر اس کے لئے وہ میری ملکہ بننے کے خواب دیکھ رہی ہے۔‘‘

(جاری ہے)

allurdupdf.blogspot.com

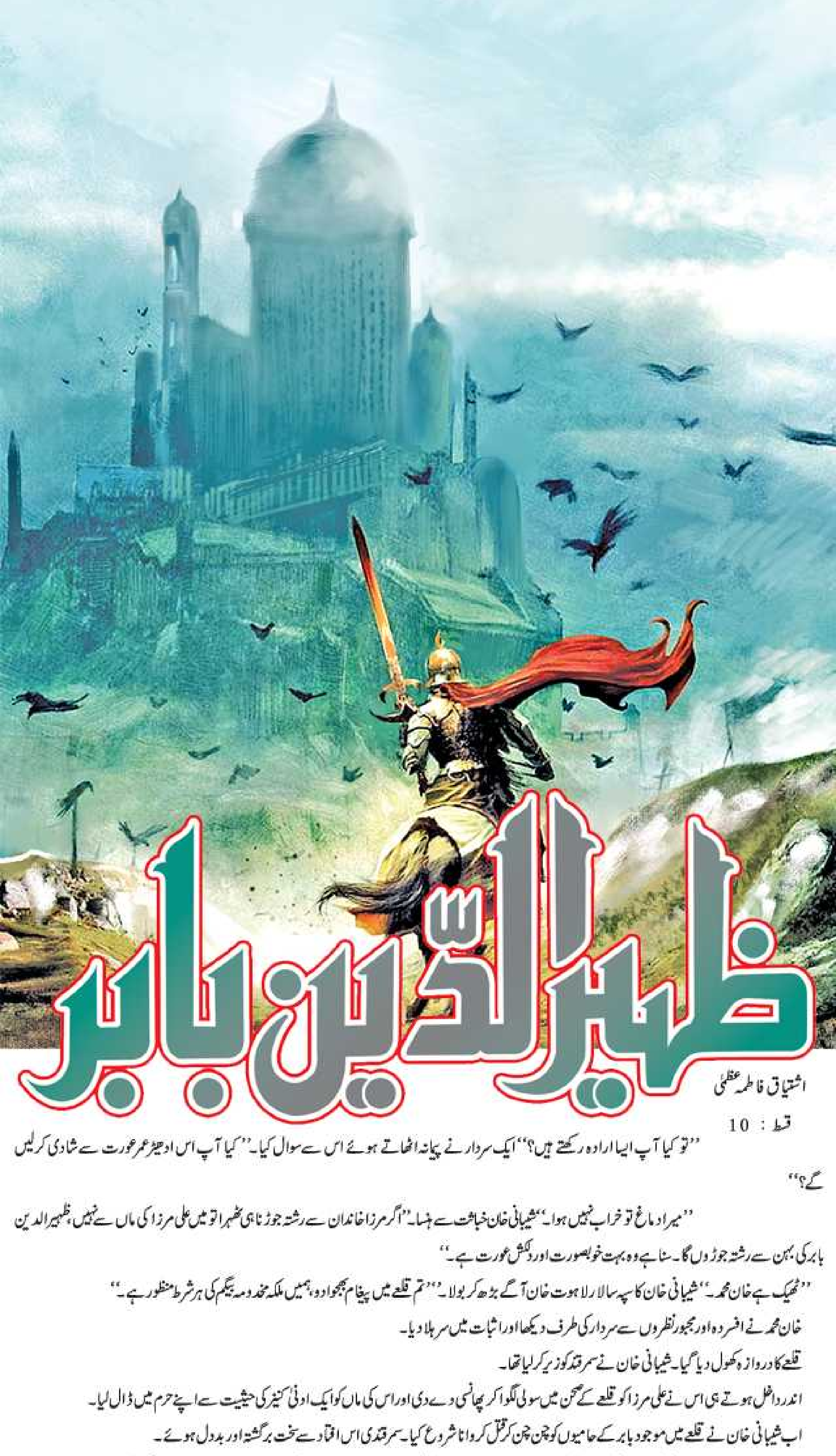

ظہیرالدین بابر

اشتیاق فاطمہ عظمیٰ

قسط : 10

''تو کیا آپ ایسا ارادہ رکھتے ہیں؟'' ایک سردار نے پیمانہ اٹھاتے ہوئے اس سے سوال کیا۔ ''کیا آپ اس ادھیڑ عمر عورت سے شادی کر لیں گے؟''

''میرا دماغ تو خراب نہیں ہوا۔'' شیبانی خان خباثت سے ہنسا۔ ''اگر مرزا خاندان سے رشتہ جوڑنا ہی ٹھہرا تو میں علی مرزا کی ماں سے نہیں، ظہیرالدین بابر کی بہن سے رشتہ جوڑوں گا۔ سنا ہے وہ بہت خوبصورت اور دلکش عورت ہے۔''

''ٹھیک ہے خان محمد۔'' شیبانی خان کا سپہ سالار لاہوت خان آگے بڑھ کر بولا۔ ''تم قلعے میں پیغام بھجوا دو، ہمیں ملکہ مخدومہ بیگم کی ہر شرط منظور ہے۔''

خان محمد نے افسردہ اور مجبور نظروں سے سردار کی طرف دیکھا اور اثبات میں سر ہلا دیا۔

قلعے کا دروازہ کھول دیا گیا۔ شیبانی خان نے سمرقند کو زیر کر لیا تھا۔

اندر داخل ہوتے ہی اس نے علی مرزا کو قلعے کے صحن میں سولی لگوا کر پھانسی دے دی اور اس کی ماں کو ایک ادنیٰ کنیز کی حیثیت سے اپنے حرم میں ڈال لیا۔

اب شیبانی خان نے قلعے میں موجود بابر کے حامیوں کو چن چن کر قتل کروانا شروع کیا۔ سمرقندی اس افتاد سے سخت برگشتہ اور بددل ہوئے۔

ادھر بابر نے صورت حال دیکھ کر حصار کی طرف کوچ کیا۔ اب یہاں رکنے کا کوئی فائدہ نہ تھا۔ سمرقند کے کچھ عمائدین اس سے آملے تھے مگر خسرو شاہ کے علاقے کے قریب پہنچتے تک وہ بابر کا ساتھ چھوڑ گئے۔ اب اس کے پاس محض دو سو چالیس جاں نثار ہی رہ گئے تھے۔

''کیا ہمیں اب اندجان کی طرف واپس لوٹ جانا ہوگا؟'' بابر کے ایک جاں نثار سپہ سالار اخوندیار نے مایوس لہجے میں سوال کیا۔

''نہیں۔'' بابر نے کئی لمحوں تک گہری سوچ میں ڈوبے رہنے کے بعد جواب دیا۔ ''اخوندیار، تم جانتے ہو میں اندجان کی مجبور و پابند زندگی کو نہیں اپنا سکتا۔ اس کے مقابلے میں کسی بھی جنگ، کسی بھی سانحے کو گلے لگا سکتا ہوں۔''

''سلطان معظم!'' بوڑھے سردار اخوندیار نے سر جھکا کر دھیمی آواز میں کہا۔ ''اگر ایسا ہے تو ہم سمرقند حاصل کرنے کی ایک کوشش اور کر سکتے ہیں۔''

''وہ کس طرح؟'' بابر نے چونک کر لائق اور تجربہ کار سپہ سالار کی طرف دیکھا۔

''اگر آپ اجازت دیں تو میں تمام سرداروں اور جانبازوں کو جمع کر لوں۔ سب کے سامنے میں اپنی تجویز رکھنا چاہتا ہوں تاکہ وہ سب بھی اپنی اپنی رائے کا اظہار کر سکیں۔''

''اچھا خیال ہے۔'' بابر نے تائید بھرے انداز میں اس کی طرف دیکھا۔ ''فوری طور پر میرے خیمے میں تمام لوگوں کو جمع کر لیا جائے۔''

کچھ ہی دیر بعد بابر کے ہشت پہلو خیمے میں اس کے تمام سردار اور جانباز جمع ہو چکے تھے۔

اخوندیار نے سب کی طرف دیکھتے ہوئے دھیمی آواز میں اظہار خیال شروع کیا۔ ''کیونکہ شیبانی نے حال ہی میں سمرقند پر قبضہ کیا ہے، اس لئے سمرقندیوں کو اس سے تعلق خاطر قائم ہوا ہوگا اور نہ ہی خود اسے ان لوگوں سے کوئی دلچسپی ہوگی، اگر ہم فوراً کوشش کریں تو یقیناً کامیابی ہمارا مقدر ہو سکتی ہے۔''

''بھلا یہ سب کس طرح ہوگا؟'' ایک سردار نے حیران لہجے میں سوال کیا۔

''اگر ہم سیڑھیاں لگا کر اچانک قلعے میں داخل ہوں اور حملہ کر دیں تو سمرقندی ہمارے ساتھ ہو جائیں گے۔ اگر وہ ہمیں کوئی مدد نہ بھی دیں تو کم از کم ہم سے جنگ بھی نہیں کریں گے...... اور اگر ایک بار سمرقند ہمارے ہاتھ آ گیا تو ان شاء اللہ سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔ یہ فتح ہماری اگلی پچھلی تمام شکستوں کا تدارک ہو جائے گی۔''

سب ہی سرداروں نے اس سوچ کی تائید کی اور فوراً ہی اس فیصلے پر عمل کرنے کا فیصلہ کیا گیا۔ بعد نماز ظہر بابر اپنے ساتھیوں کے ساتھ روانہ ہوا اور اندھیرے میں آدھی رات تک سفر کرتے ہوئے قلعے کے قریب جا پہنچا۔

اگلا دن اس نے اپنے ساتھیوں خان قلی، کریم شیخ درویش اور اخوندیار وغیرہ سے آئندہ کی حکمت عملی پر گفت و شنید میں گزارا۔

رات کو بابر نے خواب میں اعلیٰ حضرت خواجہ عبیداللہ احراری کو دیکھا جنہوں نے اسے سمرقند کی فتح کی نوید دی تھی۔

اگلی رات کو سمرقند پر ایک بار پھر چڑھائی کی گئی۔ نصف شب تک وہ سب خفیہ راستے سے پل پر جا پہنچے۔ بابر نے ستر سپاہیوں کا ایک عمدہ دستہ آگے روانہ کیا جن کا کام یہ تھا کہ غار عاشقاں کے مقام پر سیڑھیاں لگا کر قلعے کے اندر داخل ہو جائیں۔

ایسا ہی کیا گیا۔ دروازے پر پہنچ کر دربان پر حملہ کر کے اسے ہلاک کر دیا گیا۔ کلہاڑی کے واروں سے تالا توڑ کر دروازہ کھول دیا گیا۔

شہر والے ابھی سو رہے تھے۔ کچھ تاجروں نے اپنی دکانوں سے باہر جھانک کر دیکھا اور اسے دعائیں دیں۔

کچھ دیر بعد صبح صادق کے انوار کے ساتھ ہی بابر کی فتح کی خبر شہر میں پھیلی تو شہر والوں کے چہروں پر طمانیت بھری مسرت بکھر گئی۔ انہوں نے گلیوں، کوچوں میں موجود شیبانی کے ازبک سپاہیوں کو لاٹھیوں اور پتھروں سے پاگل کتوں کی طرح زدوکوب کیا۔ اس طرح کوئی پانچ سو ازبک سپاہی اپنی جان سے گئے۔

شہر کے حاکم نے شفیق خان کے گھر میں چھپ کر اپنی جان بچائی۔

سورج کی روشنی پوری طرح پھیل گئی تھی۔ شہر تمازت بھری دھوپ میں دمکتا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔ ایسے میں بابر اپنے چند وفادار ساتھیوں کے ساتھ باب فیروزی سے قلعے میں داخل ہوا اور سیدھا دارالعلوم پہنچا اور خانقاہ کی محراب کے اوپر بسیرا کیا۔

دوپہر ڈھلنے تک ''مار و مار و'' کا شور برپا رہا۔ اس کی آمد کی خبر پا کر تاجر اور عمائدین شہر خوشی خوشی اس سے ملنے کے لئے آ رہے تھے۔ کچھ لوگ کھانا بھی لائے۔

تقریباً ایک سو چالیس سال تک سمرقند بابر کے اجداد کے پاس رہا تھا۔ تیموری سلطنت کا دارالخلافہ، بدنصیبی سے تیموری نسل کے ہاتھ سے نکل گیا تھا مگر اب ایک بار پھر ایک تیموری شہزادے ظہیرالدین بابر نے سمرقند حاصل کر لیا تھا۔

بابر کا دیرینہ خواب شرمندۂ تعبیر ہو گیا تھا۔ ایک بار پھر وہ سمرقند پر قابض ہو گیا تھا۔

سخت نامساعد حالات سے مقابلہ کرتے ہوئے بابر نے اپنی منزل مقصود پا لی تھی مگر آگے مشکل صورت حال اس کی منتظر تھی۔

اس کے پاس صرف دو سو چاق و چوبند سپاہی تھے اور باقی کے لئے اسے شہری عوام کی پُرجوش مگر غیر تربیت یافتہ طاقت پر بھروسا کرنا تھا۔

فصیل کے باہر شیبانی خان پانچ ہزار سپاہیوں کی ایک تازہ دَم فوج کے ساتھ موجود تھا۔ اس کے سپاہی نہ صرف بہترین ہتھیار سے مزین تھے بلکہ تربیت یافتہ اور زیرک بھی تھے اور شہر کے غیر متوقع طور پر چھن جانے پر بے حد مشتعل اور آتش انتقام میں جل رہے تھے۔

مگر ایسے میں بابر کے لئے غیب سے امداد آتی رہی۔ ایک ایک کر کے تمام مشکلات دور ہوتی رہیں۔ تمام دیہاتی علاقہ بابر کی حمایت میں اٹھ کھڑا ہوا اور قرب و جوار کے تمام قلعوں سے ازبک سپاہی ہٹا دیئے گئے۔ کچھ کو قتل کر دیا گیا، کچھ کو قید میں ڈال دیا گیا اور باقاعدہ طور پر نوجوان سلطان بابر کی حمایت کا اعلان کر دیا گیا۔

شیبانی کے حالات ابتر سے ابتر ہو رہے تھے۔ انہی نامساعد حالات میں اس نے اپنے امراء کے اہل و عیال کو بلوا لیا تھا۔ یہ فیصلہ اس نے اس وقت کیا تھا جب اسے سمرقند کی فتح یقینی نظر آ رہی تھی مگر ان لوگوں کے پہنچنے تک پانسہ پلٹ چکا تھا۔ چنانچہ شیبانی کو بخارا کی طرف لوٹ جانے میں ہی بہتری دکھائی دی۔ وہاں سے وہ بابر پر مکمل طور پر نظر رکھ سکتا تھا اور اپنے حریف پر ایک جوابی ضرب لگانے کے لئے مناسب وقت کا انتخاب کر سکتا تھا۔

بابر کو اپنی دشواریوں کا پورا احساس تھا لیکن اس نے جب تک ہو سکے، سمرقند پر اپنا قبضہ قائم رکھنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ یہ نہ صرف بابر بلکہ اس کے پورے خاندان کے لئے بھی اہم تھا۔

اپنے عزم کی ایک نمایاں علامت کے طور پر اس نے اپنی شریک حیات ماہ لقا بیگم، ماں اور بہن کو سمرقند بلانے کا فیصلہ کیا۔ وہ جانتا تھا اس کی بیوی امید سے ہے۔ کچھ ہی دنوں میں ولادت متوقع تھی۔ ایسے وقت میں اس کی خواہش تھی کہ ماہ لقا اس کے قریب ہو۔

موسم سرما کا آغاز ہو چکا تھا۔ ہواؤں میں خنکی اور ٹھنڈک رچی ہوئی محسوس ہوتی تھی۔ اکثر آسمان بادلوں سے ڈھکا رہتا۔ تقریباً آٹھ مہینوں کی جدائی کے بعد ماہ لقا بابر سے مل کر خوش ہوئی تھی۔ مگر اس کی بہن اریبہ سے یہ خوشی دیکھی نہ گئی۔ اس نے پھر سے ماہ لقا کے کان بھرنے شروع کر دیئے۔

''بھلا اس شادی کا کیا فائدہ ہوا؟'' وہ اکثر اس سے کہتی۔ ''جب سے شادی ہوئی ہے، تم کہیں وہ کہیں...... اسے اپنی فتوحات سے فرصت نہیں۔ بھلا اسے گھر، بیوی اور بچوں کی ضرورت ہی کیا ہے؟''

''ایسا تو مت کہو آپا۔'' ماہ لقا دھیمے لہجے میں جواب دیتی۔ ''تم نہیں جانتیں وہ بچے کا کس بے چینی سے انتظار کر رہے ہیں۔''

''مجھے اندازہ نہیں تھا ماہ لقا کہ تم اس قدر بے وقوف ہو۔'' اریبہ منہ بنا کر کہتی۔ ''بابر کو شوق ملک گیری کے سوا کسی چیز سے رغبت نہیں۔ تم دیکھ لینا ایک دن میری بات درست ثابت ہو جائے گی۔''

وقت گزرتا جا رہا تھا۔

سمرقند آنے کے محض تین ہفتوں بعد ہی ماہ لقا نے ایک چاند سی بچی کو جنم دیا تھا۔ بچی کا نام فخر النساء رکھا گیا۔ قتلق نگار خانم کی آرزو تھی کہ اس کے بیٹے کے گھر پہلی اولاد، اولاد نرینہ ہو۔ مگر پوتی پا کر اس نے کسی خفگی یا ناخوشی کا اظہار نہیں کیا تھا۔

بابر کو جونہی بچی کی پیدائش کی خبر ملی، وہ زنان خانے میں گیا۔

ماہ لقا سر پر کپڑا باندھے، تکیے پر سر دھرے خاموش اداس سی لیٹی تھی۔ اسے اندازہ ہو گیا تھا کہ اس کی ساس اور نند بیٹی کی پیدائش سے زیادہ خوش نہیں ہوئی ہیں۔

''ماہ لقا بیگم۔'' بابر نے اس کے بستر کے قریب آ کر نرم اور محبت بھرے لہجے میں اسے پکارا۔ ''مبارک ہو بیگم، اللہ نے ہمیں صاحب اولاد کر دیا۔'' اس نے مسرور سے لہجے میں کہا۔

ماہ لقا کے اشارے پر ایک خادمہ ننھی شہزادی کو لے آئی تھی۔

بابر نے بچی کو گود میں لے کر پیار کیا اور اسے درازی عمر اور خوش بختی کی دعا دی۔ اس کی ماں نے بچی کا نام فخر النساء رکھا تھا۔ بابر کو بھی یہ نام پسند آیا۔

''اس کی جگہ اگر بیٹا ہوتا تو......'' ماہ لقا نے دھیمی آواز میں کہنا چاہا۔

''جس رب کریم نے ہمیں بیٹی عطا کی ہے، وہ ہمیں بیٹا بھی دے گا۔ اس کی جگہ کسی اور کی ضرورت نہیں تھی۔ یہ اپنی جگہ بالکل درست ہے۔ تمہیں بھی اس بات کا ملال کرنے کی ضرورت نہیں کہ بیٹا کیوں نہیں ہوا۔''

بابر کی باتوں سے اس کا ملال جاتا رہا۔ اس نے بچی کو اٹھا کر سینے سے لگا لیا۔

مگر حسب روایت اریبہ سے اس کا اطمینان اور انبساط دیکھا نہ گیا۔ وہ زہریلے اور کٹیلے لہجے میں بولی۔ ''یہ خوب ہے، صبح سے ماں اور بہن تو اسی بات کو لے کر پیٹ رہی ہیں کہ بیٹی کیوں ہوئی، بیٹا کیوں نہیں ہوا اور سلطان محترم ہیں کہ فرما رہے ہیں اس سے کیا فرق پڑتا ہے، بیٹا ہو یا بیٹی...... ہونہہ......''

''آپا، قتلق نگار خانم یعنی خالہ بیگم یا خداوندزادہ بیگم نے براہ راست تو یہ بات نہیں کہی۔'' ماہ لقا بیگم قدرے روکھے لہجے میں بولی۔ ''میں نے بس ایسا محسوس کیا تھا، ضروری تو نہیں میں نے جو محسوس کیا ہو، وہ درست بھی ہو۔''

اریبہ بیگم منہ بنا کر خاموش ہو گئی۔

مگر اب وہ رات دن اسی کوشش میں لگی رہتی تھی کہ کسی نہ کسی طرح بابر اور ماہ لقا کے بیچ فاصلہ اور دراڑیں پیدا کی جائیں۔

اسی دوران اتفاق سے جاڑا لگ جانے کے باعث بچی کی طبیعت خراب ہو گئی۔ فوراً شاہی طبیبہ کو طلب کر لیا گیا۔ مگر اریبہ نے دوا دارو کے بجائے اپنے ٹوٹکے جاری رکھے تھے۔

اس شام بابر خاص طور پر بچی کو دیکھنے آیا۔ ''اب اس کی طبیعت کیسی ہے؟'' پھول سی بچی سوکھ کر کانٹا ہو گئی تھی۔ بابر نے تشویش بھرے انداز میں بچی کی طرف دیکھا۔ ''کیا شاہی طبیبہ اس کے علاج میں کوئی کوتاہی کر رہی ہے۔ بھلا تین ہفتوں سے علاج ہونے کے باوجود بچی کے مرض میں کچھ افاقہ دکھائی نہیں دے رہا؟''

''وہ...... دراصل...... میں نے طبیبہ سے دوا نہیں لی تھی۔'' ماہ لقا نے نگاہیں جھکا کر دھیمی آواز میں جواب دیا۔

''وہ کس لئے؟'' بابر حیران ہوا۔

''آپا اریبہ کا خیال ہے کہ چھوٹے بچوں کے لئے گھریلو ٹوٹکے ہی مناسب ہوتے ہیں۔''

ماہ لقا کے جواب نے بابر کی تیوریوں پر بل ڈال دیئے تھے۔ وہ محسوس کر رہا تھا کہ اریبہ شروع دن سے ہی اس کے اور ماہ لقا کے رشتے میں دراڑیں ڈالنے کی کوششیں کر رہی ہے مگر بابر نے آج تک کبھی کھل کر اس بارے میں اظہار خیال نہیں کیا تھا۔

آج اس نے آنکھوں میں خفگی بھر کر اریبہ کی طرف دیکھا۔ ''اریبہ بیگم، براہ کرم میری بچی کے علاج معالجے کے سلسلے میں آپ دخل نہ دیں تو آپ کی عنایت ہوگی۔''

اریبہ کا چہرہ غصے اور طیش سے سرخ ہو گیا تھا۔

''اب میری بلا سے یہ جئے یا مرے، میں کچھ کہوں گی، نہ کروں گی۔'' بابر کے جانے کے بعد اس نے پورا کمرہ سر پر اٹھا لیا۔ ''غضب خدا کا نیکی کا زمانہ ہی نہیں ہے۔ سلطان معظم مجھے ہی برا کہہ رہے ہیں۔ اب میں نے ایک لفظ بھی کہا تو جو چور کی سزا، وہ میری سزا۔''

''ارے آپا، تم بھی نا......'' ماہ لقا نے اسے منانے کی کوشش کی مگر وہ کچھ زیادہ ہی خفا ہو بیٹھی تھی۔

دو ہفتے اور بیت گئے۔ اب بچی پانچ ہفتوں کی ہو چکی تھی۔ مگر مرض بڑھتا رہا جوں جوں دوا کی، کے مصداق اس کی حالت دن بہ دن بگڑتی جا رہی تھی۔

آخر ہفتے بھر بعد جب وہ محض چھ ہفتوں کی تھی، اس دار فانی سے کوچ کر گئی۔

ماہ لقا بیگم پر غم کا پہاڑ ٹوٹ پڑا۔ مگر بابر اس قدر مصروف تھا کہ اسے اس کا غم منانے کی بھی فرصت نہ تھی۔ اس اندوہناک موقع پر بابر کی بے اعتنائی اور مصروفیت ماہ لقا کے دل میں گرہیں ڈال گئی تھی۔

اریبہ نے بھی موقع کی مناسبت سے خوب جلتی پر تیل ڈالا تھا۔

''تم مانو یا نہ مانو، میں سچ کہتی ہوں، تمہاری بیٹی بابر کے طبیبہ سے دوا لینے کے حکم کی وجہ سے ہی مری ہے ورنہ میں کچھ ہی دنوں میں اپنے ٹوٹکوں سے اسے صحت مند کر لیتی مگر سلطان معظم کو تو شاہی طبیب یا طبیبہ کا ہی علاج سمجھ میں آتا ہے۔''

رفتہ رفتہ ماہ لقا کے دل و دماغ پر بوجھ بڑھتا جا رہا تھا۔ آخر ایک رات اس نے بابر سے کہا۔ ''میں آپ سے آزادی چاہتی ہوں۔''

''کیا مطلب؟'' بابر حیران ہوا۔

''مطلب واضح ہے۔ میں آپ سے الگ ہونا چاہتی ہوں۔''

''کیسی بات کر رہی ہو بیگم۔'' بابر اچنبھے میں آ گیا تھا۔ ''بھلا ایسا کیا ہوا کہ تم گھر اور شوہر کو چھوڑ کر جانے کے لئے آمادہ ہو گئی ہو؟''

''اتنا بڑا حادثہ ہو گیا۔'' ماہ لقا نے سسکی سی لی۔ ''میری گود خالی ہو گئی، میری بچی فوت ہو گئی۔'' ماہ لقا باقاعدہ ہچکیوں سے رونے لگی۔

''میں جانتا ہوں تمہارا غم مجھ سے بالاتر ہے۔'' بابر نے دھیمی آواز میں کہا۔ ''مگر ذرا سوچو قدرت نے ہمیں دو سے ایک کر دیا ہے اور ہماری ہر چیز ہم دونوں کے لئے مشترک ہے۔ ہمارا گھر ایک ہے، ہماری خوشیاں ایک ہیں، اسی طرح ہمارے غم بھی مشترک ہیں اور اولاد بھی ہم دونوں کی تھی، وہ تمہاری نہیں میری بھی بچی تھی اور مجھے بھی اس کی موت کا انتہائی صدمہ ہے مگر مصلحت خداوندی کے سامنے کس کا بس چل سکتا ہے۔''

اسی دن سے ماہ لقا اور بابر کے مابین [illegible] فاصلہ درمیان میں پڑ گیا تھا۔

اس فاصلے کو خلیج بنانے میں اریبہ بیگم نے اہم کردار ادا کیا تھا اور بچی کی موت کے محض سات ماہ بعد وہ بابر سے طلاق لے کر اریبہ کے ساتھ اپنی ماں کے پاس چلی گئی تھی۔

بابر ہر قیمت پر سمرقند کو بچانے کے لئے کوشاں تھا۔ اس نے اپنے تمام رشتے داروں سے مدد کی درخواست کی تھی مگر کسی طرف سے کوئی خاطر خواہ مدد نہ آئی تھی۔

بابر اپنے تئیں اپنے لشکر کو مضبوط کرنے میں مصروف رہا۔ آخر کار خود کو کسی قدر مضبوط کر کے اس نے ازبکوں کے خلاف میدان میں اترنے کا فیصلہ کر لیا۔ اسے توقع تھی کہ جب وہ جنگ کی آگ میں کود پڑے گا تو لامحالہ اس کے رشتے دار اس کی مدد کو آ پہنچیں گے۔

ادھر شیبانی بھی فتوحات میں مصروف تھا۔ گزشتہ موسم گرما میں کھویا ہوا کچھ علاقہ اس نے پھر سے حاصل کر لیا تھا۔ اس نے بابر سے دو قلعے چھین لئے تھے۔ ان حالات نے بابر کو مجبور کر دیا تھا کہ وہ اپنے دشمن سے میدان میں مقابلہ کرنے کا خطرہ مول لے۔

لہٰذا دو مہینوں کی تیاری کے بعد بابر شہر سے نکلا اور کھلے میدان میں خیمہ زن ہوا۔ خندقوں اور گھنی جھاڑیوں سے اس نے اپنے پڑاؤ کو مضبوط بنایا اور دوستوں کی مدد اور دشمنوں کے حملے کا انتظار کرنے لگا۔

پہلے دشمن ہی وارد ہوا تھا۔ شیبانی اسی بات کا متمنی تھا کہ بابر سمرقند کی مضبوط فصیلوں سے باہر آ جائے۔ سو اس نے مسلسل شب خون پر شب خون مارنے شروع کئے۔ مگر تعداد میں برتری رکھنے کے باوجود وہ بابر کے مضبوط مورچے کو نہ توڑ سکا۔

اب شیبانی کی حالت پریشان کن تھی۔ وہ اپنی کوششوں سے بابر کو دوبدو لڑائی پر مجبور نہ کر سکا تھا۔ اب شیبانی کو اپنی کمک کا انتظار تھا جو نزدیک تھی۔

ادھر بابر کے پاس ترخان سردار باقی خان دو دن کی مسافت پر پہنچ رہا تھا۔ دوسری طرف سے مرزا و غلت دو ہزار سپاہیوں کو لے کر بابر کی مدد کے لئے روانہ ہو چکا تھا۔ وہ بھی محض چند گھنٹوں کی مسافت پر تھا۔

معاملات اس منزل پر تھے کہ بابر کو انتظار کرنا چاہئے تھا اور کمک پہنچنے کے بعد ہی میدان میں اترنا چاہئے تھا۔ مگر یہاں بابر سے کوتاہی ہو گئی اور وہ کمک پہنچنے سے پہلے ہی میدان میں اترا اور دانستہ اپنی فتح کو اپنے ہاتھوں گنوا دیا۔

اس شکست کے نتائج انتہائی تباہ کن ثابت ہوئے۔ بابر کے کئی بہترین سپہ سالار اس جنگ میں کام آ گئے تھے۔ کچھ سردار اسے چھوڑ کر خسرو شاہ کے پاس چلے گئے۔

اس کے کئی قریبی رشتے داروں نے اس کا ساتھ چھوڑ دیا تھا۔ اس کی بدبختی کے اس دور میں سمرقند کے علاوہ تمام علاقہ تیزی کے ساتھ شیبانی کے تسلط میں چلا گیا تھا۔ لیکن بابر کے ذہن میں اب بھی شکست تسلیم کرنے کا کوئی خیال نہ تھا۔ اس نے اپنے خاص سرداروں کی مشاورت طلب کی، ان سے مشورہ کیا۔

مشورے کے بعد اس نے فیصلہ کیا کہ قلعے کو مزید مستحکم کیا جائے اور اسی کے اندر موت و زندگی کا فیصلہ کیا جائے۔

دو تین دنوں میں شیبانی فصیلوں کے اس پار آ اترا۔ جلد ہی اس نے شہر کو پوری طرح گھیرے میں لے لیا۔ قلعہ بند فوج کی تعداد بہت کم تھی۔ شیبانی کا محاصرہ کئی ماہ جاری رہا۔ رسد میں کمی ہونے لگی۔

غریب رعیت کتے اور گدھے کا گوشت کھا کر گزارہ کرنے لگی اور قلعہ بند فوج کے گھوڑوں کے لئے محض پتیاں اور لکڑی کی چھپت چارے کے طور پر ملنے لگی۔

بابر نے ہر طرف، ہر جگہ مدد کے لئے بار بار ایلچی اور پیامبر بھیجے مگر کہیں سے مدد تو درکنار، کوئی حوصلہ افزا جواب تک نہ آیا۔

بابر کی حالت بہت مایوس کن تھی۔ اس کے قریبی ساتھیوں نے بھی اس کا ساتھ چھوڑنا شروع کر دیا تھا۔ آخر تھک ہار کر وہ شیبانی سے صلح کرنے پر مجبور ہو گیا۔

بابر کو کہا گیا کہ وہ غیر مشروط طور پر شہر کو شیبانی کے حوالے کر دے اور خود اپنے خاندان کے افراد کو لے کر روانہ ہو جائے اور پروانہ راہداری حاصل کرنے کے لئے بطور تاوان اپنی بہن خداوندزادہ بیگم کی شادی شیبانی خان سے کر دے۔

''یہ شرط میرے لئے ناممکن ہے۔'' بابر نے غصے بھرے لہجے میں کہا۔ ''کچھ بھی ہو جائے، میں اپنی پھول سی بہن کو اس شیطان کے حوالے نہیں کروں گا۔''

''سلطان معظم! آپ جانتے ہیں اس علاقے میں صلح کے یہی طریقے ہیں۔'' شفیق خان نے دھیمی آواز میں کہا۔ ''آپ کو یہ شرط ماننی پڑے گی۔''

''نہیں شفیق خان، میں اپنی جان دے دوں گا مگر اپنی بہن کو......'' بابر بے بس سے انداز میں تڑپتے لہجے میں گویا ہوا۔

''بابر میرے برادر عزیز۔'' اسی لمحے خداوندزادہ بیگم اندر آ گئی۔ ''مجھے شیبانی کی اس شرط میں کچھ قباحت نظر نہیں آتی۔ یہ تو یہاں کا دستور ہے۔ میں خود اس شرط کو ماننے کو تیار ہوں۔ اب تمہیں کوئی تشویش نہیں ہونی چاہئے۔''

آخر کار مجبوراً بابر کو شیبانی کی یہ شرط ماننی پڑی۔ اس بات سے بابر کی خودداری کو سخت صدمہ پہنچا تھا۔ اب وہ پھر ایک جہاں گرد تھا کیونکہ فرغانہ اس کے چھوٹے بھائی جہانگیر کے قبضے میں تھا اور سمرقند قبضے سے نکل جانے کے بعد بابر کے پاس کچھ نہ بچا تھا۔

وہ آدھی رات کے وقت اپنی والدہ اور ساتھیوں کے ساتھ شہر سے نکلا اور اتیپہ کی طرف روانہ ہو گیا اور کچھ عرصے بعد وہ ویزک جا پہنچا۔

اب بابر کو موسم سرما گزارنے کے لئے ایک جائے پناہ کی تلاش تھی۔ چنانچہ وہ اپنے ایک ماموں کے کہنے پر ایک گاؤں میں ایک عام شہری کی طرح زندگی گزارنے پر آمادہ ہو گیا۔

وہ گاؤں کے مکھیہ مقدم خان کے گھر رہ رہا تھا۔ مقدم کی والدہ بے حد بوڑھی تھی۔ وہ اکثر گزشتہ زمانوں کے قصے بیان کرتی تھی۔ اسی کے ذریعے بابر کو پتا چلا کہ اس کے کچھ رشتے دار تیمور کے ساتھ ہندوستان گئے تھے۔ اس نے بابر کے مورث اعلیٰ کے کارناموں کے جو قصے سنائے، انہوں نے بابر کے خیالات میں ایک جوش و ہیجان پیدا کر دیا۔ اب اس کے ذہن میں ہندوستان میں تیمور کی فتوحات کو تازہ کرنے کا خیال ہلچل مچانے لگا۔

بابر کی آنکھوں نے ایک نیا خواب دیکھنا شروع کر دیا تھا۔

ہندوستان میں تیموری فتوحات کو تازہ کرنے کا خواب...... لیکن اس خواب کے شرمندۂ تعبیر ہونے سے پہلے بہت سے مصائب کا بہادری سے مقابلہ کرنا تھا۔ بہت سی دشواریوں کو پامردی سے راستے سے ہٹانا تھا۔

فی الوقت وہ ایک پہاڑی شخص کی سی زندگی بسر کر رہا تھا۔ وہ اکثر آس پاس کی پہاڑیوں پر بلاوجہ پھرا کرتا۔ اس کے پیر جوتوں سے محروم رہتے۔ بہت زیادہ ننگے پیر گھومنے کی وجہ سے اس کے پیر اس قدر سخت اور کھردرے ہو گئے تھے کہ نوکیلے پتھروں سے انہیں کوئی فرق نہ پڑتا تھا۔

اسی دوران شیبانی کے لوٹ آنے کی خبر ملی۔ بابر اپنے چند انتہائی وفادار رفقاء کار کے ساتھ اس پر ایک ضرب لگانے کے خیال سے روانہ ہوا۔ مگر اس کے پہنچنے سے پہلے ہی شیبانی واپس چلا گیا۔ مجبوراً بابر کو بھی واپس آنا پڑا۔ اسی دوران راستے میں اس کا یار غار نویان کلتش موت کے منہ میں چلا گیا۔

اس کی موت نے بابر کو بری طرح اداس کر دیا تھا۔ وہ کئی دنوں تک مسلسل اشک بہاتا رہا تھا۔ اس غم سے باہر آیا تو وہ اپنے چند ساتھیوں کے ساتھ تاشقند چلا گیا۔

تاشقند کے دوران قیام میں وہ بے حد ناخوش اور رنجیدہ تھا۔ اس کے پاس نہ کوئی علاقہ تھا، نہ اس کی کوئی آس تھی۔ بیشتر ساتھی اسے چھوڑ کے جا چکے تھے۔ جو رہ گئے تھے، وہ غربت و افلاس کی وجہ سے اس کے ساتھ چلنے سے معذور تھے۔

یہ دن بابر کے لئے بڑے صبر آزما تھے۔ اس کی بیشتر پریشانیوں کا سبب اس کی بیکاری تھی۔ اس کی قوت و توانائی کا کوئی مصرف موجود نہ تھا۔ وہ اس بے عمل زندگی سے تنگ آ چکا تھا۔ اگرچہ اب اس نے شاعری شروع کر دی تھی مگر وہ بھی اس کے لئے باعث تسکین نہ تھی۔

اس بے مصرف و بے مقصد زندگی سے عاجز آ کر اس نے چین جانے کا ارادہ کر لیا۔ یہ ایک ایسا ملک تھا جہاں جانے کی بابر کو ہمیشہ ہی خواہش رہی تھی کیونکہ وہ ایک دور افتادہ اور خطرناک سفر پر تھا، اس لئے وہ ایسا نہ کر سکا۔

آخر اس نے اپنے ماموں خان اصغر سے ملنے کا فیصلہ کیا۔

خان اصغر عجب نرالے اطوار کا انسان تھا۔ تلوار کا زبردست دھنی، بے حد بہادر، دلیر۔ وہ اپنی شمشیر سے کبھی جدا نہ ہوتا تھا۔ ایک الگ تھلگ مقام پر پرورش پانے کی وجہ سے وہ کسی قدر اجڈ اور اکھڑ مزاج واقع ہوا تھا۔ اس کے باوجود آداب و مراسم کا سخت قائل تھا۔

جب وہ بابر سے ملا تو بابر کی شخصیت سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ اس نے بابر کے لئے ایک لباس فاخرہ بنوایا جسے پہن کر بابر کی ہیئت ہی بدل گئی تھی۔ اس کا دست راست خواجہ ابوالکارم بھی اس کو اس وقت نہ پہچان سکا جب وہ اپنے ماموں کے ساتھ گھوڑے پر جا رہا تھا۔

بابر کے ماموں نے فیصلہ کیا کہ اس کے بھائی جہانگیر سے علاقہ چھین کر بابر کے حوالے کر دیا جائے۔ مگر اس کے لئے اندجان کے حقیقی حاکم احمد تنبل سے مقابلہ کرنا ناگزیر تھا۔ مگر بابر اور اس کے رشتے دار یہ مقابلہ جیت نہ سکے۔ مجبوراً بابر کو جان بچا کر ہوشیار کے پہاڑی علاقے میں روپوش ہونا پڑا۔ تقریباً ایک سال تک وہ نہایت اذیت و مصیبت کی حالت میں اِدھر اُدھر گھومتا رہا اور اس دوران اس کی سلامتی کا دارومدار اس علاقے کے نیم وحشی قبیلوں کی دوستی پر تھا۔

اس بے خانماں حالی کے دور میں اس کے صرف تین سو ساتھی اس کے ساتھ تھے۔ نیم برہنہ صرف لاٹھیوں سے مسلح، پاؤں میں خام چمڑے کے جوتے اور اکثر کے پاؤں تو جوتوں سے ہی محروم تھے۔ جسم پر چیتھڑے جھولتے ہوئے، پوری جماعت کے پاس صرف دو خیمے تھے۔ ایک خیمہ اس نے اپنی ماں قتلق نگار خانم کو دے دیا تھا جو کسی طرح شیبانی سے بچ بچا کر بابر تک آ پہنچی تھی۔

ابو سعید مرزا کا پوتا اور عمر سعید مرزا جسے عمر شیخ مرزا کے نام سے بھی اکثر مورخوں نے یاد کیا ہے، کا بیٹا...... ظہیرالدین بابر تقدیر کی ٹھوکروں میں دربدر ہوتا آخر کار کابل کی طرف روانہ ہو گیا۔

☆......☆......☆

کابل، بابر کے چچا الغ بیگ مرزا کی ملکیت میں تھا۔ جہاں پہلے اس نے شہزادے کی حیثیت سے اور پھر اپنے والد ابو سعید مرزا کے انتقال کے بعد خود مختار بادشاہ کے طور پر حکومت کی۔ اسی برس الغ بیگ مرزا کا انتقال ہو گیا اور اس نے ایک طفل شیرخوار عبدالرزاق جانشین چھوڑا تھا۔ اسی لئے ملک میں طوائف الملوکی پھیل گئی۔ جو شخص بھی چند ہزار سپاہی جمع کر سکتا تھا، اس نے آزادی کا اعلان کر دیا۔

ایسے میں ذاکر بیگ نامی ایک شخص آگے بڑھا اور اقتدار پر قابض ہو گیا۔ مگر وہ کوئی اچھا حکمران ثابت نہ ہوا۔ اس نے ظلم و استبداد کا ایسا بازار گرم کیا کہ جلد ہی اس کے چند غلاموں نے مل کر اس کے ناپاک وجود سے زمین کو پاک کر دیا۔

ذاکر بیگ کے قتل کے بعد ملک میں ہر سمت نئے سرے سے بدنظمی پھیل گئی جس کے باعث بیرونی حملہ آوروں کو دعوت دی گئی۔

گرم شیر کے قریبی ضلع پر ذوالنون بیگ ارغن کی حکومت تھی جو سلطان احمد مرزا کا قدیم رسالہ دار تھا۔

کابل کے حالات کا فائدہ اٹھاتے ہوئے ذوالنون کے سب سے چھوٹے بیٹے محمد مقیم نے ہزارہ کے سپاہیوں کی ایک جمعیت کے ساتھ ملک پر حملہ کر دیا اور حقیقی وارث عبدالرزاق کو افغانوں کے پاس پناہ لینے پر مجبور کر دیا۔

جب بابر نے کابل پر نظر ڈالنی شروع کی تو محمد مقیم نہ صرف دارالخلافہ پر قبضہ کر چکا تھا بلکہ اس نے سابقہ حکمرانوں کی ایک بیٹی سے شادی کر کے اپنی حیثیت کچھ اور مستحکم کر لی تھی۔

بابر کے لئے یہ لمحۂ فکریہ تھا۔ وہ کابل کو اپنے خاندان کی گرفت سے ہرگز نکلنے نہ دینا چاہتا تھا۔ اگرچہ اس وقت اس کے وسائل بے حد کم تھے لیکن کرائے کے منگول سپاہی جو خسرو شاہ کی ملازمت میں تھے، بہت مرتبہ اس کی خدمت میں آنے کی خواہش ظاہر کر چکے تھے۔ یہ لوگ ہمیشہ ہی اپنی حفاظت کی فکر میں رہنے کے عادی تھے۔ چنانچہ جوں ہی انہیں اندازہ ہوا تھا کہ خسرو شاہ کو کسی بھی لمحے شیبانی، سوکھی گھاس کے ایک بے قیمت تنکے کی طرح بہا کر لے جائے گا، وہ سب خود کو بہت غیر محفوظ سمجھنے لگے تھے۔ اب ان کی نگاہیں بابر کی طرف لگی تھیں۔

بابر ایک خاندانی شہزادہ تھا اور بدبختی کے اس دور میں عمل کے لئے ایک ایسا میدان ڈھونڈ رہا تھا جو اسے ازبکوں کی رسائی سے باہر رکھے۔ جب قندز کی طرف شیبانی کی پیش قدمی کی خبر ملی اور اس کے باعث خسرو شاہ اپنے علاقے چھوڑ کر کابل کی طرف بڑھا تو منگول سپاہیوں نے اس کا ساتھ چھوڑنے کا ارادہ باندھ لیا۔

اگرچہ بابر منگولوں کو ان کی بدعادات کے باعث پسند نہیں کرتا تھا۔ مگر اس موقع پر وہ ان منگول سپاہیوں کو اپنے ساتھ ملا کر خسرو شاہ کو سزا دینے کا خواہش مند تھا۔

وہ خسرو شاہ سے شدید نفرت کرتا تھا کیونکہ وہ ایک کمینہ اور کینہ پرور انسان تھا۔ اس نے بابر کے ایک چچا زاد بھائی باستغر مرزا کو قتل کیا تھا جبکہ اس کے چھوٹے بھائی علی مرزا کی آنکھیں نکلوا دی تھیں۔ اس کے علاوہ اس سے بابر کی نفرت کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ خسرو شاہ ایک ابن الوقت انسان تھا۔ وہ اعلیٰ تعلیم اور اعلیٰ تربیت کے علاوہ اعلیٰ حسب نسب سے بھی محروم تھا جس کے باعث اس کے اندر وحشیانہ عادات پائی جاتی تھیں۔ وہ ایک سنگ دل، ظالم اور بے رحم انسان تھا۔

چنانچہ ان باتوں کو مدنظر رکھتے ہوئے بابر نے خسرو شاہ کے برگشتہ منگول سپاہیوں کو اپنے ساتھ ملانے میں کوئی اخلاقی عار محسوس نہ کی۔

خسرو شاہ کے تمام سپاہی بابر کے پاس چلے آئے، حتیٰ کہ اس کے پاس ایک سپاہی بھی نہ رہا۔ مجبوراً وہ خود بھی بابر کی خدمت میں اس شرط پر آنے کو تیار ہو گیا کہ اس کی جاں بخشی کے ساتھ اس کی ذاتی املاک کا احترام کیا جائے۔

بابر جلد از جلد اس علاقے سے نکل جانا چاہتا تھا جہاں وہ اس وقت موجود تھا۔ چنانچہ وہ درمیانی راستے سے گزرتا ہوا کابل کی سمت روانہ ہو گیا۔ ارغون قبیلے پر اس نے حملہ کر کے غیر متوقع طور پر فتح حاصل کر لی تھی۔ اب وہ آگے بڑھا اور کابل پر حملہ آور ہوا۔

مقیم نے محض ایک معمولی سی مدافعت کے بعد کابل بابر کے حوالے کر دیا۔ بغیر کسی جنگ، بغیر کسی جدوجہد کے بابر نے خدا کی مہربانی سے کابل، غزنی اور اس کے ماتحت علاقوں کو حاصل کر لیا تھا۔

بابر کو کابل کی اہمیت کا پورا احساس تھا۔ اس علاقے کا مالک بننے کے بعد وہ مغرب میں سمرقند یا مشرق میں ہندوستان کی طرف قدم بڑھا سکتا تھا۔ کابل پر قبضے کے بعد بابر کے پاس ایک ٹھکانہ ہاتھ آ گیا تھا جہاں سے وہ اپنے ازبک دشمنوں کے خلاف کارروائی کر سکتا تھا۔ ان کے خلاف کامیابی حاصل کرنا ہی وہ واحد عزم تھا جس میں وہ کافی عرصے تک الجھا رہا۔ جب تک مغرب میں اس کے تمام منصوبے پوری طرح خاک میں نہ مل گئے، اس وقت تک یعنی تقریباً بارہ سال تک اس نے ہندوستان کی طرف متوجہ ہونے کا ارادہ نہ کیا۔

تقریباً ایک سال تک وہ اپنی نئی مملکت کے معاملات میں پوری طرح مشغول رہا۔ پہلا کام مال غنیمت کی تقسیم کا تھا۔ اس وقت وہ اپنے بھائیوں جہانگیر مرزا اور ناصر مرزا کو نہیں بھولا تھا۔ جہانگیر مرزا کو غزنی اور اس کے ماتحت علاقے دیئے گئے اور ناصر مرزا کو ضلع نہار کے ساتھ کچھ اور علاقے بھی ملے۔

موسم گرما کے آغاز سے ہی بابر کی والدہ قتلق نگار خانم کی طبیعت خراب ہو گئی تھی۔ بابر تمام مصروفیات ترک کر کے ماں کے علاج معالجے میں لگ گیا۔ اسے اپنی ماں بے حد عزیز تھی جس نے ہر مشکل لمحے میں اس کا ساتھ دیا تھا اور ہمیشہ اس کے لئے دامن دعا وا رکھا تھا۔ مگر اس کی تمام تر توجہ اور علاج معالجے کے باوجود قتلق نگار خانم تادیر زندہ نہ رہ سکی، اور ایک گرم اور سیاہ رات میں وہ اپنے مالک حقیقی سے جا ملی۔

ماں کی موت بابر کے لئے کسی سانحے سے کم نہ تھی۔

وہ اس صدمے سے بیمار پڑ گیا۔ اسے شدید بخار نے جکڑ لیا تھا۔ کئی دن وہ عالم فراموشی میں پڑا رہا۔ اس کے وفاداروں کو تشویش ہونے لگی۔ دوسرے شہروں سے اطباء بلوائے گئے۔ آخر کئی روز کی مسلسل کوشش کے بعد افاقہ کے آثار شروع ہوئے اور کئی روز تک مدہوش رہنے کے بعد بابر نے آنکھیں کھولیں۔

بابر پوری طرح صحت یاب نہیں ہوا تھا کہ کابل میں زلزلہ آ گیا اور اس آسمانی افتاد سے بہت زیادہ نقصان ہوا۔

بابر اپنے اگلے اقدام کے بارے میں سوچ ہی رہا تھا کہ سلطان حسین مرزا بیقرہ نے خاندان تیموری کو ازبک دشمنوں کے خلاف متحدہ حملے کے لئے اپنی قیادت میں جمع ہونے کی دعوت دی۔

بابر نے اس دعوت پر لبیک کہا۔ یہ شیبانی سے شدید نفرت کا ردعمل نہیں تھا بلکہ وہ حقیقت میں ازبکوں کو سبق سکھانا چاہتا تھا۔ لیکن اسے ایک بار پھر ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا کیونکہ ابھی سلطان حسین ازبکوں کے خلاف اپنی فوج لے کر نکلا ہی تھا کہ اچانک اس کا انتقال ہو گیا۔

بابر نے اس کی موت کی خبر نہایت مایوسی کے عالم میں سنی۔

اب وہ چوبیس سال کا ہو چکا تھا۔ اس زندگی نے اسے ایک مرد میدان اور ایک تجربے کار حکمران بنا دیا تھا۔ مگر ابھی اس کی تقدیر میں بہت مصیبتیں اور صعوبتیں لکھی ہوئی تھیں۔ بابر نے قدم بہ قدم چل کر اپنے لئے وہ راستہ اختیار کرنے میں کامیابی حاصل کی جس کے ذریعے وہ سلطنتِ ہندوستان کے حصول میں کامیاب ہو سکتا تھا۔

قندھار سے شیبانی کے واپس چلے جانے کے بعد بابر نے فیصلہ کیا کہ آل تیمور کے سربراہ ہونے کی جو حیثیت اس کو ایک طویل عرصے سے حاصل رہی ہے، اب اس کا باضابطہ اعلان بھی ہونا چاہئے۔

اس زمانے تک تیمور خان کے تمام حکمراں مرزا کہلاتے تھے۔ لیکن بابر نے حکم جاری کیا کہ آئندہ اسے بادشاہ کہا جائے۔

انہی دنوں اس کی زندگی میں معصومہ بیگم داخل ہوئی تھی۔

معصومہ بیگم سلطان احمد مرزا کی چھوٹی بیٹی تھی۔ اسے دیکھتے ہی بابر کو اپنی دھڑکنیں منتشر ہوتی محسوس ہوئی تھیں۔ چنانچہ اس نے اس کی ماں حبیبہ بیگم کے پاس شادی کا پیغام بھیجا۔ یہ طے پایا کہ بابر جب کابل پہنچے تو حبیبہ بیگم اپنی صاحبزادی معصومہ بیگم کو لے کر کابل پہنچ جائیں اور وہیں نکاح کی تقریب منعقد کر لی جائے گی۔

اس دوران بابر نے قندھار میں شاہ بیگ اور مقیم سے لڑائی کا فیصلہ کیا۔ دونوں قندھار کی بنی گاہ میں شامیانہ تانے قیام پذیر تھے کیونکہ یہاں محلات اور باغات تھے، اس لئے اس مقام پر معرکہ آرائی نامناسب معلوم ہوئی۔ چنانچہ بابر نے مرغزار کی ندی کے کنارے قندھار کی جانب قیام کیا۔

کچھ ہی دیر میں دشمن کی آمد کی اطلاع ملی۔ بابر نے اپنے آدمیوں کو یکجا کیا جن کی تعداد دو ہزار کے قریب تھی اور مقابلے کی تیاری شروع کی۔

دشمن کی فوج کے دو حصے تھے، ایک شاہ بیگ ارغون کے تحت اور دوسرا اس کے بھائی مقیم کے۔ سپاہیوں کی تعداد کوئی سات ہزار کے قریب ہوگی۔

سہ پہر کے وقت جنگ کا آغاز ہوا اور رات ڈھلے تک بابر کو فتح حاصل ہو گئی۔ بابر کو اس قدر جلد فتح کی امید نہ تھی۔ مگر خدا کے فضل و کرم سے ایسا ہو گیا تھا۔ شاہ بیگ اور مقیم نے راہ فرار اختیار کی۔

بابر شہر کے کھلے دروازے سے اندر داخل ہوا۔ سب سے پہلے وہ مقیم کے خزانے کی تلاش میں سرگرداں ہوا۔ خزانہ قلعہ سنگین میں تھا۔ خزانہ حاصل کر کے ناصر مرزا کو عطا کیا اور خود کابل کے لئے روانہ ہو گیا۔

قندھار میں خزانہ تقسیم کرنے کی مہلت نہ ملی تھی لہٰذا قراباغ میں ٹھہر کر خزانہ تقسیم کیا گیا۔ گننا مشکل تھا، ترازو میں تول تول کر دینا شروع کیا۔ امیروں، سرداروں، سپاہیوں اور خدمت گاروں نے تھیلے اور طباق بھر بھر کے اپنی تنخواہیں وصول کیں۔ غرض بے اندازہ مال و متاع اور عزت و تکریم کے ساتھ آخر کار بابر کابل کی طرف پھرا۔

بہت مدت کے بعد ایسی عزت اور اتنی دولت ہاتھ آئی تھی۔ کچھ سکون اور فراغت بھی نصیب ہوئی۔ اب وہ اپنے خاندان کی بنیاد ڈالنا چاہتا تھا۔ ماں اب موجود نہ تھی جو اس کے گھر بسانے کی فکر کرتی جبکہ وہ گھر بسانے کا متمنی تھا۔

سو اس نے سلطان احمد مرزا کی بیٹی معصومہ بیگم کو کابل بلا بھیجا۔ طے یہی پایا تھا کہ جب بھی حالات نے اجازت دی، وہ معصومہ بیگم سے نکاح کرے گا۔ اب حالات اس نہج پر آ گئے تھے کہ وہ یہ خوش آئند قدم اٹھا سکتا تھا۔

نیلے آسمان پر سنہری چاند مسکرا رہا تھا۔ ننھے ننھے ستارے پلکیں جھپک جھپک کر دیکھ رہے تھے۔ ہواؤں میں راحت اور لذت کا احساس رچا ہوا تھا۔

آج بابر کا معصومہ بیگم سے نکاح ہونا قرار پایا تھا۔ گھنی پلکوں سے سجی بڑی بڑی سحر انگیز آنکھوں والی نازک اندام معصومہ بیگم، کہ جسے ایک نگاہ دیکھتے ہی بابر کے دل میں ایک نیا احساس جاگا تھا اور وہ پہلی ہی نگاہ میں اس کے دلکش چہرے اور حسین و رعنا سراپے پر دل و جان سے فدا ہو گیا تھا۔ سو آج وہی معصومہ بیگم ہمیشہ ہمیشہ کے لئے اس کی زندگی میں چلی آئی تھی، مہکتی بہار کے معطر جھونکے کی طرح۔

باہر رات بھیگ رہی تھی، غنچے چٹخ رہے تھے، ہواؤں میں نوشگفتہ گلوں کی مہک رچی ہوئی تھی۔ اندر بابر، معصومہ کے حسن بلاخیز کے نظاروں میں ڈوبا ہوا تھا۔ ایک مدت بعد زندگی اس قدر مہرباں اور خوبصورت ہوئی تھی۔

(جاری ہے)

ظہیر الدّین بابر

اشتیاق فاطمہ عظمیٰ

قسط : 11

ایک عمر بے بسی اور الم نصیبی کے دشت میں آبلہ پا سفر کے بعد گیسوؤں کی گھنی چھاؤں اور پلکوں کی ریشمیں چلمن تلے شب بسری کا موقع ملا تھا۔

آکاش کے نیلے ساگر میں رات کی ناؤ سبک رفتاری سے صبح کے ساحل کی اور بڑھ رہی تھی۔ دور مشرق کی جانب سے قرمزی پہاڑیوں کی اوٹ سے صبح کاذب کے اجالے پھوٹتے ہی بابر چشم و گیسو کے لطف کو نظر انداز کر کے خواب گاہ سے باہر آ گیا تھا۔ خدام نے حمام تیار کر رکھا تھا۔ غسل سے فارغ ہوتے ہی وہ نماز فجر کی ادائیگی کے لئے مسجد کی طرف روانہ ہو گیا۔

مسجد کے دروازے پر بابر کا ایک رفیق خاص قاسم بیگ منتظر تھا۔

''صبح بخیر سلطان محترم۔'' قاسم بیگ نے قدرے جھک کر اس کا استقبال کیا۔ ''امید ہے رات بہت اچھی گزری ہوگی۔'' اس کے سنجیدہ لہجے میں بے نام سی شوخی تھی۔

''ہاں کیوں نہیں۔'' بابر جھینپ کر مسکرایا۔ ''امید ہے کہ تم بھی بخیر ہو گے۔''

قاسم بیگ، بابر کے ان چنیدہ ساتھیوں میں سے تھا، جنہوں نے انتہائی نامساعد حالات میں بھی بابر کا ساتھ نہیں چھوڑا تھا۔ خاص طور پر قاسم بیگ نے تو اس وقت بھی بابر کا ساتھ دیا تھا جب اس کے انتہائی وفادار ساتھی افلاس اور بھوک کے ہاتھوں عاجز ہو کر دوسرے درباروں کو جانے پر مجبور ہو گئے تھے۔

ایسے ہی ایک بدترین لمحے میں بابر نے قاسم بیگ سے کہا تھا۔ ''قاسم، تم میری حالت دیکھ رہے ہو، سر پر عمامہ نہیں، پیر میں جوتی نہیں، روٹی کا آسرا ہے، نہ اس کی امید، سب ہی وفادار ایک ایک کر کے رخصت ہوئے، اگر تمہیں بھی زندگی عزیز ہے تو مجھے میرے حال پر چھوڑ کر کسی جانب نکل جاؤ، بخدا مجھے تم سے کوئی شکوہ نہ ہوگا۔''

''میرے آقا۔'' قاسم بیگ نے بابر کا ہاتھ تھام کر اسے آنکھوں سے لگاتے ہوئے کہا تھا۔ ''زندگی باقی رہے یا ختم ہو جائے مگر یہ بندۂ ناچیز آپ کا ساتھ نہیں چھوڑ سکتا، جو انسان برے حالات میں ساتھ نہ دے تو اسے دوست کیونکر کہا جا سکتا ہے۔ مجھے ہر حال اور ہر دور میں آپ اپنے ساتھ پائیں گے کیونکہ میں آپ کا دوست اور دم ساز ہوں۔''

اُس پل بابر کی آنکھوں میں احساس تشکر سے آنسو بھر آئے تھے۔ اس دن کے بعد بابر نے کبھی قاسم کو خود سے جدا نہ کیا تھا۔ وہ اس کا رفیق، دم ساز اور مقرب خاص تھا۔ نکاح کی اس تقریب کے تمام انتظامات اسی نے کئے تھے۔

''آقا، اس پل آپ کو خوش اور مطمئن دیکھ کر بس دل سے یہی دعا نکلتی ہے۔'' قاسم بیگ نے آگے بڑھ کر مؤدبانہ لہجے میں کہا۔ ''کہ اللہ تعالیٰ جلد از جلد آپ کو فرزندِ طالع نصیب سے سرفراز کرے۔''

''آمین۔'' بابر کے منہ سے بے ساختہ نکلا۔ پھر وہ قاسم کا ہاتھ پکڑ کر مسجد میں داخل ہو گیا۔

ابھی شادی کی تقریب کو ہفتہ بھر نہ گزرا تھا کہ اس شام بابر، قاسم بیگ اور دیگر مصاحبین کے ساتھ ایوان خاص میں متمکن تھا کہ ناصر مرزا کا ایک پیغام رساں حاضر ہوا۔

''بادشاہ سلامت۔'' دروازے پر ایستادہ خدام میں سے ایک نے ایوان میں داخل ہو کر گزارش کی۔ ''سلطان ناصر مرزا کا قاصد آیا ہے جو بادشاہ سلامت کی خدمت میں کوئی اہم خبر پیش کرنا چاہتا ہے۔''

''اسے پیش کیا جائے۔'' بابر نے چونک کر قاسم بیگ کی طرف دیکھتے ہوئے حکم دیا۔

اگلے ہی لمحے ناصر مرزا کا قاصد ایوان میں داخل ہوا۔

''بادشاہ سلامت۔'' اس نے سر اور گھٹنوں کو خم دے کر بابر کی خدمت میں تعظیم پیش کی۔ پھر نہایت دھیمی اور باادب آواز میں گویا ہوا۔ ''بادشاہ سلامت، ناصر مرزا کی طرف سے اطلاع بہم پہنچائی جاتی ہے کہ شیبانی خان نے قندھار کو چاروں طرف سے گھیر لیا ہے۔''

بابر نے چونک کر قاسم بیگ کی طرف دیکھا۔ اس پل اسے اس کی دانائی اور دوراندیشی کا اعتراف کرنا پڑا تھا۔ اسی کے اصرار پر وہ قندھار سے نکلا تھا۔ قندھار ناصر مرزا کے حوالے کر کے وہ کابل کے لئے روانہ ہو گیا تھا۔

قندھار کا سابقہ حاکم مقیم خان بھاگنے میں کامیاب ہو گیا تھا اور وہ شیبانی خان سے مل گیا تھا۔ اسی کے اکسانے پر شیبانی خان نے کوہستان کے راستے قندھار پر دھاوا بولا۔ بابر تو قاسم بیگ کی دانائی کے باعث قندھار سے نکل چکا تھا چنانچہ شیبانی خان نے ناصر مرزا کو گھیر لیا۔

یہ خبر ملتے ہی بابر نے فوری طور پر اپنے امراء اور جنگی سرداروں کو طلب کیا اور اس سلسلے میں مشاورت شروع کی تھی۔

''بادشاہ سلامت!'' بوڑھے امیر رافع چغتائی نے مؤدبانہ لہجے میں کہا۔ ''ازبک جیسی قوم اور شیبانی خان جیسا گھاگ دشمن، جس نے امیر تیمور کی اولاد سے ان کے مقبوضہ علاقے چھین لئے۔ ترکوں اور چغتائیہ خاندان سے جو جہاں تھا، کوئی خوشی اور کوئی بحالت مجبوری اس سے مل گیا ہے۔ صرف ایک آپ ہیں جو اس کے مقابل ہیں اور کابل پر قابض ہیں۔''

''ایسی صورت میں ہمیں کیا کرنا چاہئے؟'' بابر نے سنجیدہ لہجے میں سوال کیا۔

''دشمن بہت طاقتور ہے۔'' قاسم بیگ نے دھیمے اور گمبھیر لہجے میں کہا۔ ''اور ہم نہایت ضعیف، نہ صلح کی امید نہ مقابلے کی تاب۔ ایسی حالت میں اپنے لئے کوئی اور مقام تلاش کرنا ہی قرین قیاس ہے۔''

''اوہ۔'' بابر نے گہرا سانس لے کر سوالیہ نظروں سے قاسم بیگ کی طرف دیکھا۔

''ایسے میں ہمیں کہاں کا رخ کرنا چاہئے؟''

''آقائے محترم۔'' قاسم بیگ تدبر بھرے لہجے میں بولا۔ ''ابھی موقع ہے۔ ہمارے پاس وقت بھی ہے، ہم کہیں بھی جا سکتے ہیں۔ ویسے ایک آسان راستہ یہ ہے کہ دشمن سے دور چلے جائیں۔ جتنی دور نکل سکتے ہیں، نکل جائیں...... ہندوستان یا بدخشاں کی طرف نکل چلنا چاہئے۔''

''ٹھیک ہے۔'' بابر نے کئی لمحوں تک گہری سوچ میں ڈوبے رہنے کے بعد سوال کیا۔ ''پھر اس وقت ہمیں کسی ایک جگہ کا انتخاب کر لینا چاہئے، ہندوستان یا بدخشاں۔ رافع چغتائی آپ کی کیا رائے ہے؟''

''بادشاہ سلامت، میرا خیال ہے کہ ہمیں ہندوستان کی طرف کوچ کرنا چاہئے۔'' رافع چغتائی نے سر جھکا کر جواب دیا۔

''اور قاسم بیگ، تم کیا کہتے ہو؟'' بابر، قاسم کی دانائی و دوراندیشی ہی نہیں، اس کی محبت وفا اور جاں نثاری پر بھی یقین رکھتا تھا۔ ''کیا ہمیں ہندوستان کی طرف جانا چاہئے یا بدخشاں کی جانب؟''

''قاسم بیگ اور میری ناقص رائے میں بدخشاں کا قصد کرنا زیادہ مناسب ہوگا۔'' ایک اور امیر شیرم طغائی نے قاسم بیگ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اپنی رائے کا اظہار کیا۔ اس گفتگو اور مشاورت کے بعد بابر نے عفان کی طرف توجہ کی۔

قندھار اور قلات کی فتح کے وقت بابر نے قندھار ناصر مرزا اور قلات عبدالرزاق مرزا کو دے دیا تھا۔ جب شیبانی خان نے قندھار کو گھیرے میں لے لیا تو عبدالرزاق بھی قلات میں نہ ٹھہر سکا اور حالات کے بدلتے ہی قلات چھوڑ کر بابر کے پاس کابل چلا آیا تھا۔ چنانچہ اس موقع پر کابل عبدالرزاق مرزا کے حوالے کر کے بابر نے روانگی کی ٹھانی۔

قاسم بیگ اور دیگر کچھ امراء کی رائے تھی کہ بدخشاں کی جانب جایا جائے مگر زیادہ امراء اس بات پر متفق اور بضد تھے کہ ہندوستان کی طرف روانہ ہوا جائے۔ سو بابر نے یہ طے کیا کہ فی الحال یہاں سے نکلا جائے۔ پھر بعد میں طے کیا جائے گا کہ کہاں جانا ہے اور کیونکر واپس آنا ہے۔

رات اپنی تمام تر ظلمت کے ساتھ کابل پر سایہ فگن تھی۔ بابر اپنے ساتھیوں اور لشکر کے ساتھ چھوٹے کابل کی راہ سے شرح رباط میں داخل ہوا۔ اگلی شام تک کے سفر کے بعد وہ سائی کوتل تک پہنچ چکے تھے۔

یہاں کابل اور عفان کے بیچ کے علاقے میں جو لوگ آباد تھے، وہ امن کے زمانے میں بھی چوری اور ڈاکے سے نہ چوکتے تھے اور افراتفری اور جنگ کے ایام میں تو گویا ان کی بن آتی تھی۔ ان موقعوں سے خوب ہی فوائد حاصل کرتے تھے۔ انہیں جیسے ہی پتا چلا کہ بابر کابل چھوڑ کر ہندوستان جا رہا ہے تو تمام لٹیروں، چوروں اور ڈاکوؤں کی آنکھوں میں حریصانہ چمک جاگ اٹھی۔ جو لوگ چوری چکاری سے دور تھے، وہ بھی اس موقع سے فائدہ اٹھانے کے لئے کمربستہ ہو گئے اور کلالگ کی گھاٹی کا رستہ روکنے کے لئے شمالی پہاڑ پر سب کے سب آن موجود ہوئے۔

دوپہر کے ڈھلتے ہی بابر اپنے لاؤ لشکر کے ساتھ جوں ہی کلالگ کے قریب پہنچا، پہاڑوں پر موجود ڈاکوؤں نے نقارے بجانے شروع کر دیئے۔ وہ اپنی چمکدار دھاروں والی تلواروں کو ہوا میں لہرا لہرا کر عجیب عجیب آوازیں نکال رہے تھے۔

بابر نے گھوڑے کی پشت پر سوار ہوتے ہی سر اٹھا کر پہاڑ کی طرف دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں غصہ طیش کی صورت لرزاں ہوا۔ اس نے گرجدار آواز میں حکم دیا۔ ''جو سپاہی جہاں ہے، وہیں سے پہاڑ پر چڑھ جائے۔''

اس کا حکم پاتے ہی اس کے سپاہی ہر طرف سے چڑھ دوڑے۔ اس اچانک افتاد سے ڈاکو بوکھلا گئے، ان کی کمانیں ان کے کندھوں پر ہی لٹکی رہ گئیں۔ وہ ایک تیر بھی نہ چلا سکے اور بابر کے سپاہیوں کی لہراتی تلواروں کے سامنے وہ اپنی تلواروں کا لہرانا بھول گئے اور اپنی جان بچا کر بھاگ کھڑے ہوئے۔ کچھ ڈاکو زخمی ہوئے، کچھ مارے گئے، باقی یوں غائب ہوئے جیسے گدھے کے سر سے سینگ۔

یہاں سے بابر کا لشکر قلعہ آدینہ پور کے سامنے پڑاؤ انداز ہوا۔ کچھ عرصے یہاں قیام کر کے دوبارہ سفر شروع ہوا۔ اب کوئی پریشانی تھی، نہ فکرمندی۔ نہ منزل مقرر کی تھی، نہ چھاؤنی ڈالنے کی...... فوج کے چار حصے کر کے کوچ ہوتا تھا تا کہ ایک کو دوسرے کی خبر رہے۔

یہاں ایک بار پھر صلح مشورہ ہوا۔ زیادہ تر لوگ ہندوستان جانے کے حق میں نہ تھے۔ اسی لئے بابر نے اسی مقام پر کچھ عرصے قیام کا فیصلہ کیا اور ملا ساغرجی کو چند سپاہیوں کے ساتھ کابل روانہ کیا۔

☆......☆......☆

قندھار کے کوچہ و بازار سنسان پڑے تھے۔ شہر کے لوگ دم سادھے اپنے گھروں میں دبکے پڑے تھے۔ شہر کا حاکم ناصر مرزا شہر چھوڑ کر اپنے بھائی ظہیر الدین بابر کے پاس کابل بھاگ گیا تھا۔

شیبانی خان کو جوں ہی ناصر مرزا کے فرار کی خبر ملی تو اس نے آگے بڑھ کر شہر پر قبضہ کر لیا۔ ارک کے گرد کئی جگہ دشمنوں نے سرنگ کھودی۔ قلعے میں موجود فوج کے ساتھ بھی کئی جھڑپیں ہوئیں۔ قریب تھا کہ قلعہ دشمن کے قبضے میں چلا جاتا۔

ان حالات سے مایوس ہو کر خواجہ امین اور دیگر امراء قلعے کو چھوڑ کر جانے پر مجبور ہو گئے تھے۔ شیبانی خان کی کامیابی یقینی دکھائی دے رہی تھی۔ مگر اچانک ہی شیبانی خان نے صلح کا پیغام بھیجا اور قندھار سے اپنا محاصرہ اٹھا لیا۔

اس کا سبب یہ تھا کہ شیبانی خان نے قندھار پر چڑھائی کرتے وقت اپنے رشتے داروں اور حرم کو فراتو میں بھیج دیا تھا۔ وہاں دلکش خان نامی ایک شخص اپنی طاقت کے بل پر شہر فراتو پر قابض ہو گیا تھا۔ اب شیبانی خان کے گھر والے، عزیز اقرباء اور حرم دلکش خان کے رحم و کرم پر تھے۔ شیبانی خان کو جوں ہی اس اجمال کی خبر ہوئی، وہ قندھار سے محاصرہ اٹھا کر فراتو کی طرف روانہ ہو گیا۔

☆......☆......☆

کھلے میدان میں بابر کے لشکر نے ڈیرے ڈالے ہوئے تھے۔ آسمان پر سیاہ بادل چھائے ہوئے تھے۔ کڑکڑاتا جاڑا پڑ رہا تھا۔ تمام دن سپاہی قریبی جنگل سے خشک لکڑیاں چن کر ڈھیر لگا دیتے۔ شام کے سرمئی سایوں کے بکھرنے کے ساتھ ہی لشکرگاہ میں جگہ جگہ الاؤ جلا دیئے جاتے۔ یہ الاؤ روشنی کے ساتھ حدت بھی مہیا کرتے۔

ایسے میں جب شیبانی خان کی واپسی کی خبر ملی تو لحظہ بھر کو سب ہی حیران رہ گئے۔

''میرا خیال ہے اب ہمیں بدخشاں جانے کی ضرورت ہے، نہ ہی ہندوستان۔'' قاسم بیگ نے تمام سرداروں اور امراء کے سامنے پُریقین اور مسرور لہجے میں اعلان کیا۔

''اب ہمیں واپس کابل جانا چاہئے جہاں ہمارے گرم گھر اور گرم جوش محبت سے معمور دل لئے ہمارے اپنے ہماری راہ تک رہے ہیں۔''

''ہاں، یہی مناسب رہے گا۔'' بابر نے اپنے دیرینہ دوست کے خیال پر مہر یقین لگاتے ہوئے کہا۔ ''ہم جلد ہی باریچ کے راستے کابل کی طرف روانہ ہو جائیں گے۔''

موسم سرما اپنے عروج کی جانب گامزن تھا اور بابر اپنے لشکر کے ساتھ باریچ کے راستے کابل کے لئے رواں دواں تھا۔

''استاد جرکہ سے ایک پتھر تیار کروایا جائے۔'' باریچ کے مقام پر بابر نے قاسم بیگ کو حکم دیا۔ ''اس پتھر پر ہماری آمد و رفت کی تاریخ کندہ کرائی جائے اور اس پتھر کو باریچ پر نصب کر دیا جائے۔''

اس کام سے فارغ ہو کر کابل کا رخ کیا گیا۔

ارک کابل میں بابر کی بڑی بیوہ خالہ مہر نگار خانم اور دیگر رشتے دار خواتین کے ساتھ اس کی شریک حیات معصومہ بیگم موجود تھی۔ بابر کی واپسی کی خوشخبری پا کر سب ہی خواتین استقبال کو راہداری میں آ کھڑی ہوئی تھیں۔

بزرگ خواتین سے ملنے کے بعد بابر نے معصومہ بیگم کی طرف دیکھا۔ اس کے دلکش چہرے پر عجب سی پژمردگی چھائی ہوئی تھی۔

''بیگم، کیا تم کچھ بیمار ہو؟'' تنہائی ملتے ہی بابر نے سوال کیا۔ ''چہرہ اترا ہوا اور آنکھیں بے رونق دکھائی دے رہی ہیں۔''

''اس کی دو وجوہ ہیں۔'' معصومہ نے مسکرا کر اپنے شوہر کی طرف دیکھا۔ ''پہلی وجہ یہ کہ آپ کی جدائی نے میرے جسم سے جان کشید کر لی تھی، اس وقت جو میں آپ کو زندہ سلامت دکھائی دے رہی ہوں تو یہ آپ کی آمد کی خوشی سے ہے۔ یوں سمجھئے میں دوبارہ جی اٹھی ہوں۔''

''اوہ۔'' بابر نے محبت پاش نظروں سے اپنی چاہنے والی بیوی کی طرف دیکھا اور اس کے نرم و مشکبار گیسوؤں کو اس کے چہرے سے ہٹاتے ہوئے سوال کیا۔ ''اور دوسری وجہ......؟''

''وہ......'' شاہ بیگم ایک دم شرما گئی۔ ''آپ کو کچھ اندازہ نہیں ہو رہا؟'' اس نے سوال کے جواب میں سوال کیا۔ ''میری طرف غور سے دیکھئے۔''

بابر نے ایک بار پھر اسے سرتاپا غور سے دیکھا۔ کئی مہینوں کے بعد آج ان کا ملاپ ہوا تھا۔ اس کے نازک وجود پر ڈھیلا ڈھالا لباس اچھا لگ رہا تھا۔ اس کے سوا وہ کچھ اور نہ سمجھ سکا تھا۔

''آپ بھی نا......'' اسے نفی میں سر ہلاتے دیکھ کر وہ ہلکا سا ہنس کر بولی۔ ''آپ کے لئے خوشخبری ہے۔ آپ باپ بننے والے ہیں۔''

''کیا؟'' بابر یکدم اچھل پڑا۔ ''کیا واقعی؟'' اس کی مسرور اور متحیر آواز سے بےیقینی چھلک رہی تھی۔

معصومہ بیگم کے شرمیلے انداز میں اثبات پر سر ہلانے پر اس نے بے تابانہ پوچھا۔ ''کب......؟ ہمارا ولی عہد کب دنیا میں آئے گا؟''

''ان شاء اللہ بہت جلد۔'' شاہ بیگم نے بڑے یقین سے جواب دیا۔

اسی سال کے آخر میں منگل کے روز ارک کابل میں بچے کی ولادت ہوئی۔

''بادشاہ سلامت مبارک ہو۔ شہزادے معظم دنیا میں تشریف لے آئے ہیں۔'' بوڑھی خادمہ نگار خانم کی آواز پر ظہیر الدین بابر نے حیران و مسرور نظروں سے قاسم بیگ کی طرف دیکھا۔

''قاسم تم نے سنا، نگار خانم نے کیا کہا؟''

''مبارک ہو، ولی عہد شہزادہ تشریف فرما ہو چکے ہیں۔'' قاسم بیگ نے خوشی سے لبریز آواز میں بابر کو مخاطب کیا۔ ''ولی عہد شہزادے کی ولادت آپ کو مبارک ہو۔''

''خیر مبارک۔'' بابر کے چہرے، آنکھوں اور لب و لہجے سے مسرت پھوٹ رہی تھی۔ اس نے اپنی درمیانی انگلی میں پڑی پکھراج کی انگوٹھی اتار کر خادمہ کی طرف بڑھائی۔ ''خدا تمہیں سلامت رکھے، مجھے خوشی کی خبر سنائی۔''

''شہزادہ طویل عمر پائے اور تمام عالم پر حکومت کرے۔'' خادمہ نے جھک کر انگوٹھی تھامتے ہوئے دعا دی اور کورنش پیش کرتی کمرے سے چلی گئی۔

ذرا ہی دیر بعد وہ قاسم بیگ کے ساتھ ملکہ کے کمرے کی جانب جا رہا تھا۔ شاہ بیگم کو خواب گاہ میں پہنچا دیا گیا تھا۔ ننھا شہزادہ بھی اس کے پہلو میں دراز تھا۔ بابر نے مشتاق نظروں سے نومولود کی طرف دیکھا۔

''ماشاء اللہ۔'' اس کے منہ سے بے ساختہ نکلا۔ ''طالع نصیب ہو، اسی لئے میں نے اس کا نام ہمایوں تجویز کیا ہے۔ تم کیا کہتی ہو؟'' اس نے جھک کر شاہ بیگم کو مخاطب کیا۔

شاہ بیگم کے چہرے پر شرمیلی مسکراہٹ بکھر گئی۔

''بہت خوبصورت اور سعد نام ہے۔'' شاہ بیگم نے مسرور لہجے میں کہا۔ ''خدا اسے ہمیشہ طالع نصیب رکھے۔''

''آمین۔'' بابر نے کہا اور بچے کو گود میں لے کر اس کے کان میں اذان دی اور اس کے نام کا اعلان کیا۔

ہمایوں کی پیدائش کے چھٹے روز، چار باغ میں پیدائش کی خوشی میں تقریب کا انعقاد کیا گیا۔ سرخ قناتیں لگائی گئیں اور ارغوانی و عنابی قالین بچھائے گئے۔ اعلیٰ درجے کے ظروف میں لذیذ کھانے پیش کئے گئے۔

رات گئے تک جشن جاری رہا۔ غرباء میں کھانا اور کپڑے تقسیم کئے گئے۔ بیگمات کو تحائف دیئے گئے۔ شاہ بیگم کے لئے زر و جواہر کے زیورات ڈھالے گئے۔ ابریشم کے لباس اور کم خواب و اطلس کے دوشالے میں شاہ بیگم کا حسن ہمیشہ سے زیادہ قیامت ڈھا رہا تھا۔ ننھے شہزادے کو گود میں لئے وہ شاداب چہرے اور دمکتی آنکھوں سے بابر کا مسکراتا اور خوشی سے چمکتا چہرہ دیکھ رہی تھی۔ اپنی پوری زندگی میں شاید ہی کبھی بابر اتنا خوش دکھائی دیا تھا۔ ہمایوں کی ولادت نے اس کے وجود کا ادھورا پن مکمل کر دیا تھا۔ اس کے سانحات و کرب و ابتلا سے پُر زندگی میں خوشی اور یقین کا احساس بھر دیا تھا۔

اب وہ پہلے کے مقابلے میں زیادہ طاقتور ہو گیا تھا۔ اب وہ کابل کی مسند پر زیادہ مضبوطی سے قدم رنجہ تھا۔

بہار کا موسم اپنی پوری رعنائیوں کے ساتھ سایہ فگن تھا۔ باغیچوں میں انواع و اقسام کے گل کھلے تھے۔ ہوائیں گل نوشگفتہ اور نوخیز غنچوں کی مہکار سے بوجھل اُڑی اُڑی پھرتیں۔ ہر سو شادابی و شادمانی کا راج تھا۔

ایسے میں بابر نے مہمند افغانوں کے علاقے نواح نغزک میں ہلا بولنے کا فیصلہ کیا۔ بابر کے مہم کے لئے روانہ ہوتے ہی کابل کے آخری حکمران کے بیٹے عبدالرزاق کی حمایت میں ایک خوفناک بغاوت کی سازش تیار کی گئی۔

بابر کے مخالف بابر کے ایک وارث ہمایوں کی ولادت سے خائف ہو گئے تھے۔ شہزادے کی ولادت سے کابل کے سابقہ حکمرانوں الغ بیگ مرزا کے گھرانے کو دوبارہ تخت حاصل کرنے کی امید دم توڑتی محسوس ہوئی تھی۔ اب کوئی امکان باقی نہ بچا تھا۔

چنانچہ یہ بغاوت فرو کرنے کا فیصلہ کیا گیا۔ تجویز یہ تھی کہ عبدالرزاق مرزا کو نا صرف کابل و غزنی بلکہ بدخشاں، قندز اور ان تمام علاقوں کا حاکم بنا دیا جائے جو پہلے خسرو شاہ کے قبضے میں تھے۔

حسب معمول اس بغاوت کی ابتدا کرائے کے منگول سپاہیوں سے ہوئی کیونکہ وہ بابر کے نظم و ضبط سے سخت مایوس و کبیدہ ہوئے تھے۔ بابر نے لوٹ مار پر پابندی عائد کر دی تھی اور وہ احکامات کی تعمیل پر بھی زور دیتا تھا۔ ان سختیوں نے منگول سپاہیوں کو بابر سے برگشتہ کر دیا تھا۔ یہ موقع پرست سپاہی جو خسرو شاہ کی مصیبت کے وقت اس کا ساتھ چھوڑ کر بابر کے لشکر میں شامل ہوئے تھے۔ اب بابر سے بھی بددل ہو چکے تھے۔ ان کی نظر عبدالرزاق مرزا پر تھی۔ ان کی بغاوت کی سازش کی سب سے پہلے دوست محمد کو خبر ہوئی تھی۔

''سلطان معظم! میں آپ سے کچھ عرض کرنا چاہتا ہوں۔'' دوست محمد فوری طور پر بابر کی خدمت میں حاضر ہوا۔ اس وقت بابر اپنے دوستوں، امیروں اور جنگی سرداروں کے ساتھ اجلاس کر رہا تھا۔ قاسم بیگ بھی وہاں موجود تھا۔ بابر جب مہم پر روانہ ہوا تھا تو حسب عادت قاسم بیگ اس کے ساتھ ہی گیا تھا۔ یہاں نہ ہونے کے باعث اسے اس سازش کا اندازہ نہ ہو سکا تھا۔ ورنہ اس سلسلے میں وہ ہمیشہ چوکنا اور مستعد رہتا۔

''کیا بات ہے دوست محمد؟'' بابر نے اس کی طرف غور سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔ ''تم بہت پریشان دکھائی دے رہے ہو۔ تمہاری آنکھوں سے وحشت ٹپک رہی ہے۔ سب ٹھیک تو ہے؟''

''سلطان عالی مقام، اگر ناگوار خاطر نہ ہو تو میں اکیلے میں آپ سے کچھ عرض کرنا چاہتا ہوں۔'' دوست محمد نے بہ عجلت تمام کہا۔

اس کی پریشانی اور سراسیمگی کو دیکھتے ہوئے بادشاہ بابر نے تخلیے کا اشارہ کیا۔ سب لوگ مؤدبانہ انداز میں تعظیم پیش کرتے رخصت ہو گئے۔ اب کمرے میں صرف بابر، قاسم بیگ اور دوست محمد رہ گئے تھے۔

''اب کہو کیا کہنا چاہتے ہو؟'' سب کے رخصت ہوتے ہی بابر نے سوال کیا۔

''سرکار! آپ کے خلاف زبردست سازش کی بھنک ملی ہے۔'' دوست محمد نے گھبرائے ہوئے انداز میں کہا۔ ''منگول سپاہیوں میں سرکشی پھیل رہی ہے اور وہ آپ کے خلاف ہو رہے ہیں۔''

''قاسم بیگ۔'' بابر نے اپنے دست راست کی طرف دیکھا۔ ''کیا ایسا ہے؟''

''اس سلسلے میں، میں لاعلم ہوں آقا۔'' قاسم بیگ نے جلدی سے جواب دیا۔ ''مگر میرا نہیں خیال کہ منگول سپاہی اس طرح کی کوئی جرأت کر سکتے ہیں، اس کے باوجود میں تحقیق کروں گا۔''

''ضرور۔'' بابر نے اثبات میں سر ہلایا۔ ''اس سلسلے میں لاپروائی مناسب نہیں۔''

گو کہ دوست محمد نے یقین دلانے کی کوشش کی مگر بابر کو اپنے نظم و ضبط اور اپنے لشکر کے سپاہیوں کی وفاداری پر اتنا اعتبار تھا کہ اس نے دوست محمد کی بات کو سنجیدگی سے نہ لیا۔

اس شام جب وہ چار باغ کے دیوان عام میں بیٹھا ہوا تھا تو مرزا خواجہ اس کے پاس آیا اور اطلاع دی۔

''سلطان معظم! منگول سپاہی بلاشک و شبہ منحرف ہو چکے ہیں۔ اگرچہ یہ یقینی نہیں کہ عبدالرزاق شریک جرم ہے مگر ایسا لگتا ہے کہ سپاہی پوری طرح عبدالرزاق کے حق میں ہو چکے ہیں۔''

''مرزا خواجہ۔'' بابر نے عام سے لہجے میں کہا۔ ''ایسا کچھ نہیں ہے۔ میں نے قاسم بیگ کو اس سلسلے میں تحقیق پر لگایا تھا۔ اگر ایسا کچھ ہوتا تو ضرور مجھے مطلع کرتا۔ تم لوگ بلاوجہ وہم میں مبتلا ہو رہے ہو۔''

''میری گزارش ہے آقا کہ آپ اس معاملے پر سنجیدگی سے توجہ دیں اور معلوم کروائیں کہ سچائی کیا ہے؟'' مرزا خواجہ نے گڑگڑاتے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''کہیں ایسا نہ ہو ذرا سی لاپروائی کسی بڑے عذاب کا باعث بن جائے۔''

''تمہاری اس توجہ اور فکر کا شکریہ۔'' بابر اپنی جگہ سے اٹھتا ہوا بولا۔ ''اب رات ہونے کو ہے۔ کل صبح تحقیق کروائیں گے۔ تم بلاوجہ پریشان نہ ہو۔ سب ٹھیک ہے۔''

یہ کہہ کر بابر حرم کی طرف روانہ ہو گیا۔ ہمایوں کے بعد شاہ بیگم ایک بار پھر امید سے تھی...... اور بابر کو نئے آنے والے مہمان کا بڑی شدت سے انتظار تھا۔

خواب گاہ کے ادھ کھلے دریچوں سے پھولوں کی خوشبو سے رچی ٹھنڈی اور پُرکیف ہوا کمرے میں داخل ہو رہی تھی۔ ہر طرف ایک معطر اور لطیف سا احساس بکھرا ہوا تھا۔

بابر کو دیکھ کر شاہ بیگم نے کھڑے ہو کر اور سر کو جھکا کر تعظیم پیش کی۔ ننھا شہزادہ اپنی خادمہ کے ساتھ اپنے کمرے میں تھا۔

''کیسی ہو شاہ بیگم؟'' بابر نے نرم اور محبت بھرے لہجے میں سوال کیا۔

''اللہ کا کرم ہے۔'' ملکہ نے دھیمی آواز میں جواب دیا۔ ''مگر خدا جانے کیوں آج دوپہر سے ہی دل بہت گھبرا رہا ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ خدانخواستہ کچھ ہونے والا ہے۔''

''ہم مسلمان ہیں۔'' بابر نے پُریقین لہجے میں کہا۔ ''اور ہمیں اس طرح کے توہمات میں مبتلا نہیں ہونا چاہئے۔ بس اس رب عظیم سے اچھی امید رکھنی چاہئے۔''

تب ہی دوست محمد گھبرایا ہوا حرم کے دروازے پر نمودار ہوا تھا۔

''مجھے بادشاہ سلامت سے ملنا ہے...... ابھی اور اسی وقت۔'' اس نے خدام سے پُرزور انداز میں کہا۔ ''فوری طور پر انہیں مطلع کرو۔''

بابر جوں ہی خواب گاہ سے باہر نکلا تو اسے ایک عجب سے سناٹے کا احساس ہوا۔ ''سب لوگ کہاں ہیں؟'' اس نے اپنے محافظ سے پوچھا...... اور محافظ نے لاعلمی کے اظہار کے طور پر سر جھکا لیا تھا۔

''سرکار۔'' دوست محمد تیزی سے آگے بڑھا۔ ''غضب ہو گیا، تمام نوجوان خدام اور پہریدار سپاہی آپ کا ساتھ چھوڑ کر جا چکے ہیں۔''

''کیا کہہ رہے ہو دوست محمد؟'' بابر نے نگاہ گھما کر چاروں طرف دیکھا۔ تب ہی قاسم بیگ گھبرایا ہوا اندر داخل ہوا۔ اس نے اشارے سے تمام محافظین کو قریب آنے کا اشارہ کیا۔

''دوست محمد تم حرم کی حفاظت کا خیال کرو۔'' قاسم بیگ نے دوست محمد سے کہا اور بابر کو اپنے ساتھ لئے دوسری جانب نکل گیا۔

اگلے ہی لمحے راہداریوں میں شور سا سنائی دیا تھا۔ منگول سپاہی محل میں داخل ہو گئے تھے۔ وہ غل مچاتے، تلواریں لہراتے بابر کو گرفتار کرنے کے لئے آگے بڑھ رہے تھے۔

قاسم بیگ نے اپنے اور بابر کے ذاتی محافظوں کا ایک حصار سا بنا لیا تھا۔ بابر کو اس گھیرے میں چھوڑ کر وہ تلوار لہراتا آگے بڑھا تھا۔

اسے دیکھ کر سپاہی اپنی جگہ رک گئے تھے۔ بابر کو اپنے محافظوں کے نرغے میں دیکھ کر ہی انہیں مایوسی ہوئی تھی۔ اس کے ساتھ ہی قاسم بیگ تلوار سونت کر للکارتا ہوا سامنے آ گیا تھا۔

سلطان کے مقرب خاص کی شمشیر زنی کے ہنر سے سارے ہی منگول سپاہی واقف تھے۔ دوسری طرف محافظوں نے بابر کو گھیرے میں لئے ایوان کے اندر کر دیا تھا۔

یہ حملہ اتنا غیر متوقع، اچانک اور آناً فاناً ہوا تھا کہ قاسم کے ساتھ خود بابر بھی بھونچکا رہ گیا تھا۔ محافظوں نے بروقت خنجر تان کر اس کے گرد حصار بنا لیا تھا ورنہ باغیوں نے تو اسے گرفتار کرنے کی پوری تیاری کر لی تھی۔

اب غور و فکر اور فیصلے کا وقت تھا۔ عملی طور پر ساری منگول سپاہ اس ساز باز کا حصہ بن گئی تھی۔ آخر میں بابر کے پاس اس کے صرف پانچ سو وفادار ساتھیوں کی جماعت رہ گئی تھی اور مقابل میں تین ہزار سے زائد باغی سپاہی تھے۔

''آقا، بہتر ہوگا کہ آپ پہاڑیوں میں پناہ گزین ہو جائیں۔'' دوست محمد نے مشورہ دیا۔ ''باغیوں کی اتنی بڑی تعداد سے ہمارے گنتی کے سپاہیوں کا کوئی مقابلہ نہیں۔''

''تمہارا کیا مشورہ ہے قاسم بیگ؟'' بابر نے گمبھیر آواز اور سنجیدہ لہجے میں قاسم بیگ سے مشورہ طلب کیا۔ ''ان حالات میں ہمیں کیا کرنا چاہئے؟''

''اس وقت میری عقل کام نہیں کر رہی۔'' قاسم بیگ نے سٹپٹاتے ہوئے لہجے میں جواب دیا۔ ''میرے آقا، آپ کا جو فیصلہ ہو، اس غلام کا بھی وہی مشورہ ہوگا۔''

''تو ٹھیک ہے۔'' بابر نے پُرسوچ انداز میں سر ہلایا۔

بابر نے ہمیشہ کی طرح پُرجوش جذبۂ عمل کے تحت اپنے تخت و تاج کی بازی لگانے کا فیصلہ کر لیا۔ پہاڑوں میں جا کر پناہ گزین ہو جانے کی اس کی حمیت نے اجازت نہ دی تھی۔

شام کے سرمئی سائے رات کی سیاہی میں مدغم ہو رہے تھے۔ ہوائیں خاموش اور ساکت تھیں۔ فضا میں ایک عجب سا خوف گھلا ہوا تھا۔ ایسے میں بابر اپنے پانچ سو جاں نثاروں کے ساتھ محل کے پچھلے دروازے سے نکلا اور قریبی میدان کا رخ کیا۔

اس کی آمد کا پتا ہوتے ہی باغی منگولوں نے بھی میدانِ کارزار کا رخ کیا۔ وہ تلوار لہراتے، گھوڑوں کی پشت پر اچھلتے، غل مچاتے میدان کی طرف دوڑتے چلے آ رہے تھے۔

بابر نے اپنی سپاہ کی صف آرائی کی اور خود بھی تلوار بے نیام کر کے مقابلے کے لئے تیار ہو گیا۔

مقابلہ بہت غضب کا اور زوردار تھا۔ منگول سپاہی اپنے پانچ نامور سرداروں کی قیادت میں گدھوں کی طرح امڈے پڑ رہے تھے۔ مگر بابر اور اس کے جانباز کسی چٹان کی طرح اپنی اپنی جگہ پر جمے ہوئے تھے۔

باغیوں کا سب سے بڑا سردار ہیبت خان جوں ہی تلوار لہراتا آگے آیا، بابر نے اپنی تلوار سے اس پر وار کیا۔ تلوار کی کاٹ اس کے شانے کو کاٹتی گزر گئی۔ وہ ذبح کئے گئے جانور کی طرح چیختا آگے بڑھا اور بابر پر حملہ آور ہوا مگر اس بار بابر کی دودھاری تلوار اس کے سینے کے آر پار ہو گئی تھی۔ وہ کسی کٹے ہوئے شہتیر کی طرح زمین پر گرا اور اس کا خالی گھوڑا ہنہناتا ہوا اپنے سپاہیوں کی طرف لوٹ گیا۔

ہیبت خان کے واصل جہنم ہوتے ہی اس کا نائب تگین مرزا آگے بڑھا۔ یہ تلوار کا بڑا ماہر سپاہی تھا۔ بابر کتنی ہی دیر اس سے مقابلہ کرتا رہا۔ آخر بدترین موت ہی اس کا مقدر ٹھہری۔ تگین مرزا کے بعد یکے بعد دیگرے تین اور سردار بابر سے مقابلے کے لئے آگے بڑھے اور زمین چاٹ کر زمین بوس ہو گئے۔

بابر کی شجاعت اس کے ساتھیوں کے لئے حوصلہ اور ولولہ بڑھانے کا باعث بن رہی تھی۔ وہ بھی میدان میں ڈٹ گئے تھے۔ بابر اور اس کے جاں نثار یوں غضبناک ہو کر لڑے کہ باغیوں کے پاؤں اکھڑ گئے اور حوصلے جواب دے گئے۔

بابر کی شمشیر زنی اور اس کے ساتھیوں کی جاں نثاری اس کے حریفوں کے لئے حیرت اور پریشان کن تھی۔ وہ اپنے ساتھیوں کی لاشیں، سامان حرب، گھوڑے اور دیگر سامان سے لدے خچر چھوڑ کر میدان سے بھاگ کھڑے ہوئے۔

بابر کے ساتھیوں کے حوصلے اور بڑھ گئے۔ وہ پامردی سے آگے بڑھے۔ عبدالرزاق اپنے مکان میں موجود تھا۔ بابر کے سپاہیوں نے اس کے مکان کا محاصرہ کر لیا اور دندناتے اس کے مکان میں داخل ہوئے اور شہزادے کو گرفتار کر کے مکان سے باہر آ گئے۔

عبدالرزاق کی گرفتاری نے باغیوں کا رہا سہا حوصلہ بھی چکنا چور کر دیا تھا۔ منگول سپاہی اپنی جان بچا کر مختلف سمت بھاگ کھڑے ہوئے تھے۔ کچھ نے ہتھیار ڈال کر معافی کی درخواست پیش کر دی۔ کئی منگول سردار بابر کے حضور حاضر ہوئے اور معافی و رحم کے خواستگار ہوئے۔

اس موقع پر بابر نے فراخدلی اور وسعت قلبی کا مظاہرہ کیا اور معافی مانگنے والے تمام سپاہیوں اور سرداروں کو معاف کر کے درگزر سے کام لیا۔ اب وہ ایک باشعور اور جنگی ماہر کی طرح حالات کا جائزہ لے رہا تھا۔

نیا سال طلوع ہو چکا تھا۔ نیا سال اپنے ساتھ بابر کے لئے ایک اور بیٹے کی خوشخبری لے کے آیا تھا۔ دوسرے بیٹے کی پیدائش پر بابر خوشی سے نہال ہوا اٹھا تھا۔ بچے کی پیدائش کی خوشیاں منانے کے بعد وہ اپنی چھوٹی سی مملکت کے اندرونی معاملات میں مشغول رہا اور پردۂ تقدیر سے جو کچھ غیر متوقع طور پر ظہور پذیر ہو سکتا تھا، اس کے لئے خود کو تیار کرتا رہا۔

اب اسے اپنی سلطنت کی حفاظت اور وسعت کا زیادہ خیال تھا کیونکہ اس کے ایک نہیں دو دو وارث موجود تھے۔

ہندوستان جانے کا ابھی وقت نہیں آیا تھا اور سمرقند کا جہاں تک سوال تھا، شیبانی خان اب بھی ہمیشہ کی طرح طاقتور تھا اور اس کے فتح کئے گئے علاقوں پر سانپ بنا بیٹھا تھا۔

اس شام وہ اپنے دونوں ننھے شہزادوں کے ساتھ دل بہلانے میں مصروف تھا کہ اطلاع ملی کہ اس کے دور رشتے کے بھائی اکیس سالہ سعید خان چغتائی اور گیارہ سالہ حیدر مرزا دوغلت اس سے شرف ملاقات چاہتے ہیں۔

بابر حیران ہوا۔ ''سعید خان اور حیدر مرزا...... وہ یہاں کیسے؟ اور اس وقت؟'' پھر اس نے سر جھٹک کر خادم سے کہا۔ ''ٹھیک ہے، پیش کرو۔''

کچھ ہی دیر بعد دونوں لڑکے اندر داخل ہوئے۔ جھک کر سلام کیا اور سر جھکا کر بے بسی کی تصویر بن کر کھڑے ہو گئے۔ بابر انہیں حیرت اور بےیقینی سے دیکھ رہا تھا۔ وہ سوکھ کر کانٹا ہو رہے تھے۔ چہروں سے بھوک اور غربت ٹپک رہی تھی۔ آنکھوں میں وحشت آنسو بن کر تیر رہی تھی۔

''یہ تم لوگ کس حال میں ہو۔ کیا ہوا تمہارے ساتھ؟'' بابر نے بے تابانہ سوال کیا۔

''بھائی۔'' بڑے لڑکے سعید خان چغتائی نے کرب بھری آواز میں کہا۔ ''شیبانی خان کی قید سے بصد مشکل فرار ہو کر یہاں تک پہنچے ہیں۔ اس ظالم نے ہم دونوں کے قتل کا حکم دیا تھا مگر ہم اپنی جان بچا کر کسی طرح بھاگنے میں کامیاب ہوئے ہیں۔ بس اتنا سمجھ لیجئے شیبانی خان کے خنجر تلے سے اپنی گردن نکال کر یہاں تک پہنچے ہیں اور آپ سے پناہ کے خواستگار ہیں۔''

''شیبانی خان۔'' بابر نے غصے اور ضبط بھرے انداز میں اپنے سنگ دل دشمن کا نام لیا۔ آج ان دونوں کی کسمپرسی نے اسے اس بے رحم انسان کی یاد تازہ کر دی تھی۔ پھر اس نے اپنا سر جھٹک کر اس یاد سے دامن چھڑاتے ہوئے لڑکوں کو مخاطب کیا۔

''میرے بھائیو! بہت اچھا کیا جو تم یہاں چلے آئے۔ اب تمہیں فکرمند ہونے کی قطعاً ضرورت نہیں۔ یہاں آرام اور اطمینان سے رہو۔''

پھر بابر نے خدام کو بلا کر ان کے لئے نئے لباس لانے اور ان کے لئے حمام کا اہتمام کرنے کا حکم دیا۔

رات کو دسترخوان پر وہ بے حد محبت کرنے والے مہربان بڑے بھائی کی طرح انہیں اصرار کر کے کھلانے میں مصروف رہا تھا۔

''حیدر مرزا۔ میرے ننھے بھائی۔ یہ شہتوت اور جو کا حلوہ لو، یہ خاص طور پر تمہارے لئے بنوایا گیا ہے۔''

افلاس و مصیبت، اذیت اور صعوبت کے اس عالم نے جس نے ان کے طائر روح کو قفس پیکر کی قید و بند سے بیزار کر دیا تھا، اس قدر اچانک آرام و راحت اور سکون و فراغت پا کر وہ دونوں بے حد مسرور و مسحور تھے۔ خاص طور پر گیارہ سالہ حیدر مرزا، بابر کی شفقت و محبت سے بے حد متاثر ہوا تھا۔

آئندہ ایک طویل عرصے تک وہ دونوں بابر کی شفقت اور عنایت کے سائے تلے رہے۔ بابر نے حیدر مرزا کی تعلیم و تربیت پر خصوصی توجہ دی تھی۔ اس کی جوہر شناس نظروں نے اس جوہر قابل کو بھانپ لیا تھا۔ چنانچہ کبھی شفقت و نرمی سے اور کبھی سزا کا خوف دلا کر حصول علم کی خاطر وہ اس کی حوصلہ افزائی کرتا رہتا تھا۔

حیدر مرزا کی معمولی سی خوبی اور قابل تعریف بات پر بابر دل کھول کر اس کی تعریف کرتا اور اسے آگے بڑھنے کی ترغیب دلاتا۔ یہ اسی کی توجہ، محبت اور محنت کا نتیجہ تھا کہ حیدر مرزا دوغلت بعد میں ''تاریخ رشیدی'' کے مصنف کی حیثیت سے مشہور ہوا۔

☆......☆......☆

باہر تپتی دوپہر پھیلی ہوئی تھی۔ دھوپ کی تپش سے زمین پگھلتی محسوس ہو رہی تھی۔ ہواؤں میں حدت گھلی ہوئی تھی۔ ایران کی سرزمین پر ایسا دہکتا موسم کبھی کبھار ہی وقوع پذیر ہوتا تھا۔ شاید آج موسم کی تپش ایران کے حکمران شاہ اسماعیل صفوی کے غصے کی وجہ سے بڑھی تھی اور یہ غصہ شیبانی خان کی کمینگی کی وجہ سے تھا۔

شاہ اسماعیل صفوی ایرانی سلطنت کا مطلق العنان حکمران تھا۔ شیبانی کے کچھ فوجی دستوں نے شاہ اسماعیل کے علاقوں کی سرحد پر لوٹ مار کی تھی۔ جو ایلچی جرمانہ طلب کرنے کے لئے بھیجے گئے تھے، انہیں شیبانی نے بہت اہانت آمیز جواب دیا اور شاہ کے پاس ایک کشکول بھیجا۔ جب یہ کشکول شاہ اسماعیل کے سامنے پیش کیا گیا تو اس کا چہرہ غصے سے لال بھبھوکا ہو گیا اور اس نے آگ بگولا ہوتے ہوئے کہا۔ ''اس بدبخت بربر کی یہ جرأت کہ شاہی خاندان پر طنز کرے؟'' اس کے وزراء جن میں سے پاشا غنیم اور پاشا اولیس بے حد دانا اور مدبر انسان تھے، انہوں نے اس وقت بادشاہ کو سمجھایا۔

''بادشاہ سلامت! وہ ایک کم علم انسان ہے۔ اس کی بات اس قابل نہیں ہے کہ غصہ کر کے اپنا خون جلائیں۔''

''پھر ہمیں کیا کرنا چاہئے؟'' اپنی غلطی کا احساس ہوتے ہی شاہ اسماعیل نے خود کو اعتدال پر لاتے ہوئے سوال کیا۔

''آپ کو اس طرح جواب دینا چاہئے کہ یہ پتا چلے کہ اس کی بے ہودگی آپ کے لئے درخور اعتنا نہیں ہے۔'' وزیر غنیم نے مشورہ دیا۔

''ٹھیک ہے۔'' شاہ اسماعیل خود کو سنبھال کر مسکرایا اور اس نے شیبانی خان کے اس طنز کو ظاہری انکساری سے برداشت کرتے ہوئے اس کے تحفے کے جواب میں اس نے ایک تکلا بھیج دیا۔

شیبانی خان اس تحفے کو پا کر سنگ اٹھا۔ اس نے غصے بھرے لہجے میں سوال کیا۔ ''آخر اس بے ہودگی کا کیا مطلب ہے؟ افلاس زدہ ایرانی آخر خود کو سمجھتا کیا ہے؟''

یہ پیغام جوں ہی شاہ اسماعیل تک پہنچا، اس کے صبر کا دامن بھی ہاتھ سے چھوٹ گیا۔ اس نے جواب بھیجا۔

''اے ازبک شیطان! میں ایک مہلک جنگ کے لئے کمربستہ ہوں اور رکاب نصرت میں پائے عزم رکھ لیا ہے۔ اگر تو ایک مرد کی طرح میدان جنگ میں میرے روبرو آئے گا تو ہمارے تنازع کا فیصلہ ہو جائے گا۔ لیکن اگر تو کسی گوشے میں چھپ جانا بہتر سمجھے تو تیرے لئے جو کچھ بھیجا ہے، تیرے کام آئے گا۔''

اس کے بعد شاہ اسماعیل نے اپنی سپاہ کو تیار کیا اور اچانک اپنے حریف کو دبوچ لیا۔ وہ شیبانی خان کو رگیدتا ہوا آگے بڑھا اور اسے شہر مرو میں دھکیل دیا۔ شیبانی خان کی امدادی فوج نے مقابلے کی کوشش کی مگر شاہ اسماعیل نے اسے بھی شکست دے کر شہر کا محاصرہ کر لیا۔

ازبک فوج شیبانی خان کی قیادت میں پُرجوش مزاحمت کر رہی تھی۔ یہ بات کسی بھی طرح سود مند نہ تھی، اس لئے بادشاہ کے دانا مشیروں نے اسے ایک چال چلنے کا مشورہ دیا۔ چنانچہ اس چال پر عمل کرتے ہوئے شاہ اسماعیل نے شیبانی خان کو لکھا۔ ''بعض حالات کی وجہ سے میرے لئے واپس جانا ضروری ہو گیا ہے۔ میں فی الحال زیادہ ٹھہر نہیں سکتا لیکن امید کرتا ہوں کہ جلد ہی تیرا سامنا کروں گا۔''

(جاری ہے)

ظہیرالدین بابر

اشتیاق فاطمہ عظمیٰ

قسط : 12

شاہ اسماعیل نے اس پیغام کو بھیجنے کے بعد اس طرح کوچ کیا گویا پوری طرح پسپا ہو رہا ہے۔

یہ پیغام آیا تو شیبانی خان کی چھوٹی چھوٹی عیار آنکھوں میں روشنی سی بکھر گئی۔ اس کے لبوں پر فاتحانہ مسکراہٹ کھیلنے لگی۔ اسے یوں محسوس ہوا جیسے ہاری ہوئی بازی جیت لی ہو۔ اس نے فوراً اپنی فوج کو یکجا کیا اور مرو کے مضبوط اور محفوظ ٹھکانے سے باہر آ گیا۔

شہر سے باہر آتے ہی اس نے شاہ اسماعیل کے سپاہیوں پر ہلا بولا۔ گنتی کے چند سو سپاہیوں کا یہ جتھا لشکر سے کافی پیچھے رہ گیا تھا۔ شیبانی نے سپاہیوں کو زیر کر لیا اور اس کامیابی کے بعد اس کا حوصلہ مزید بڑھ گیا۔ وہ تیزی سے آگے بڑھا۔

چار پانچ میل کا سفر طے کرنے کے بعد پھر اسے چند سو سپاہی دکھائی دیے۔ انہوں نے شیبانی کا مقابلہ کرنے کی کوشش کی مگر ازبک سپاہیوں نے انہیں گاجر، مولی کی طرح کاٹ کر رکھ دیا۔ اس دوسری کامیابی نے شیبانی خان کا حوصلہ کچھ اور بڑھا دیا تھا۔

اس کا خیال تھا کہ سپاہیوں کے یہ چھوٹے چھوٹے جتھے وہ ہیں جنہیں بدحواسی میں بھاگتے ہوئے شاہ اسماعیل پیچھے چھوڑ گیا تھا۔ دوسری طرف شیبانی ان پر قابو پا لینے کو اپنی بڑی فتح سمجھ رہا تھا اور بے خوف ہو کر آگے بڑھتا جا رہا تھا۔ بالآخر وہ اپنی محفوظ پناہ گاہ سے دس بارہ میل دور نکل آیا۔

سورج غروب ہونے کو تھا۔ آسمان شفق کی سرخی میں ڈوبا ہوا تھا۔ فضا میں عجب سرخی مائل ملگجی روشنی بکھری ہوئی تھی۔ پرندے اپنے ٹھکانوں پر پہنچ چکے تھے۔ ہواؤں میں ایک سراسیمگی سی رچی ہوئی تھی۔

شیبانی خان کے تیزی سے بڑھتے قدم اچانک رک گئے تھے۔ اس نے خود کو ایک دریا اور شاہ اسماعیل کی تازہ دم فوج کے نرغے میں پایا۔ اب اسے احساس ہوا کہ ان چھوٹی چھوٹی کامیابیوں کا جال خاص طور پر بڑی ہوشیاری کے ساتھ اس لئے بچھایا گیا تھا کہ وہ اپنی مضبوط اور محفوظ پناہ گاہ سے نکل سکے۔ وہ دشمن کے اس جال میں پھنس چکا تھا۔

اس کے پیچھے رواں دواں دریا تھا۔ دریا کے پل پر گھات میں بیٹھے دشمن کے دستوں نے قبضہ کر لیا تھا۔ اس لئے پیچھے جانے کا کوئی راستہ نہ تھا اور سامنے شاہ اسماعیل کی سترہ ہزار جری اور غصے و انتقام کی آگ میں بھری فوج تھی۔ جس نے اُترتی شام کی پروا کئے بغیر شیبانی خان کی حیران و پریشان فوج پر حملہ کر دیا تھا۔

ایسے حالات میں شیبانی خان کے لئے مقابلے کا بس ایک ہی نتیجہ نکل سکتا تھا اور وہ نکل آیا تھا۔ جان توڑ مزاحمت کے بعد اس کی فوج کو شکست فاش ہو گئی تھی۔

محض چند گھنٹوں کی معرکہ آرائی میں شیبانی خان کے ہزاروں جنگجو موت کی نیند سو چکے تھے۔ وہ اپنے بچے کھچے سپاہیوں کو لے کر سامنے کی طرف سے پیچھے ہٹنا شروع ہوا۔ شاہ اسماعیل کی فوج نے اسے ایک سرائے میں دھکیل دیا۔ اب وہ پوری طرح گرفت میں آ چکے تھے۔ واپسی یا بھاگ کھڑے ہونے کا کوئی راستہ نہ بچا تھا۔ اس سرائے میں شاہ اسماعیل کے سپاہیوں نے شیبانی اور اس کے بچے کھچے سپاہیوں کو بری طرح گھیر لیا تھا۔

اوائل دسمبر کی سردی، سیاہ رات اور سر پر منڈلاتے موت کے سائے، شیبانی خان کے سپاہی بالکل بے بس ہو چکے تھے۔ ہواؤں کی سرسراہٹ میں وہ موت کے قدموں کی آہٹیں سن رہے تھے اور آخر کار ان کا یہ خدشہ درست ثابت ہوا۔ ان کا ایک ایک آدمی قتل کر دیا گیا۔ پوری سرائے لاشوں سے پٹ گئی۔ سرائے کے قدمچوں اور راہداریوں میں خون بہہ رہا تھا۔

شاہ اسماعیل فاتحانہ انداز میں آگے بڑھا۔ اب اسے شیبانی خان کی تلاش تھی، مگر رات کے سیاہ پردے نے اسے کہیں چھپا لیا تھا۔

☆......☆......☆

موسم سرما پوری آب و تاب سے فروکش تھا۔

دسمبر کا مہینہ اختتام پذیر ہونے کو تھا۔ کابل کے گلی کوچوں میں ابھی سرد ہواؤں کا دور دورہ تھا۔ زیادہ تر سورج سیاہ بادلوں کا لحاف اوڑھے، نظروں سے اوجھل رہتا، اکثر گرج چمک کے ساتھ بارش ہوتی اور سردی کی شدت میں اضافہ کر دیتی۔ برفباری ہوتی تو شجر سفید روئی کا لباس زیب تن کر لیتے۔ ایسے میں بابر اپنے دونوں شہزادوں کی معصومانہ شرارتوں اور زندگی سے بھرپور کلکاریوں سے لطف اندوز ہونے میں مصروف تھا۔ تب ہی اس کے چچازاد بھائی رئیس مرزا کی طرف سے ایک پیغام ملا۔

”میرے بھائی آپ یقیناً یہ خبر سن کر حیرت بھری مسرت سے دوچار ہو جائیں گے کہ آپ کا حریف دیرینہ اپنے لشکر کے ساتھ شاہ اسماعیل سے ٹکر لینے کے بعد تباہ و برباد ہو چکا ہے۔ یہ معلوم نہیں کہ شیبانی خان زندہ ہے یا مارا گیا، تمام ازبکوں نے دریا کو پار کر لیا ہے، تقریباً 20 ہزار منگول جنہوں نے ازبکوں کا ساتھ مرو میں چھوڑ دیا تھا، قندز آ گئے ہیں۔ میں بھی یہیں موجود ہوں۔“

بدخشاں کے حاکم بابر کے عم زاد رئیس مرزا نے اپنے پیغام میں اسے اپنی اس مشترکہ آبائی مملکت کو واپس لینے کی کوشش میں بابر کو شرکت کی دعوت دی تھی۔

”اوہ۔“ بابر کے دلکش چہرے پر حیرت میں ڈوبی مسرور مسکراہٹ بکھر گئی تھی۔ اس خبر نے اس کے دل کی دھڑکنوں میں ایک بار پھر انتشار جگا دیا تھا۔

”تو کیا آپ جانے کا ارادہ رکھتے ہیں؟“ ملکہ نے قدرے حیرت اور پریشانی سے پوچھا۔

”بیگم! بھلا اس سوال کی ضرورت ہی کیوں پڑی۔ اس خبر نے میرے جذبوں کو مہمیز دی ہے۔ میں فوری طور پر روانہ ہو جانا چاہتا ہوں۔“

بابر کے جواب نے شاہ بیگم کے حسین چہرے پر اداسی کھنڈ دی تھی۔ وہ دھیمی آواز میں گویا ہوئی۔ ”آپ شہزادوں سے اس قدر محبت کرتے ہیں اور وہ بھی آپ سے بے حد مانوس ہیں۔ فرقت کا یہ زمانہ بھلا کس طرح برداشت ہوگا؟“

”فرقت کیسی؟“ بابر نے مسکرا کر اپنی شریک حیات کی طرف دیکھا۔ ”آپ جانتی ہیں ہم اپنے شہزادوں اور خاص طور ہمایوں کے بغیر نہیں رہ سکتے۔ اسی لئے ہم نے فیصلہ کیا ہے کہ ہم اپنے جگر کے ٹکڑوں کو اپنے ساتھ لے جائیں گے۔“

بابر نے کابل کی حکومت ناصر مرزا کی نگرانی میں دے دی اور موسم کی سختی کے باوجود اپنے دونوں کمسن بیٹوں کو ساتھ لے کر پہاڑوں کو پار کرتا رئیس مرزا کے پاس قندز جا پہنچا۔

یہاں اس کا سامنا ازبک سپاہیوں سے ہوا۔ وہ سپاہی بابر کے سپاہ کے مقابلے میں چار گنا زیادہ تھے۔ وہ چاہتے تھے کہ بابر کے مہمان سلطان سعید کو بابر کی جگہ حکمران بنا دیا جائے۔ مگر خود سلطان سعید نے بابر کی نمک خواری کا حق ادا کرتے ہوئے اس طرح کے کسی معرکے میں حصہ لینے سے انکار کر دیا تھا۔

ان سپاہیوں کی ریشہ دوانیوں سے دامن بچاتا بابر حصار کی طرف بڑھا اور دریا کو پار کر کے آگے نکلا لیکن جلد ہی اسے احساس ہو گیا کہ شکست کے باوجود ازبک اب بھی بہت طاقتور ہیں، اس لئے وہ بغیر جنگ کئے قندز واپس آ گیا۔ اب اسے ایسے حلیفوں کی تلاش تھی جو شیبانی کے بچے کھچے لشکر کو مٹا کر سمرقند کے تخت تک اس کی رسائی میں مدد کر سکتے۔

قندز کے مغربی میدان میں بابر اپنے شاہی خیمے میں اپنے مخملی نمدے پر بیٹھا اسی سوچ و بچار میں مستغرق تھا کہ قاسم بیگ نے خیمے میں داخل ہو کر جھک کر مؤدبانہ گزارش کی۔

”سلطان معظم۔ ایرانی بادشاہ شاہ اسماعیل کی طرف سے ایک فوجی دستہ آیا ہے جو جذبۂ خیر سگالی کے اظہار کے طور پر شہزادی خداوندزادہ بیگم کو اپنے ساتھ آپ کی خدمت میں پیش کرنے کے لئے لایا ہے۔“

”شہزادی خداوندزادہ بیگم؟“ بابر نے چونک کر بے یقین لہجے میں پوچھا۔ ”میری بڑی ہمشیرہ؟“

”جی۔“ قاسم بیگ نے سر جھکا کر جواب دیا۔ ”وہ اپنے یکے بعد دیگرے دونوں شوہروں سید ہادی اور شیبانی خان کے لڑائی میں کام آنے کے بعد ایرانیوں کی دسترس میں چلی گئی تھیں۔“

”اوہ۔“ بابر کے حسین چہرے پر رنج کے بادل چھا گئے۔ ”میری ہمشیرہ کی قسمت پر حیف ہے۔“

”اور اب......“ قاسم بیگ نے اس کے ملال کو دیکھتے ہوئے اس کی توجہ بٹانے کی خاطر جلدی سے کہا۔ ”شاہ اسماعیل نے انہیں بصد عزت و احترام آپ کے پاس بھیجا ہے اور ساتھ ہی اس کا ایک سفارتی وفد دوستی کی پیش کش بھی لے کے آیا ہے۔“

”پہلے میں اپنی بہن سے ملنا چاہوں گا۔“ بابر نے دھیمی آواز میں کہا۔ ”اس کے بعد شاہ کی پیشکش پر توجہ دی جائے گی۔“

”بجا ارشاد سلطان محترم۔“ قاسم بیگ نے سر تسلیم خم کرتے ہوئے کہا۔ ”شہزادی محترمہ کچھ دیر میں تشریف لانے والی ہیں۔“

برسوں پہلے شیبانی نے جانے کی یہی شرط رکھی تھی۔ تاوان کے طور پر وہ بابر کی بہن کو اپنے ہمراہ لے گیا تھا۔ اس وقت وہ دراز قد کی ایک حسین اور نازک اندام دوشیزہ تھی۔ مگر اس پل اس کے سامنے جو خاتون لائی گئی تھی، وہ قدرے فربہ جسم کی باوقار اور سنجیدہ خاتون تھی۔

اس کی بھوری آنکھوں میں ملال ٹھہر سا گیا تھا اور چہرے پر اداسی پھیلی ہوئی تھی۔ اس کے خیمے میں داخل ہوتے ہی بابر اپنے نمدے سے اٹھ کھڑا ہوا اور اس نے آگے بڑھ کر اپنی ماں جائی کا استقبال کرنا چاہا۔ مگر اپنے سامنے ایک لحیم شحیم خاتون کو دیکھ کر اپنی جگہ ٹھٹھک گیا تھا۔

خود خداوندزادہ بیگم ساکت کھڑی رہ گئی تھی۔ جب وہ اپنے بھائی سے جدا ہوئی تھی تو اس کا بھائی ایک نوعمر اور معصوم سا لڑکا تھا۔ مگر آج اس کے سامنے جو حکمران کھڑا تھا، گو کہ وہ چھریرے جسم کا ایک بے حد خوبرو نوجوان تھا مگر اس کے اس چھوٹے سے بھائی سے خاصا مختلف تھا۔ اب وہ خود دو بیٹوں کا باپ تھا۔

خداوندزادہ بیگم کو اپنی جگہ پر ٹھٹھکتے دیکھ کر بابر کے لبوں پر ہلکی سی مسکراہٹ بکھر گئی۔ نا پہچان کے بھی، وہ اپنی بہن کو پہچان گیا تھا۔

”کک...... کیا...... تم ہی، میرا مطلب ہے کہ آپ ہی سلطان بابر ہیں؟“ خداوندزادہ بیگم نے حیرت میں ڈوبی پھنسی پھنسی آواز میں سوال کیا۔

”جی ہاں ہمشیرہ۔“ بابر مسکرایا۔ ”تھوڑی دقت تو ہوئی مگر میں نے آپ کو پہچان لیا۔ کیا آپ کو مجھے پہچاننے میں پریشانی ہو رہی ہے؟“

”اب نہیں۔“ خداوندزادہ بیگم نے بازو پھیلائے۔ ”تقدیر نے ہمیں جدا کر کے ایک دوسرے کی شناخت چھین لی تھی مگر قدرت نے مہربان ہو کر ہمیں ایک بار پھر ملا دیا ہے، تو بھلا خون خون کو کیسے نہ پہچانے گا۔“

بابر نے آگے بڑھ کر اپنا سر بہن کے سامنے جھکا دیا۔ خداوندزادہ بیگم نے ہاتھوں کے پیالے میں اپنے دلاور بھائی کا چہرہ تھام کر غور سے دیکھا۔ گزرتے لمحوں کے ظالم پنجے نے اس کے چہرے کی معصومیت اور نیک خوئی نہیں چھینی تھی۔ وہ چودہ سال کے نوعمر لڑکے سے ایک توانا جوان بن چکا تھا مگر اس کی آنکھوں سے جھانکتی بے ریا دیانت آج بھی باقی تھی۔

”جیتے رہو میرے بھائی۔“ بہن نے بھائی کے شاداب و دلکش چہرے کی چٹاچٹ بلائیں لیں اور اس کی دمکتی پیشانی پر مہر محبت ثبت کرتے ہوئے بولی۔ ”میرے شیر بابر، خدا تمہیں بہت کامیابی دے۔ ایک عالم کی حکومت تمہارا مقدر بنے۔ ہمیشہ طالع نصیب اور اقبال مند رہو۔“

”شکریہ ہمشیرہ۔“ بابر نے بہن کا سر اپنے سینے سے لگاتے ہوئے گلوگیر آواز میں کہا۔ ”آپ سے مل کر ماں کی یاد تازہ ہو گئی ہے۔ آپ سے وہی خوشبو آتی محسوس ہوتی ہے۔“

”بابا جان۔ یہ کون ہیں؟“ ننھا ہمایوں حیرت سے پوچھ رہا تھا۔

”یہ تمہاری پھوپھی جان ہیں۔“ بابر نے مسکرا کر بیٹے سے بہن کا تعارف کروایا۔ ”یہ بھی تم سے اسی طرح محبت کریں گی جس طرح تمہاری والدہ کرتی ہیں۔“

”کیا واقعی؟“ ہمایوں کی تارہ سی دمکتی آنکھوں میں اشتیاق ہلکورے لے رہا تھا۔ ”پھر ہم بھی پھوپھی جان سے بہت محبت کریں گے۔“

رات کا کھانا بابر نے اپنے بیٹوں اور بہن کے ساتھ ہی کھایا۔ بہن کو دیکھ کر اور اس سے مل کر بابر کو ایک عجب روحانی مسرت کا احساس ہوا تھا اور وہ اس ملاپ پر اپنے رب العزت کا بے حد شکر گزار تھا۔

اگلے دن صبح وہ شاہ اسماعیل کے مہمان وفد سے ملا۔ ان سے ملنے کے بعد اسے یوں محسوس ہوا تھا کہ سمرقند کو حاصل کرنے کے لئے اسے جن دوستوں کی تلاش تھی، شاہ اسماعیل اور اس کا لشکر اس کے لئے ایسے ہی حلیف اور ساتھی ثابت ہوں گے۔

بابر نے فوراً رئیس مرزا کو تحائف اور شکریے کے ساتھ ایران روانہ کر دیا تھا۔ اس نے سوچا بھی نہیں تھا کہ اس کے اظہار تشکر کے طور پر بھیجے گئے یہ تحائف، ایسا خراج تصور کئے جائیں گے جو ایک ماتحت اپنے آقا کو پیش کرتا ہے۔

شاہ اسماعیل، رئیس مرزا اور اس کے ساتھ آئے ہوئے دیگر سفیروں سے بہت مہربانی اور عزت سے پیش آیا اور مطلوبہ مدد فراہم کرنے پر آمادگی ظاہر کی۔ مگر اس مدد کے عوض اس نے کچھ شرائط بھی پیش کر دیں، مثلاً بابر کی بجائے شاہ اسماعیل کا نام خطبے میں شامل کیا جائے اور سکوں پر شاہ کا نام کندہ ہو۔

حالات کے پیش نظر رئیس مرزا نے اپنے تئیں بابر کی طرف سے ان شرائط کو قبول کر لیا۔ اس کے فوراً بعد اسے ایک چھوٹی کمک فراہم کر دی گئی۔ ساتھ ہی شاہ اسماعیل نے ایک بڑے لشکر کو احمد بیگ صفوی، علی خان استجو اور شاہ رخ افشار کی کمان میں تیار رہنے کا حکم صادر کیا تا کہ شرائط منظور ہوتے ہی بابر کی مدد کو لشکر روانہ کر دیا جائے۔

اسی دوران بابر ایک بار پھر حصار کی جانب بڑھا اور اس کے نواح میں پڑاؤ انداز ہو گیا۔ دریا کے اس پار ایک طاقتور ازبک فوج اس پر نظریں جمائے موجود تھی۔ وہ ایک مہینے تک کمک کے انتظار میں وہاں پڑاؤ انداز رہا۔ پھر رئیس مرزا کچھ ایرانی دستوں کے ساتھ آ پہنچا۔

”اوہ! یہ بہت سخت شرائط ہیں۔“ بابر کے شاہی خیمے میں قاسم بیگ، دوست محمد اور دیگر سرداروں کے سامنے جب رئیس مرزا نے شاہ اسماعیل کی نئی شرائط پیش کیں تو بابر سمیت سب ہی عمائدین کے چہروں پر حیرت بھری پریشانی نظر آنے لگی۔

”بھلا ہم ان شرائط کو کس طرح مان سکتے ہیں؟“ قاسم بیگ نے سراسیمہ سے لہجے میں کہا۔ ”سلطان محترم! آپ فوراً شاہ کا دستہ واپس بھیج دیں اور ان شرائط کو نامنظور کرنے کا پیغام روانہ کر دیں۔“

”اتنی جلدی کی ضرورت نہیں ہے۔“ بوڑھے اور دانا وزیر اسامہ نجار نے دھیمی اور سوچ بھری آواز میں کہا۔ ”ہمیں شرائط کی تمام شقوں پر ٹھنڈے دل سے غور کرنا چاہئے۔ اس کے بعد ہی کوئی فیصلہ کرنا مناسب ہوگا۔“

ادھر بابر کی شاہ اسماعیل کے ساتھ معاہدے کی افواہ ازبکوں تک جا پہنچی تھی۔ وہ اس خبر سے خاصے فکر مند ہوئے تھے اور انہوں نے ایرانی کمک کے پہنچنے سے پہلے ہی بابر سے دو دو ہاتھ کرنے کا فیصلہ کر لیا۔

چنانچہ اگلی صبح ازبک دریا پار کر کے بابر کی فوج پر ٹوٹ پڑے، مگر بابر نے نہایت بہادری اور ہوشیاری سے اپنی فوج کو سمیٹ کر حصار کی طرف پیش قدمی شروع کر دی۔

ازبکوں کی اس حرکت نے بابر کو سخت چراغ پا کیا تھا اور اسے فوراً ہی شاہ اسماعیل کی امداد کا خیال آیا۔ اس نے مجوزہ شرائط کو منظور کرتے ہوئے امداد کی درخواست کی۔ ساتھ ہی یہ امید ظاہر کی کہ جلد ہی سارا علاقہ فتح کر لیا جائے گا۔

شاہ اسماعیل نے ایک طاقتور فوج روانہ کر دی، جو اسی مقصد کے لئے تشکیل دی گئی تھی۔ ساتھ ہی اس نے اس بات کی بھی رضامندی دے دی کہ بابر معمول کے مطابق اپنے موروثی علاقوں یعنی فرغانہ اور کابل میں اپنے نام کے سکے چلا سکتا ہے۔ صرف وہ علاقے جو ازبکوں سے حاصل کئے جائیں گے، ان علاقوں میں بابر، شاہ اسماعیل کا باجگزار ہوگا۔

اپنے حلیفوں کی طاقتور سپاہ کے ساتھ بابر نے بخارا کا رخ کیا۔ وہ راستے سے ازبکوں کا نام و نشان مٹاتا بخارا کی طرف بڑھ رہا تھا۔ شاہ اسماعیل کے وسیع لشکر سے زیادہ بابر کے عظیم نام نے اسے عزت و شہرت عطا کی۔ وہ جس شہر یا دیہات میں پہنچتا، وہاں کے لوگ نہایت محبت، احترام اور جوش و خروش سے بابر کا خیر مقدم کرتے۔

بخارا کے دروازے بابر کے لئے کھول دیئے گئے اور بابر نے نہایت آسانی سے اس پر قبضہ کر لیا۔ بخارا کے عوام و خواص کی محبت اور اطاعت نے بابر کے رگ و پے میں ایک نئی توانائی بھر دی تھی۔

بابر اب خود کو بے حد طاقتور محسوس کر رہا تھا۔ اب وہ ایرانی لشکر کی وجہ سے خاصی تشویش میں مبتلا ہو گیا تھا کیونکہ ان کی شرائط خاصی سخت تھیں۔ وہ ان شرائط سے جان چھڑانا چاہتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ ان ایرانی اتحادیوں کی موجودگی بابر کے لئے پریشانی اور تشویش کا باعث تھی۔

”آپ درست رخ پر سوچ رہے ہیں۔“ بابر کی تشویش کو محسوس کرتے ہوئے قاسم بیگ نے تائید بھرے انداز میں کہا۔ ”بہتر ہوگا کہ اگر آپ ایرانی لشکر کو تحفے تحائف دے کر رخصت کر دیں۔“

”قاسم بیگ! تم نے میرے دل کی بات کہہ دی۔“ بابر کے متوحش چہرے پر اطمینان بھری مسکراہٹ جاگی۔ ”میں خود نہیں چاہتا کہ جب ہم اپنے اجداد کی سرزمین سمرقند میں داخل ہوں تو ایرانی لشکر ہمارے ساتھ ہو۔“

چنانچہ بابر نے ایرانی لشکر کو انعام و اکرام کے ساتھ واپس بھیج دیا۔ اگرچہ وہ چلے گئے لیکن اپنے پیچھے شاہ اسماعیل کے نمائندے محمد جان کو چھوڑ گئے۔ یہ ایک جھوٹا، چغل خور اور کینہ پرور انسان تھا۔

اب بابر کے سر پر فکر و تردد کا کوئی بادل نہ تھا۔

فتح و نصرت کی ان مبارک گھڑیوں میں بابر اپنے چچازاد بھائی رئیس مرزا کے حقوق کو نہ بھولا تھا۔ اس نے حصار اور دیگر مفتوحہ علاقے رئیس مرزا کے حوالے کر کے اسے حکومت کے منصب پر مستقل کر دیا۔

بخارا سے بابر سیدھا شہر تیمور گیا۔

1511ء میں نو سال کے انتظار کے بعد آخر ایک بار پھر وہ سمرقند میں فاتح کی حیثیت سے داخل ہو رہا تھا۔ سمرقند کے شفاف نیلے آسمان نے جھک کر بابر کا سواگت کیا تو سرزمین سمرقند اپنے اس اصل حقدار کے قدموں میں بچھ گئی۔

شہر کے تمام باشندے اعلیٰ و ادنیٰ، امیر و غریب، اکابرین و اہل حرفہ، امیر زادے اور کسان سب ہی نے بابر کی آمد پر خوشی و انبساط کا اظہار کیا۔

امراء نے شہر سے نکل کر بابر کا استقبال کیا۔ جبکہ دوسرے طبقات کے لوگ شہر کو سجانے میں مشغول ہو گئے۔ سڑکیں اور بازار سجاوٹ کی اشیاء سے ڈھک دیئے گئے۔

رجب کے ماہ مبارک کے وسط میں بادشاہ بابر انتہائی شان و شوکت اور کر و فر سے شہر میں داخل ہوا۔ سمرقند کے شہری برسوں سے اس کی آمد کے آرزومند تھے۔ وہ اسے اپنے سامنے پا کر شاد و نہال ہوا تھے۔ مگر جلد ہی اہل سمرقند کی مسرت ماند پڑنے لگی تھی۔ کیونکہ ابھی بابر خود کو شاہ اسماعیل کی اعانت سے بے نیاز ہونے کا اہل نہیں محسوس کرتا تھا اور نہ ہی خود کو اتنا طاقتور سمجھتا تھا کہ تن تنہا ازبکوں کا مقابلہ کر سکے۔ اس لئے وہ شاہ اسماعیل سے کئے گئے معاہدے کا پاس کرنے پر مجبور تھا۔ اسی سبب ماوراءالنہر کے باشندوں کے دلوں میں بابر کے لئے وہ اخلاص و اشتیاق باقی نہ رہا جو وہ اس کی عدم موجودگی میں محسوس کرتے تھے۔ اب ان کے دلوں سے اس کی عقیدت ختم ہو گئی تھی۔

بابر واقعی ایک دشوار صورت حال سے دوچار تھا۔

مگر وہ اپنی بات کا پکا تھا۔ وہ شاہ اسماعیل سے جو عہد و پیمان کر چکا تھا۔ وہ انہیں نبھانا ضروری سمجھتا تھا۔ مگر وہ عجب دوراہے پر کھڑا تھا۔ ایک طرف ایران کے ساتھ تعلقات کی بنا پر سمرقند میں اس کی مقبولیت مستقل طور پر کم ہو رہی تھی تو دوسری طرف شاہ ایران بھی اس سے اس بنا پر ناراض ہو گیا کہ اس نے ایرانی ایلچی محمد جان کے ساتھ کچھ اچھا سلوک نہیں کیا تھا۔

بابر نے محمد جان کے ساتھ ایک آزاد اور خود مختار بادشاہ کا سا رویہ اختیار کیا تھا جس کو اس کینہ پرور شخص نے بڑھا چڑھا کر ایرانی بادشاہ کی خدمت میں پیش کیا اور اطلاع دی کہ بابر مغرور اور عہد شکن ہے اور شاہ ایران یعنی اپنے حکمران اعلیٰ کے ساتھ باغیانہ ارادوں کی پرورش کر رہا ہے۔

شاہ اسماعیل نے انتہائی غیظ و غضب کے عالم میں ”مجرم“ کو فرمانبرداری کا سبق سکھانے کے لئے اپنے سالار میر نجم ثانی کو روانہ کیا۔ لیکن اس سے قبل کہ گیارہ ہزار سپاہیوں پر مشتمل ایرانی فوج بابر پر ضرب لگانے کے لئے حدود میں داخل ہوتی، حالات میں تبدیلی رونما ہو گئی۔

ازبک سرداروں نے ایک زبردست فوج جمع کر کے بخارا کی طرف پیش قدمی شروع کر دی۔ بابر نے مقابلے کا فیصلہ کیا مگر ازبک فوج کی تعداد بہت زیادہ تھی۔ وہ پیچھے ہٹنے پر مجبور ہو گیا اور نہ صرف بخارا بلکہ سمرقند بھی اس کی گرفت سے نکل گیا۔ اس لئے وہ اپنے لشکر کو لے کر حصار چلا گیا۔

خود کو حصار کے قلعے میں بند کر کے اس نے شہر کے چاروں طرف خندقیں کھودنے کا حکم دیا اور سڑکوں کو الگ الگ حصوں میں بانٹ کر ہر ایک پر نگراں مقرر کر دیئے۔

ازبکوں نے بابر کا پیچھا نہ کیا بلکہ وہ سمرقند پر دوبارہ قبضہ کر کے مطمئن ہو گئے۔ اُدھر جب شاہ اسماعیل کا سالار میر نجم ثانی خراساں کی سرحد پر پہنچا تو یہ جان کر حیران ہوا کہ وہ جس بابر کو سزا دینے کے لئے آیا ہے، وہ وہاں نہ تھا۔ چنانچہ سالار نجم ثانی کو اپنی سپاہ کو ازبک فوج کے ساتھ امدادی فوج میں تبدیل کرنا پڑا۔

نجم ثانی کی فوج اور ازبک سپاہی یکجا ہو کر بخارا کی طرف بڑھے اور خضر پر قبضہ کر لیا۔ بابر کے لئے یہ بات ناقابل برداشت اور شدید اذیت کا باعث تھی کہ ایرانی فوج جس علاقے سے گزرتی، وہاں کے باشندوں پر شدید ظلم و ستم ڈھاتی۔ قرشی کے قبضے میں انہوں نے تمام آبادی کو قتل کر دیا۔ بابر جو ایرانی حکومت کے ہاتھوں عملی طور پر قیدی تھا، چار و ناچار یہ سب خاموش دیکھتا رہا۔

اسی دوران ایک جھڑپ میں ایرانی سالار نجم ثانی مارا گیا۔

1512ء کی اس جنگ کے بعد بابر کا ایک بار پھر حصار لوٹ گیا۔

وہ ایک افسردہ اور مایوس شام تھی۔ قاسم بیگ کے ساتھ بابر اپنی خواب گاہ کی بالکونی میں اداس کھڑا خالی خالی نظروں سے خزاں رسیدہ باغیچے کی طرف دیکھ رہا تھا۔

”آپ بہت مایوس دکھائی دے رہے ہیں؟“ قاسم بیگ نے دھیمی آواز میں کہا۔ ”بادشاہوں کی زندگیوں میں اس طرح کے نشیب و فراز تو آتے ہی رہتے ہیں۔“

”تم ٹھیک کہتے ہو۔“ بابر نے گہرا سانس لیا۔ ”یہاں دم گھٹتا محسوس ہو رہا ہے۔ میں نیچے پائیں باغ میں چہل قدمی کرنا چاہتا ہوں۔“

”ضرور تشریف لے جائیے۔“ قاسم بیگ نے جھک کر مؤدبانہ کہا۔ ”مگر میں ساتھ چلنے کا شرف حاصل نہ کر سکوں گا۔ ایک منگول سردار ملاقات کا منتظر ہے۔ مجھے اس سے ملنے کے لئے مہمان خانے میں جانا ہوگا۔“

”منگول سردار؟“ بابر نے حیرت سے پوچھا۔

”آپ کو یاد ہوگا کہ ایک معرکے کے دوران ہم نے کچھ منگول سپاہیوں کو ان کی لوٹ مار اور وحشت گردی کی بنا پر سزا دی تھی۔“

”ہاں یاد ہے۔“ بابر نے اثبات میں سر ہلایا۔ ”بھلا اس واقعے کا یہاں کیا مذکور؟“

”جی! یہ سردار اور اس کے کچھ منگول ساتھی اس سلسلے میں کچھ کہنے سننے کے لئے آئے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ آپ نے ان منگول سپاہیوں کے ساتھ ظلم کیا تھا۔“ قاسم بیگ نے دھیمی آواز میں بیان کیا۔

بابر کے دلکش چہرے پر ناگواری کے سائے بکھر گئے۔

”اسی کو کہتے ہیں چوری اور سینہ زوری۔“ وہ غصیلے لہجے میں بولا۔ ”تمہیں ان لوگوں کو یہاں آنے کی اجازت نہیں دینا چاہئے تھی۔“

”آپ بجا فرماتے ہیں۔“ قاسم بیگ نے سر جھکا کر مؤدبانہ لہجے میں کہا۔ ”یقیناً مجھ سے غلطی ہوئی۔ لیکن مجھے امید ہے کہ میں انہیں مطمئن کر کے واپس روانہ ہونے پر مجبور کر دوں گا۔ آپ بے فکر ہو کر پائیں باغ میں چہل قدمی کے لئے تشریف لے جائیے۔“

”ٹھیک ہے۔“ بابر کی فکر کم نہیں ہوئی تھی۔ اس کی آنکھوں سے گہری سوچ جھانک رہی تھی۔

وہ آہستہ روی سے چلتا پائیں باغ کی طرف بڑھ گیا تھا۔ سردی کے اس شدید موسم میں سبزہ جل جاتا تھا اور درخت ٹنڈ منڈ ہو جاتے تھے۔ پرندے اپنے ٹھکانوں میں دبکے پڑے تھے، زیادہ تر گرم علاقوں کی طرف پرواز کر چکے تھے۔ ہر سمت ایک ویرانی اور اداسی بکھری ہوئی تھی۔

بابر پشت پر ہاتھ باندھے سوچوں میں گم آہستگی سے چلتا گھنے پیڑوں کے جھنڈ کے درمیان پہنچ گیا۔ اس مقام پر دس بارہ پیڑ اس ترتیب سے لگائے گئے تھے کہ ایک حصار سا بن گیا تھا۔ ان دنوں جب پیڑ خوب سرسبز ہوتے تھے تو یہ سارے مل کر ایک چھت سی بنا لیتے تھے۔ اس کے گھنے سائے میں آرام کرنا بڑا پُر لطف محسوس ہوتا تھا مگر اس پل درختوں پر خزاں آئی ہوئی تھی اور تنے خاموش اور ساکت کھڑے تھے۔

بابر اس جھنڈ میں جوں ہی داخل ہوا، ایک دم سے سامنے سے ایک منگول سپاہی اس پر جھپٹا۔

”تم کون ہو؟“ بابر نے غصے سے پوچھا۔

”میں انہی سپاہیوں کا رشتے دار ہوں بادشاہ۔“ منگول خونخوار لہجے میں جواب دہ ہوا۔ ”جن کے تم نے ٹکڑے کروا دیئے تھے۔“

”وہ اسی کے حقدار تھے۔“ بابر نے مضبوط لہجے میں جواب دیا اور فوری طور پر کمر میں اڑسا خنجر نکالنا چاہا۔

”خبردار بادشاہ۔“ دوسرے پیڑ کی آڑ سے ایک اور منگول سپاہی نمودار ہوا۔ ”ہتھیار نکالنے کی کوشش نہ کرنا۔ اب تمہارا آخری وقت آ گیا ہے۔ تمہیں تمہارے کئے کی سزا ملے گی۔“

بابر نے سامنے کی طرف دیکھا۔ دو اور منگول سپاہی تیزی سے اس کی جانب بڑھ رہے تھے۔ بابر غیر محسوس طریقے سے پیچھے ہٹنے لگا۔ پائیں باغ کے دائیں جانب ذرا فاصلے پر اصطبل تھا جس میں اس کا اسپ وفادار ہنہنا رہا تھا۔ مگر ان منگول خون کے پیاسے قاتلوں کے بیچ سے بچ نکلنا اتنا آسان نہ تھا لیکن وہ شیر دل بابر تھا۔ کوئی عام انسان نہیں کہ خود کو دشمن کے نرغے میں پا کر ہمت چھوڑ دیتا۔

بابر نے چوکنا نظروں سے اصطبل میں بندھے اپنے گھوڑے کی طرف دیکھا۔ خطرے کو بھانپ کر وہ بے چینی سے گھوم رہا تھا اور ہنہنا رہا تھا۔

بابر نے بجلی کی سی سرعت سے خنجر نکال لیا اور قریب کھڑے منگول پر ایسا وار کیا کہ وہ کسی کٹے ہوئے شہتیر کی طرح زمیں بوس ہو گیا۔

بقیہ تینوں منگول لحظہ بھر کو اپنی جگہ ساکت رہ گئے۔ یہ وقفہ بابر کے لئے کافی تھا۔ وہ تیر کی طرح گھوڑے کی طرف دوڑا۔

ایک منگول نے چونک کر تلوار نکال لی اور بھاگتا ہوا بابر کی طرف بڑھا۔

بابر نے خنجر ہاتھ میں تول کر اس کی طرف اس طرح پھینکا کہ خنجر اس کے دل کے پار ترازو ہو گیا۔ وہ فلک شگاف چیخ کے ساتھ زمین پر ڈھیر ہو گیا۔ بقیہ دو منگول سپاہی حیرت سے آنکھیں پٹپٹاتے بابر کی سمت تک رہے تھے۔

بابر اب گھوڑے تک پہنچ چکا تھا۔ گھوڑے کی لگام تھام کر اس نے پشت پر جست لگائی اور گھوڑے کی پشت پر بیٹھتے ہی اس نے گھوڑے کو ایڑ لگائی۔

”تم اس طرح بھاگ نہیں سکتے۔ آج تمہاری موت ہمارے ہاتھوں لکھی ہے۔ ہم تمہیں قتل کر کے ہی دم لیں گے۔“ دونوں منگول سپاہی خنجر لہراتے، تلوار چمکاتے اس کی طرف دوڑ پڑے۔ ایک منگول نے تاک کر خنجر پھینکا مگر اس کا نشانہ چوک گیا۔

بابر کا گھوڑا آندھی طوفان کی طرح اصطبل کے پچھلے راستے سے نکلا اور رات کی تاریکی میں گم ہو گیا۔

کئی روز تک جنگل میں بھٹکنے کے بعد بالآخر بابر قندز روانہ ہوا اور رئیس مرزا کے پاس پہنچا۔

”بھائی جان، آپ؟“ رئیس مرزا اسے یوں تن تنہا پریشان حال دیکھ کر حیران ہوا۔ ”یہاں، اس طرح اکیلے...... اور لوگ کہاں ہیں؟“

”کچھ مت پوچھو برادر۔“ بابر نے آہ بھر کر جواب دیا۔ ”بس یہ سمجھو کہ بڑی مشکل سے اپنی جان بچا کر یہاں تک پہنچا ہوں ورنہ ان منگولوں نے میری جان لینے میں کوئی کسر نہ چھوڑی تھی۔“

ایک سال تک قندز میں دکھ و پریشانیاں جھیلنے کے بعد اس نے حصار سے مایوس ہو کر کابل جانے کا ارادہ کیا۔

”کل روانگی ہے۔“ اس نے اپنے خادم میر دوست سے کہا۔ ”اس وقت تم میرے لئے مینا و ساغر لے آؤ۔ میں اپنی فکر و تردد کو ساغر میں ڈبو دینا چاہتا ہوں۔“

سمرقند پر اپنے پُر آشوب تسلط کے زمانے میں اس نے پہلی بار جام شراب میں اپنی پریشانیوں سے پناہ تلاش کی تھی۔ اسی زمانے سے وہ ایک عادی بادہ نوش بن گیا تھا اور شراب کی محفلوں میں ایک عجب سکون اور انبساط محسوس کرنے لگا تھا۔ اگرچہ شراب نے اس کی درخشاں صلاحیتوں کو ماند نہیں کیا لیکن یقینی طور پر اس کی عمر میں کمی کر دی۔

ایک بار پھر وہ ایک معمولی شہزادے کی سی زندگی گزارنے پر مجبور تھا مگر ایک مرتبہ پھر اس نے کابل کا رخ کرنے کا فیصلہ کیا تھا۔

ناصر مرزا نے ایک نادر مصلحت اندیشی کا ثبوت دیتے ہوئے خوشی سے کابل کی سلطنت چھوڑ دی۔ گرم جوشی سے اپنے بھائی کا خیر مقدم کیا اور اپنی غزنی کی جاگیر پر جانے کی اجازت مانگی۔

”کیا یہ بہتر نہ ہوگا کہ ہم دونوں بھائی ایک ساتھ رہیں؟“ بابر اس وقت نشے میں تھا۔ لڑکھڑاتی آواز میں بولا۔ ”جانتے ہو اب تمہارے چار بھتیجے ہو گئے ہیں۔ ہمایوں، کامران عسکری اور ہندال...... تمہارا بھائی چار بیٹوں کا باپ ہے اور اپنی اس خوش بختی پر بے حد نہال ہے۔“

”میں جانتا ہوں برادر عزیز۔“ ناصر مرزا مسکرا کر بولا۔ ”خدا میرے بھتیجوں کی لمبی عمر کرے۔ مگر اس وقت میرا غزنی جانا مناسب رہے گا۔“

بصد مشکل اور بادل نخواستہ بابر نے ناصر مرزا کو جانے کی اجازت دی۔ مگر اس سے قبل کہ ناصر مرزا غزنی کے لئے روانہ ہوتا، اچانک اسے موت نے آ لیا۔ اس کی غیر متوقع موت سب کے لئے حیران کن اور دکھ آمیز تھی۔ مگر بابر کے خلاف ایک بغاوت مقامی سرداروں میں پھیل گئی۔ جن میں میر شیرم جیسے امراء بھی شامل تھے جنہوں نے تمام عمر بابر کی خدمت میں گزاری تھی۔ بابر نے بہتیرا یہ ثابت کرنے کی کوشش کی کہ ناصر مرزا اس کا چھوٹا بھائی تھا اور اسے بے حد عزیز تھا، وہ بھلا اسے مارنے کی سازش کیوں کرے گا۔

”میر شیرم! تم مجھے کم از کم اتنا تو جانتے ہو۔“ بابر نے میر شیرم کو مخاطب کر کے کہا۔ ”یہ گواہی دے سکتے ہو کہ مجھے اپنے عزیز اقربا، اپنا خاندان، اپنے دوست احباب ہمیشہ ہی بے حد عزیز رہے ہیں اور ناصر مرزا تو میرے لئے میری اولاد جیسا تھا، کیا بابر اپنے ہمایوں کا خون کرنے کے بارے میں سوچ سکتا ہے؟ اگر نہیں تو جان لو بابر اپنے بھائی ناصر مرزا کی بھی جان نہیں لے سکتا۔“

مگر سرداروں کے دماغ میں خناس آ گیا تھا۔

منگول سپاہی جنگ کے لئے بے تاب تھے۔

آخر بابر کو گفت و شنید کا سلسلہ ترک کر کے میدان جنگ میں آنا پڑا۔ ایک زبردست معرکہ ہوا اور آخر فتح بابر کا مقدر بنی۔ اس نے سارے منگول دستے منتشر کر دیئے جو اصل فساد کی جڑ تھے اور اس طرح تقریباً ایک سال تک سکون رہا۔

☆......☆......☆

موسم بہار کی آمد آمد تھی۔ ہواؤں میں تازگی اور رعنائی بسی ہوئی تھی۔ درختوں اور پودوں پر نئے شگوفے پھوٹ رہے تھے۔ سرسبز پتے اپنی تمام تر ہریالی اور تازگی کے ساتھ نمو پذیر تھے۔ نوخیز کلیاں مسکرا رہی تھیں۔ نوشگفتہ غنچے چٹخ رہے تھے۔ ایسے میں بابر اپنے چہیتے بیٹے ہمایوں کے ساتھ پائیں باغ میں چہل قدمی کر رہا تھا۔ اس کے ساتھ اس کا دیرینہ دوست قاسم بیگ بھی موجود تھا۔

اس شگفتہ اور شاداب موسم میں بھی بابر کے چہرے پر فکر و تردد کے آثار تھے اور آنکھوں سے گہری سوچ جھانک رہی تھی۔

”آپ کچھ فکر مند دکھائی دیتے ہیں؟“ آخر قاسم بیگ پوچھنے پر مجبور ہو گیا۔ ”کیا کوئی الجھن آمیز بات ہے؟“

”ہاں قاسم بیگ۔“ بابر نے الجھن بھری نظروں سے قاسم کی طرف دیکھا۔ ”منگول سپاہیوں کے گزشتہ ہنگامے کے بعد میں ایک بات بڑی شد و مد سے سوچ رہا ہوں۔“

”فرمائیے، وہ کیا بات ہے؟“ قاسم بیگ نے مستعد لہجے میں سوال کیا۔

”ہمیں اگر فتوحات حاصل کرنی ہیں تو اپنی فوج کی کارکردگی بڑھانے کی طرف توجہ دینی ہوگی۔“ بابر نے پُر سوچ لہجے میں کہا۔

”میں سمجھا نہیں۔“ قاسم بیگ نے قدرے حیران لہجے میں سوال کیا۔ ”ہمارے پاس تربیت یافتہ فوج ہے، بے شمار شمشیر زن اور خنجر باز موجود ہیں اور مزید ہتھیاروں کی مشق پر توجہ دی جا رہی ہے۔“

”قاسم! شاید تمہیں یاد ہو، اس زمانے میں جب تہران اور قسطنطنیہ کے درمیان جنگ شروع ہوئی تھی، شاہ اسماعیل، سلطان سلیم کی حملہ آور فوجوں کا مقابلہ کرنے کے لئے اپنے علاقے کی سرحدوں کی طرف بڑھا تھا۔ دونوں اطراف کی فوجوں کی تعداد تقریباً برابر تھی۔ جب یہ سپاہ آمنے سامنے آئیں تو شاہ اسماعیل نے اپنی شاندار فوج کے ساتھ حملہ کیا مگر جب اس کا جواب ترکوں کے توپ خانے اور چھوٹے آتشیں ہتھیاروں نے دیا تو وہ اپنے طریقۂ جنگ کو ان کے سامنے ناکارہ پا کر ہراساں ہو گیا تھا۔“

”جی۔“ قاسم بیگ نے تائید بھرے انداز میں سر ہلایا۔ ”اور ایرانی فوجوں کو شکست فاش ہوئی تھی۔ شاہ اسماعیل بڑی مشکل سے اپنی جان بچا کر فرار ہونے میں کامیاب ہو سکا تھا۔“

”ہاں۔“ بابر نے کھوئے کھوئے انداز میں کہا۔ ”نتیجتاً اس نے نیا طریقۂ جنگ سیکھنے کا ارادہ کر لیا اور اس مقصد کے لئے اس نے ماہر ترکی توپچیوں اور بندوقچیوں کو اپنی فوج کی تربیت کے لئے بلا کر رکھا۔“

”تو کیا آپ بھی......؟“ قاسم بیگ نے قدرے حیران اور بے یقین لہجے میں پوچھا۔ ”کیا آپ بھی اسی نہج پر سوچ رہے ہیں؟“

”ہاں قاسم بیگ۔“ بابر نے اپنا رخ نوشگفتہ غنچوں کی طرف کر لیا۔ اس کے ہاتھ اس کی پشت پر بندھے تھے، اس کا اونچا سر اس کے عزم کی طرح بلند تھا۔ اس نے کئی لمحوں تک اپنے فیصلے پر نظر ثانی کرتے رہنے کے بعد دوٹوک لہجے میں کہا۔ ”اب میں مغرب کی بجائے مشرق میں قسمت آزمائی کا ارادہ رکھتا ہوں، اب میں ہندوستان کی طرف رخ کرنا چاہتا ہوں اور ہندوستان میں فتح و کامرانی کے لئے دنیا کی کسی بھی دوسری چیز سے زیادہ اہم اور معاون ہو سکتا ہے، ایک طاقتور توپ خانہ۔“

”اوہ۔“ قاسم بیگ کا کھلا منہ کئی لمحوں تک کھلا ہی رہ گیا۔ ”کیا ایسا...... ایسا ممکن ہے؟“

”کیوں نہیں۔“ بابر نے گردن کو خم دے کر قاسم بیگ کی طرف دیکھا۔ ”ترکی کے توپ بنانے کے ماہر استاد علی سے رابطہ کرو اور اسے کسی بھی قیمت پر کابل آنے پر راضی کرو۔“

”جو حکم میرے آقا۔“ کئی لمحوں تک بابر کی طرف حیران نظروں سے تکتے رہنے کے بعد قاسم نے آخر کار سر تسلیم خم کر لیا تھا۔

اور استاد علی کی آمد کا دن بابر کی زندگی کا ایک سنہرا دن تھا۔

توپ خانے کی تیاری کا کام شروع ہو گیا تھا۔ مگر استاد علی اتنے بڑے پیمانے پر کام سنبھالنے سے پریشان تھا چنانچہ بابر نے ایک اور ترکی ماہر مصطفی کی خدمات حاصل کر لیں۔ اب بابر نے استاد علی کو اپنے محکمہ ذخائر حربی کا ناظم نامزد کر دیا تھا۔

وقت اپنی مخصوص رفتار سے آگے بڑھتا رہا۔

تقریباً پانچ سال تک بابر اپنے توپ خانے کی تیاری اور اس کی طاقت پر بھرپور توجہ دیتا رہا اور آخر کار وہ ایک طاقتور اور قابل بھروسا توپ خانہ تیار کرنے میں کامیاب ہو گیا تھا۔

اب اس نے چغان سرائے کے آگے تغلق قلعوں پر نظر ڈالنے اور افغان قبیلوں کے خاندانی جھگڑوں میں حصہ لینے کی بجائے تمام تر توجہ اپنے نئے سفر اور نئی منزلوں کی طرف مبذول کر دی تھی۔

اس کے شہزادے، اس کے لخت جگر اس سے شانہ ملا کر چلنے کے قابل ہو گئے تھے۔ خاص طور پر اس کا ولی عہد اور چہیتا بیٹا ہمایوں اس کا مضبوط سہارا تھا اور اسے اپنے اس ہونہار بیٹے پر بڑا ناز تھا۔

”بادشاہ محترم۔“ قاسم بیگ نے بابر کے سامنے جھکتے ہوئے عرض کیا۔ ”ہندوستان سے دولت خان لودھی کا ایلچی آیا ہے۔“

”دولت خان لودھی؟“ بابر نے سوالیہ نگاہوں سے دیکھا۔

”دہلی کی ریاست کے حکمران، ابراہیم لودھی کے صوبۂ پنجاب کا گورنر دولت خان لودھی، اس نے ابراہیم لودھی کے خلاف علم بغاوت بلند کر کے آپ کو ہندوستان پر حملہ کرنے کی دعوت بھیجی ہے۔“

بابر کے پُرسکون چہرے پر اطمینان بھری مسکراہٹ کھیل رہی تھی۔ (جاری ہے)

allurdupdfnovels.blogspot.com www.freepdfpost.blogspot.com

ظہیرالدین بابر

اشتیاق فاطمہ عظمیٰ

قسط : 13 ”تو آپ کیا فرماتے ہیں؟“ بابر کو خاموش پا کر قاسم بیگ نے دوبارہ سوال کرنے کی جسارت کی۔

”یہ ٹھیک ہے قاسم بیگ کہ ہم اب تک چار بار ہندوستان پر حملے کر چکے ہیں مگر اب......“ بابر بولتے بولتے لحظہ بھر کو خاموش ہوا۔ پھر قاسم بیگ کی آنکھوں میں جھانک کر مضبوط لہجے میں بولا۔ ”مگر اب ہم بہت سوچ سمجھ کر، پوری تیاری اور منصوبہ بندی کے ساتھ ہندوستان پر آخری ضرب لگانا چاہتے ہیں اور اس کے لئے ہمیں سب سے پہلے وہاں کے حالات کا انتہائی باریک بینی سے جائزہ لینا ہوگا۔“

”بادشاہ محترم! اس سلسلے میں کام جاری ہے۔“ قاسم بیگ نے سر جھکا کر جواب دیا۔ ”بلکہ کافی معلومات حاصل بھی کر لی گئی ہیں، آپ کی اجازت کا منتظر تھا تاکہ آپ کی خدمت میں وہ معلومات پیش کی جا سکیں۔“

”بہت خوب۔“ بابر کی مسکراہٹ کچھ اور گہری ہوگئی۔ ”قاسم بیگ ہم سننا چاہیں گے کہ آج کل ہندوستان میں کس طرح کے حالات ہیں؟“

”جناب عالی۔“ قاسم بیگ نے ایک بار پھر جھکتے ہوئے بات کا آغاز کیا۔ ”معلوم ہوا ہے کہ کافی عرصے سے ہندوستان میں ایک عجب سا خلفشار برپا ہے، نہ سپاہی سردار کی سنتے ہیں، نہ رعایا حاکم کی۔ کہنے کو وہاں سب سے بڑی حکومت ابراہیم لودھی کی ہے۔ لیکن زیادہ تر صوبائی گورنروں اور سرداروں نے خود مختاری کا اعلان کر دیا ہے اور یہ سردار ہمیشہ باہمی چپقلش کا شکار ہو کر آپس میں برسرِپیکار رہتے ہیں، امن و اتحاد کو انہوں نے ہی سب سے زیادہ نقصان پہنچایا ہے۔“

”بہت خوب۔“ بابر نے پوری توجہ اور انہماک سے قاسم بیگ کی بات سنتے ہوئے پسندیدگی کا اظہار کیا۔ ”کچھ ابراہیم لودھی کے بارے میں بتاؤ۔“

”گو کہ ابراہیم لودھی وہاں کا حاکم اعلیٰ ہے مگر درحقیقت اس کا اقتدار صرف آگرہ، دہلی، دوابہ، بیانہ اور چندیری کے علاقوں تک محدود ہو کر رہ گیا ہے۔ اس کی یہ نام نہاد حکومت اپنی عظمت سے محروم ہو چکی ہے۔ رعایا نہ اپنے حاکم کو پہچانتی ہے، نہ اس کی پروا کرتی ہے، سب اپنے حال میں مست ہیں۔ ابراہیم لودھی کیونکہ ایک متکبر اور ظالم حکمران ہے، اس لئے عوام ایک طرف اس کے سردار اور رشتے دار بھی اس سے ناخوش ہیں، یہاں تک کہ خود اس کا چچا عالم خان اس سے سخت عاجز ہے۔ سنا ہے کہ وہ جلد ہی خود کابل آ کر آپ سے دست بستہ گزارش کرنے والا ہے کہ آپ اپنے شاندار لشکر اور طاقتور توپ خانے کے ساتھ ہندوستان کا رخ کیجئے۔“

”ہوں......!“ بابر نے پُرسوچ انداز میں ہنکارا بھرا۔

”دوسری طرف ہندو بھی امن و آشتی کے لئے ترس رہے ہیں۔“ قاسم بیگ نے دم بھر کو رک کر دم لیا اور دوبارہ اپنا سلسلہ کلام وہیں سے جوڑا جہاں سے توڑا تھا۔ ”ان میں بھی اتحاد کا فقدان ہے۔ ان کی قیادت راجپوتوں کے ہاتھ میں ہے اور یہ راجپوت سردار بھی آپس میں دست و گریباں رہتے ہیں، لیکن اب کچھ عرصے سے راجپوت ریاستیں رانا سانگا (رانا سنگرام سنگھ) کے جھنڈے تلے متحد ہو رہی ہیں اور اس طرح رانا سانگا کی طاقت میں بے پناہ اضافہ ہو گیا ہے اور وہ خود اب ہندوستان پر راج کرنے کا خواب دیکھ رہا ہے۔“

”بہت خوب۔“ بابر نے ایک بار پھر اثبات میں سر ہلایا۔ ”دولت خان لودھی کا ایلچی کس لئے آیا ہے؟“ ساری بات سننے کے بعد بابر نے ایلچی کے بارے میں سوال کیا جس کے بارے میں بتانے کے لئے قاسم بیگ اس کے پاس آیا تھا۔

”بادشاہ سلامت! اس نے آپ کو ہندوستان پر حملہ آور ہونے کی دعوت بھیجی ہے۔“

”اس کی دعوت قبول کی جاتی ہے۔“ بابر نے دھیمی آواز میں کہا۔ ”اسے تحفے تحائف دے کر رخصت کر دیا جائے۔“

”تو کیا آپ......“ قاسم بیگ نے سوال کرنا چاہا مگر درمیان میں ہی رک گیا۔

”تم جانتے ہو قاسم بیگ، ہم نے ہندوستان پر کئی حملے کئے اور مال غنیمت لوٹ کر واپس لوٹ آئے۔ مگر اس بار ہم ایک بھرپور ضرب لگانا چاہتے ہیں اور اسی کے لئے ہم برسوں سے تیاری کر رہے ہیں، گو کہ ہماری تیاریاں مکمل ہیں۔ مگر ابھی ہمیں تھوڑا اور انتظار کرنا ہوگا۔ عالم خان کو آنے دو۔ اس کے بعد فیصلہ کرتے ہیں۔“

”جو آپ کا حکم آقا۔“ قاسم بیگ نے سرِتسلیم خم کرتے ہوئے کہا اور آہستگی سے باہر کی جانب چلا گیا۔

ایلچی کے واپس بھیجے جانے کے کچھ ہی عرصے بعد دولت خان نے اپنے بیٹے دلاور خان کو کابل میں بابر کی خدمت میں بھیجا۔

”والد محترم نے آپ سے درخواست کی ہے کہ آپ ابراہیم لودھی پر یلغار کریں، ہم سب آپ کا ساتھ دیں گے۔“

بابر نے اسی شام اپنے تمام سرداروں اور امراء و وزراء کو طلب کر کے مشاورت کا عمل شروع کیا۔ دولت خان کی طرف سے بھیجے گئے ایلچی کے بعد اس کے فرزند ارجمند کی آمد توجہ طلب امر تھی۔ سو بہت سوچ بچار کے بعد بابر نے حملے کا ارادہ کیا۔

”کیا یہ ہمارا آخری حملہ ہوگا؟“ سردار ریاست خان نے سوال کیا۔

”یہ حالات پر منحصر ہے۔“ بابر نے پُرسوچ نظروں سے اسے دیکھتے ہوئے جواب دیا۔ ”ہو سکتا ہے ابھی ہمیں واپس آنا پڑے...... مگر جانا ضروری ہے۔“

”جیسا آپ مناسب سمجھیں۔“ تمام مشیران نے سر جھکا دیا۔

بابر کا یہ حملہ شمالی مغربی سرحد پر باجوڑ کے قلعے پر ہوا۔ بابر کو فتح حاصل ہوئی۔ بابر تیزی سے بڑھتا ہوا دریائے جہلم تک جا پہنچا اور اس نے شہر بھیرہ پر قبضہ جما لیا۔ اب اس کا رخ لاہور کی طرف تھا۔

پنجاب کے گورنر دولت خان سے اسے مدد و تعاون کی امید تھی۔ اسی نے اپنے بیٹے دلاور خان کو بھیج کر اس کو ہندوستان پر حملہ کرنے کے لئے راغب کیا تھا مگر اس پل دولت خان نے بابر سے بے رخی برتی۔ اس سے مدد اور راست گاری کا وعدہ فراموش کر کے وہ ابراہیم لودھی کا فرمانبردار اور وفادار بن بیٹھا۔

”مجھے دولت خان سے ایسی توقع نہ تھی۔“ بابر صدمے اور غصے بھرے لہجے میں کہہ رہا تھا۔ ”یہ ایسا طوطا چشم ثابت ہوگا، مجھے اندازہ نہ تھا۔“

”تو اب اس کے لئے آپ نے کیا سوچا ہے؟“ رزاق خان نے سوال کیا۔

”سلطان پور اور جالندھر کی جاگیریں دولت خان کو عطا کی جاتی ہیں۔“ بابر نے کمال ضبط کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔

بابر کے پلٹتے ہی دولت خان نے بابر کے خلاف بھی علمِ بغاوت بلند کر دیا۔ وہ اسی انداز کا شخص تھا۔ اب تک وہ ابراہیم لودھی کے ساتھ بھی ایسا ہی کرتا آیا تھا مگر اسے اندازہ نہیں تھا کہ اب اس کے سامنے ابراہیم لودھی نہیں بلکہ ظہیرالدین بابر ہے۔

بابر کو جونہی دولت خان کی اس حرکت کی خبر ملی، وہ واپس لوٹ آیا۔ دولت خان کو اس کے اس طرح لوٹ آنے کا اندازہ نہ تھا۔ وہ بری طرح گڑبڑا گیا۔ بابر نے اسے مزید سنبھلنے کا موقع نہ دیا اور اس کی جاگیریں چھین کر اس کے بیٹے دلاور خان کو دے دیں۔

پھر دیپال پور کی جاگیر عالم خان کے حوالے کر کے وہ کابل کے لئے روانہ ہو گیا۔ بابر کے کابل روانہ ہوتے ہی دولت خان نے دلاور خان اور عالم خان کی جاگیریں چھین لیں۔ اس پر عالم خان بے حد ناراض ہوا اور ایک بار پھر بابر سے حملے کی درخواست کی مگر خود دولت خان سے بھی مل گیا۔ بابر افغان سرداروں کے اس کردار سے اب بخوبی واقف ہو چکا تھا۔ چنانچہ آئندہ اس نے فیصلہ کیا تھا کہ جب بھی ہندوستان پر حملہ کرے گا تو اپنی قوت بازو پر بھروسا اور خدا کی مدد پر یقین کر کے ہی آگے بڑھے گا۔

اس اثنا میں راجپوت راجہ رانا سانگا کے قاصد بھی بابر تک پہنچتے رہے۔ رانا سانگا کا خیال تھا کہ بابر حملہ آور ہوگا اور اپنی طاقت سے ابراہیم لودھی کی حکومت کو زیر و زبر کر کے لوٹ مار اور مال غنیمت حاصل کر کے واپس لوٹ جائے گا اور اس کے جانے کے بعد رانا سانگا اور اس کے ساتھی ہندوستان کے مالک بن جائیں گے اور اس طرح ہندوستان پر راجپوت حکومت قائم کرنے کا اس کا دیرینہ خواب شرمندۂ تعبیر ہو سکے گا۔

☆......☆......☆

شہر تاریکی میں ڈوبا ہوا تھا۔ دلی کے ملگجے آسمان پر ٹمٹماتے اِکا دُکا ستاروں کی مدھم روشنی میں شہر کے کوچہ و بازار، مکان، چوبارے اور چھتیں بے چین نیند میں ڈوبے ہوئے تھے۔ جس میں اضافے کے ساتھ نیند کی بے چینی بھی بڑھتی جاتی تھی۔

دن بھر کی محنت و مشقت سے چور تھکے ماندے شہری کھری چارپائیوں پر گھر کے کشادہ آنگنوں، کوٹھوں، گلیوں اور راہ گزاروں پر پڑے سو رہے تھے۔ اِکا دُکا اس وقت بھی ہنستے، خوش گپیاں کرتے پھر رہے تھے۔ کسی کسی کے ہاتھ میں موتیا کے گجرے تھے۔

پھولوں کی مہک کچھ دیر ہوا میں سفر کرتی فضا کو معطر کرتی اور پھر گرمی کی حدت میں گم ہو جاتی۔ کوئی گنگناتا لڑکھڑاتے قدموں سے کسی گانے والی کے کوٹھے کی سیڑھیاں اترتا اور تاریک گلیوں میں گم ہو جاتا۔

کتے غذا کی تلاش میں نالیاں سونگھتے پھر رہے تھے۔ بلیاں دکانوں کے آگے بنے تھڑوں کے نیچے سے دبے پاؤں باہر نکلتیں اور دودھ کے ان آبخوروں کو چاٹنے لگتیں جو دودھ پینے کے بعد لوگ پھینک گئے تھے۔

زمین اور در و دیوار سے گرمی کے بھبکے اٹھ رہے تھے۔ نالیوں میں سیل اور سڑاند تھی۔ موریوں میں تعفن اور غلاظت تھی لیکن پھر بھی دلی والے ان موریوں پر کھٹیاں ڈالے سو رہے تھے۔

”مرزا خلیق سنتے ہو؟“ دروازے کی آہنی کنڈی دھڑ سے گرا کر کواڑوں کو دھکیلتا ادھیڑ عمر کا خواجہ جلال صحن میں داخل ہوا تھا اور سامنے صحن میں پڑی کھری چارپائی پر دراز مرزا خلیق نے مچیا کر آنکھیں کھول دی تھیں۔

”سنا ہے دلی پر حملہ ہونے والا ہے۔“ خواجہ جلال نے ململ کے کرتے کے بٹن کھولتے ہوئے اطلاع دی اور چاندی کی موٹھ والی لاٹھی چارپائی کے پائے کے ساتھ لگا کر کھڑی کر دی۔ ”کابل کا حاکم ظہیرالدین بابر ہندوستان پر حکمرانی کا خواب دیکھ رہا ہے۔“

”کوئی بھی حکمراں ہو، ہمیں اس سے کیا؟“ مرزا خلیق نے بے چینی سے کروٹ بدلتے ہوئے بیزاری سے جواب دیا۔ ”ابراہیم لودھی نے ہمارے لئے کون سے حلوے مانڈے کی پراتیں لگوا دی ہیں جو ہم اس کی حکومت ختم ہونے پر ماتم کریں۔“ اس نے ٹٹول کر تکیے کے نیچے سے کھجور کی پتیوں سے بنا پنکھا نکالا۔ پنکھے کے چاروں طرف چھینٹ کی گوٹ لگی تھی۔ پھر وہ بند آنکھوں کے ساتھ پنکھا جھلنے میں مصروف ہو گیا۔

”ایک تو اتنی رات کو آتے ہو، اوپر سے فضول خبریں سنا کر نیند اچاٹ کرتے ہو۔ بندۂ خدا، آخر تم کب سدھرو گے؟“ مرزا خلیق نے اپنے برادرِ نسبتی کو نیم وا آنکھوں سے دیکھتے ہوئے شکوے بھرے لہجے میں سوال کیا۔

”تم نے وہ نہیں سنا، جیسا راجہ ویسی پرجہ۔“ خواجہ جلال کرچ کے پمپ پیروں سے اتار کر کھڑاویں پہنتا ہوا مسکرا کر بولا۔ ”جانتے ہو نا، تمام رات ابراہیم لودھی گانا سنتا ہے، ناچ ملاحظہ کرتا ہے، شراب و کباب سے لطف اندوز ہوتا ہے، اسے نہ ملک کی پروا ہے نہ رعیت کی، اپنی رنگ رلیوں میں گم رہتا ہے...... اپنا بھی ایسا ہی کچھ حال ہے۔“

”خدا تمہیں نیکی دے، اب اپنے چوبارے میں جا کر پڑ رہو۔ تمہاری باجی کی آنکھ کھل گئی تو مزید ہنگامہ ہوگا۔“ مرزا خلیق بڑبڑاتا ہوا کروٹ لے کر پھر سے نیند کی آغوش میں چلا گیا۔

سلگتی رات، گرم دہکتے دن میں داخل ہوئی تو پورے شہر دلی میں ایک عام شہری خواجہ جلال کی دی گئی خبر گرم تھی کہ ظہیرالدین بابر ایک بار پھر دلی پر حملہ کرنے کے لئے پر تول رہا ہے۔ یہ خبر ابراہیم لودھی کے محل کی غلام گردشوں میں بھی گردش کر رہی تھی۔

بابر نے کابل لوٹتے وقت بہت سے محافظین سپاہ کے ساتھ لاہور میر عبدالعزیز کے سپرد کیا تھا جبکہ سیالکوٹ خسرو کوکش کی سپردگی میں دیا گیا تھا۔ مگر بابر کے جاتے ہی دولت خان اپنی اصلیت دکھانے پر اتر آیا تھا۔ اس نے ایک مضبوط فوج جمع کر کے اپنے بیٹے دلاور خان کو گرفتار کر کے اس سے سلطان پور چھین لیا۔ پھر اس نے عالم خان کو نکال باہر کر کے دیپال پور پر بھی اپنا تسلط جما لیا تھا۔ لیکن سیالکوٹ کو حاصل کرنے کے لئے اسے پہلی بار رکاوٹ کا سامنا کرنا پڑا تھا۔ پانچ ہزار سپاہیوں پر مشتمل ایک دستہ جسے اس نے شہر پر حملہ کرنے کے لئے بھیجا تھا، اسے بابر کی لاہور کی محافظ فوج نے مار بھگایا تھا۔

لیکن کچھ ہی عرصے بعد اس نے ایک بڑی کامیابی حاصل کر لی تھی۔ ابراہیم لودھی نے اسے اطاعت پر مجبور کرنے کے لئے اپنی فوج بھیجی۔ دولت خان اس فوج کو منتشر کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ کچھ سپاہی تو اس کے ساتھ شامل ہو گئے اور کچھ بغیر لڑے ہی میدان چھوڑ گئے تھے۔

اس دوران عالم خان بھاگ کر کابل پہنچ گیا اور اس نے اپنی بدقسمتی کا حال بابر کو جا سنایا۔

”مجھے دولت خان کی نیت کا پہلے ہی اندازہ تھا۔“ ساری بات سن کر بابر نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ”اسی لئے میں نے اسے لاہور دینے کی بجائے دوسرے اضلاع دیئے تھے جبکہ اس کی رال لاہور پر ٹپک رہی تھی۔“

”بادشاہ سلامت! اب کیا ہوگا؟“ عالم خان بے حد افسردہ اور خوفزدہ تھا۔

بابر نے اپنے مشیروں سے مشورے کے بعد اس کے ساتھ ایک معاہدہ کیا جس میں اس شرط پر اسے دہلی کے تخت پر بٹھانا منظور کیا کہ لاہور اور اس کے مغرب کے علاقے پر بابر کا مکمل اقتدار تسلیم کیا جائے گا۔

پنجاب کے سپہ سالاروں کے نام بابر کے احکام لے کر عالم خان ایک بار پھر رخت ہندوستان ہوا۔ اس وقت بابر بذات خود ہندوستان نہیں جا سکتا تھا کیونکہ اسے بلخ جانا تھا جس کا محاصرہ ازبکوں نے کر رکھا تھا۔

عالم خان ہندوستان پہنچتے ہی بابر کے ساتھ کئے گئے سب وعدے، معاہدے بھلا کر ایک بار پھر دولت خان سے جا ملا۔ دولت خان نے جھوٹی ہمدردی اور وفاداری دکھا کر اسے گمراہ کر دیا۔ بابر کے سرداروں کے احتجاج کو نظرانداز کرتے ہوئے اس نے پنجاب دولت خان کے حوالے کر دیا۔ اس کے بعد وہ اپنے اس نئے اتحادی دولت خان کے ساتھ مل کر دہلی کی جانب بڑھا۔

دہلی سے باہر وسیع و عریض میدان میں ابراہیم اپنے لشکر کے ساتھ پڑاؤ انداز تھا۔ بابر کے حملے اور عالم خان و دولت خان کے باہمی اشتراک و اتحاد کی خبریں ملتے ہی ابراہیم خان اپنا لشکر لے کر دلی سے نکل کھڑا ہوا تھا۔

موسم گرما اپنی تمام تر شدتوں کے ساتھ ہندوستان میں جلوہ خیز تھا۔ دن بھر سورج آگ برساتا۔ گرم لپٹیں اٹھتیں۔ فضا سلگتی اور زمین دہکتی محسوس ہوتی۔ رات گو کہ سورج ٹھنڈا پڑ جاتا مگر ماحول جوں کا توں گرم ہی رہتا۔

دن بھر اپنے اندر جذب کی گئی تپش رات کو زمین اس انداز سے اگلتی کہ ہر سو آگ بھڑکتی محسوس ہوتی۔ ہواؤں میں ایسی حدت ہوتی کہ لوگ کھری چارپائی پر کروٹیں بدلتے نظر آتے۔

ایسے دہکتے، سلگتے موسم میں ابراہیم لودھی اپنی سپاہ لئے تیموری میدان میں خیمہ زن تھا۔ عالم خان اور دولت خان کی اتحادی فوج نے رات کی تاریکی سے فائدہ اٹھاتے ہوئے ابراہیم کے پڑاؤ پر شب خون مارا اور اس کے بیشتر دستوں کو منتشر کر دیا اور پھر مال غنیمت کی تلاش میں بکھر گئے۔

سلطان دہلی اپنے خیمے میں ہی رہا۔ اسے پل پل کی خبر مل رہی تھی مگر اس نے رات کے اس پل کسی بھی کارروائی سے گریز کیا۔ مگر جیسے ہی دن نکلا، وہ اپنے دستوں کو ساتھ لے کر نکلا اور مال غنیمت لوٹتے اتحادیوں کے دستوں پر ٹوٹ پڑا۔

اگرچہ عالم خان کی فوج تعداد میں زیادہ تھی اور شب کی کامیابی کا نشہ بھی حوصلہ افزا تھا۔ اس کے باوجود وہ سلطان ابراہیم کے سپاہیوں کا مقابلہ نہ کر سکے، خوف و ہراس میں مبتلا ہو کر راہِ فرار اختیار کرنے پر مجبور ہو گئے۔

خود عالم خان نہایت خوف و دہشت کے عالم میں بصد مشکل اپنی جان بچا کر بھاگنے میں کامیاب ہوا۔

☆......☆......☆

ازبکوں کو بلخ سے نکال کر بابر اب ایک بار پھر ہندوستان کے معاملات پر توجہ دینے کے قابل ہوا تھا۔

”بظاہر یہ وقت کچھ سازگار دکھائی نہیں دیتا۔“ قاسم بیگ نے پُرسوچ لہجے میں کہا۔ ”بہترین ہونے کے باوجود اس وقت ہمارا لشکر بہت زیادہ زبردست نہیں ہے۔“

”تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔“ بابر نے تائید بھرے انداز میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ”اس کے باوجود ہم نے فیصلہ کیا ہے کہ ہمیں ہندوستان پر حملہ کرنے کے لئے روانہ ہونا ہوگا۔“

بھلا بابر کے فیصلے کے بعد کسی اور میں دم مارنے کی کہاں مجال تھی۔ سب ہی نے سرِتسلیم خم کر دیا۔

گزشتہ واقعات کی خبروں نے بابر کو اپنے منصوبوں پر نظرثانی کرنے پر مجبور کر دیا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ دہلی کی مرکزی طاقت سے مصالحت کے بغیر پنجاب کی تسخیر کا ابتدائی منصوبہ ناقابل عمل ہوگا۔ اسی لئے وہ سلطان ابراہیم کو تخت سے اتار کر اس کی جگہ عالم خان کو تخت نشین کرنے کے لئے آمادہ ہو گیا تھا۔

اس طرح وہ ایک پنتھ دو کاج کے مصداق، ایک طرف اس کی مدد سے وہ پنجاب حاصل کر لیتا، دوسرے اس بوڑھے اور قدرے کمزور سلطان (عالم خان) پر وہ پوری طرح اپنی گرفت رکھ سکتا تھا۔

لیکن دولت خان کی ریشہ دوانیاں اور عالم خان کی عہد شکنی نے پوری صورت حال ہی تبدیل کر کے رکھ دی تھی۔ اب بابر خود اپنے واسطے سامنے والے حریف سے برسرِپیکار ہونے جا رہا تھا۔ اسے یقین تھا کہ پنجاب پر مستقل تسلط ہندوستان کی تسخیر کا پیش خیمہ ثابت ہوگا۔

بابر نے شہزادے ہمایوں کو حکم دیا کہ اپنے دستوں کے ساتھ وہ فوری طور پر لشکر شاہی میں شامل ہو جائے۔ ہمایوں ان دنوں مغربی پہاڑیوں کے اس پار قراض کی چھاؤنی پر موجود تھا۔

اسے بابر تک پہنچنے میں پندرہ دن لگ گئے۔ یہ انتظار بابر کے لئے سوہانِ روح تھا۔ وہ گھڑی کی چوتھائی میں ہندوستان پہنچ جانا چاہتا تھا۔ وہاں کی فضائیں اسے آوازیں دیتیں اور بلاتی محسوس ہوتی تھیں۔

انتظار کے ان لمحوں میں وہ دن رات شراب نوشی کرتا۔

”آقا! اس قدر شراب نوشی صحت کے لئے نقصان دہ ثابت ہو سکتی ہے۔“ اس شام اس کی شاہ بیگم یعنی معصومہ خاتون اس کی خدمت میں حاضر ہوئی تو اسے یوں جام پر جام لنڈھاتے دیکھ کر حیران ہونے کے ساتھ پریشان بھی ہو گئی۔ ”آپ کو ابھی دنیا میں بہت کچھ کرنا ہے، نئی دنیائیں فتح کرنی ہیں، نئی بستیاں بسانی ہیں، نئی تاریخ رقم کرنی ہے۔ آپ نے خود کو اس طرح ساغر و مینا میں ڈبو دیا تو یہ سب بھلا کیونکر کر سکیں گے؟“

”آپ ٹھیک کہتی ہیں بیگم۔“ بابر نے مسکراتی نظروں سے اپنی شریک حیات کی طرف دیکھا۔ ”مگر اس وقت یہ بے تحاشا مے نوشی کی وجہ آپ کے صاحبزادے ہیں۔“ بابر کے محبت بھرے لہجے میں شکایت کی ہلکی سی آمیزش تھی۔ ”ہمایوں کو فوری پہنچنے کا حکم دیا تھا مگر آج کتنے ہی دن بیت گئے، اس کا کوئی پتا نہیں۔“

”آپ کی بے پناہ محبت و شفقت نے بیٹوں کو قدرے بے خوف اور لاپروا کر دیا ہے۔“ شاہ بیگم مسکرائی۔ ”خاص طور پر ہمایوں، وہ بے حد بے نیاز اور لاپروا ہوتا جا رہا ہے۔ محبت کے ساتھ سرزنش کرنے کی بھی ضرورت ہوتی ہے۔“

”آپ ٹھیک کہتی ہیں۔“ بابر نے اپنا ہاتھ ملکہ کے ہاتھ پر رکھا۔

وہ بے ساختہ چونک اٹھی۔ ”آپ کا ہاتھ اس قدر گرم کیوں ہے؟ آپ کو شاید بخار ہے۔“

”نہیں، ایسا کچھ نہیں ہے۔“ بابر نے ٹالنے کی کوشش کی مگر ملکہ نے فوراً ہی طبیب کو طلب کر لیا۔

اسی رات سے بابر کو شدید پیچش کا مرض لاحق ہو گیا تھا۔ طبیب نے اس مرض کی وجہ مے نوشی کو قرار دیا تھا۔ بابر نے اپنی اس عادتِ بد کا اعتراف کیا اور آئندہ زیادہ مے نوشی سے پرہیز کا وعدہ کیا۔

ہمایوں کے آنے تک وہ بالکل صحت یاب ہو گیا تھا۔

ہمایوں کے آتے ہی روانگی ہو گئی۔ بابر اپنی سپاہ لئے پہاڑوں سے اترا اور دریائے کابل کی طرف بڑھا۔ یہاں بابر کو اطلاع ملی کہ دولت خان اپنے منجھلے بیٹے غازی خان اور اپنے ساتھیوں کے ساتھ پنجاب کے دیہات اور قصبوں کو لوٹتے، برباد کرتے لاہور کی طرف بڑھ رہے ہیں۔

”الغ خان۔“ بابر نے خبر لانے والے سردار کو مخاطب کیا۔ ”یہ بے حد ضروری ہے کہ اس نازک موقع پر دولت خان اور غازی خان کو لاہور پر قبضہ کرنے سے روکا جائے۔“

”جی! بالکل بجا فرما رہے ہیں آپ۔“ الغ خان نے جھک کر مؤدبانہ انداز میں کہا۔ ”مگر سوال یہ ہے کہ اس موقع پر ہمیں کیا کرنا چاہئے۔“

”قاسم بیگ کو بھیجو۔“ بابر نے حکم دیا۔

ذرا ہی دیر میں قاسم بیگ آ موجود ہوا۔

”قاسم بیگ۔“ بابر نے اپنے سب سے معتبر ساتھی کو مخاطب کیا۔ ”لاہور میں ہمارے نائبوں کے پاس فوری طور پر ایک ایلچی کے ذریعے اطلاع بھجواؤ کہ ہم نزدیک ہی ہیں، وہ تمام خطرات کو نظرانداز کرتے ہوئے ہمارے پاس چلے آئیں اور کسی حالت اور کسی بھی صورت میں ہمارے پہنچنے سے پہلے دولت خان سے جنگ چھیڑنے کی حماقت نہ کریں۔“

”جو آپ کا حکم بادشاہ سلامت۔“ قاسم بیگ جھک کر کورنش بجا لایا اور نہایت سرعت سے اس کا حکم بجا لانے کے لئے باہر کی طرف چل دیا۔

پیغام بھجوانے کے بعد اس نے اپنی رفتار بڑھا دی۔ دسمبر کا وسط چل رہا تھا۔ آسمان عموماً بادلوں سے ڈھکا رہتا۔ خنک اور روح پرور ہوائیں چلتیں جو لشکریوں کے جوشِ حرب کو ہوا دیتیں۔

دریائے سندھ کو پار کرنے کے بعد بابر نے مناسب سمجھا کہ اپنے سپاہیوں کی تعداد کا درست اندازہ کر لیا جائے۔ اس خطرناک مہم پر جو سپاہ اس کے ساتھ تھی جس سے وہ ہندوستان فتح کرنے کی امید کر رہا تھا، اس کی کل تعداد بارہ ہزار تھی جس میں اچھے برے، چھوٹے بڑے، بہادر اور بزدل سب ہی شامل تھے۔

لیکن خطرے کی پروا کئے بغیر وہ آگے ہی بڑھتا رہا۔ جیسے ہی اس نے جہلم پار کیا، اسے پتا چلا کہ دولت خان نے بابر سے نمٹنے کے لئے اپنی کمر میں دو تلواریں باندھ رکھی ہیں جو اس کے اس عزم کی علامت ہیں کہ فتح پائے گا یا مر جائے گا۔

بابر کے تیز رفتار لشکر کی آمد کی خبر جوں ہی پنجاب اور اس کے قرب و جوار میں پھیلی، دولت خان کی سپاہ کا شیرازہ بکھرنے لگا۔ بابر کی سابقہ کامیابیاں ایک ہیبت کی صورت لوگوں کو یاد تھیں۔

شاہ کابل ظہیرالدین بابر دریائے بیاس پار کر کے میوات کی ناکہ بندی کر رہا تھا کہ دولت خان کا بڑا بیٹا دلاور خان اس سے آ ملا۔ اس نے ایک بار پھر بابر کی خاطر اپنے باپ اور بھائی کا ساتھ چھوڑ دیا تھا۔

دلاور خان سے اسے مقابل فوجوں کی صحیح تعداد و حالت کا علم ہوا۔ وہ بے باکی اور بے خوفی سے آگے بڑھتا رہا اور اس کی اس تیز رفتار پیش قدمی نے دولت خان کی ابتری کو مکمل کر دیا۔ اس کی فوج کے حوصلے ٹوٹ گئے اور وہ ٹکڑوں میں بکھر گئے اور حملہ آوروں کا مقابلہ کرنے کی بجائے جس طرف جس کے سینگ سمائے، بھاگ کھڑے ہوئے۔

اب دولت خان اور اس کے چند قریبی ساتھی نہتے اور تنہا رہ گئے تھے اور ان کے پاس ایک حقیر و ذلیل اطاعت کے علاوہ اور کوئی چارہ نہ تھا۔

بابر کی فوج خیمہ زن ہو چکی تھی۔ خود بابر اپنے شاہی خیمے میں مخملی مسند پر تشریف فرما تھا۔ اس کے ساتھ اٹھارہ سالہ شہزادہ ہمایوں اور اس کا پرانا ساتھی قاسم بیگ بھی موجود تھا۔

تب ہی دولت خان نے بابر کو اطلاع دینے کے لئے ایک پیامبر بھیجا۔

باہر شام گہری ہو رہی تھی۔ خیمے کے اندر شمعیں روشن کر دی گئی تھیں۔ بابر کے سامنے دولت خان کا پیامبر سر جھکائے مؤدب اور قدرے خائف انداز میں کھڑا تھا۔ بابر نے سر کے خفیف اشارے سے پیام کے بارے میں جاننا چاہا تھا۔

”دولت خان نے اطلاع بھجوائی ہے۔“ پیامبر رٹے ہوئے انداز میں بولنے لگا۔ ”کہ غازی خان پہاڑوں کی طرف فرار ہو گیا ہے۔ لیکن اگر شاہ کابل ظہیرالدین بابر خود اس کے قصوروں کو معاف فرما دیں تو وہ ایک غلام کی طرح حاضر ہو جائے گا اور تمام علاقے آپ کی خدمت میں پیش کر دے گا۔“

بابر نے فوری طور پر خواجہ میر میرن کو بھیجا تاکہ وہ دولت خان کے ارادے کو استحکام دے کر ساتھ لے آئے۔ اس نے میر میرن کو خاص طور پر حکم دیا تھا۔ ”میر میرن۔ اس امر کا خیال رکھنا کہ دولت خان کی گستاخی اور بے ادبی کو یاد دلانے کے لئے اس کے گلے میں وہی دونوں تلواریں لٹکا کر لانا جو اس نے مجھ سے مقابلے کے لئے اپنے پہلو میں باندھی تھیں۔“

☆......☆

جب دولت خان، بابر کے سامنے آیا تو اس کا سر جھکا ہوا تھا اور اس کے گلے میں دو تلواریں لٹک رہی تھیں۔

بابر نے اسے مخاطب کر کے کہا۔ ”میں نے تمہاری عمر کا لحاظ کرتے ہوئے باپ کی طرح احترام دیا، میں نے تمہیں اور تمہارے بیٹوں کو ظلم اور بے عزتی سے نجات دلائی، میں نے تمہارے خاندان، تمہاری عورتوں اور تمہارے قبیلے کو ابراہیم لودھی کی غلامی سے چھڑایا، میں نے تمہیں تاتار خان کے مقبوضہ علاقے عطا کئے، میں نے تمہارا کیا بگاڑا تھا کہ تم اس طرح اپنے پہلو میں دو تلواریں لے کر میرے خلاف آئے اور ایک ٹڈی دل کے ذریعے میرے علاقوں میں ہنگامہ و انتشار پھیلایا؟“

دولت خان گم صم ہو گیا۔

بابر کی کسی بات کا اس کے پاس کوئی جواب نہ تھا۔ اس کے باوجود بابر نے اس کی زندگی بخش دی۔ اس نے حکم دیا کہ وہ اور اس کا خاندان اپنے قبیلوں اور اپنے دیہات میں اپنا قبضہ برقرار رکھیں لیکن اس کے علاوہ اس کی ساری جائداد اور املاک ضبط کر لی جائے۔

دولت خان اور اس کے ساتھیوں کو میر میرن کے خیمے کے قریب خیمے ڈالنے کی ہدایت کی گئی۔

اس طرح بابر کی پُرخطر مہم کا پہلا دور پنجاب میں اس کے دشمنوں کی شکست کے ساتھ اختتام پذیر ہوا۔

اب اس کی اگلی منزل دلی تھی۔ ابھی دلی کی شاہی فوجوں کا سر جھکانے کا مشکل کام باقی تھا اور وہ جانتا تھا کہ اس کامیابی کی بہترین امید فوری عمل میں مضمر ہے۔

رکاب عزم و استقلال میں قدم رکھ کر اور عنانِ یقین ہاتھ میں تھام کر وہ سلطان ابراہیم بن سلطان سکندر بن سلطان بہلول لودھی کے خلاف بڑھا جس کے قبضے میں اس وقت ہندوستان کی سلطنت اور دلی کا شہر تھا۔

جیسے جیسے بابر آگے بڑھتا جا رہا تھا، اسے اس امر کے مختلف ہمت افزا ثبوت ملتے جا رہے تھے کہ وہ اپنے حریف کے ملک میں بے یار و مددگار نہیں ہے۔

ابراہیم کے دربار کے دو ارکان آرائش خان اور ملا محمد زہیب نے خطوط کے ذریعے اپنی حمایت و وابستگی کا اظہار کیا تھا اور عالم خان ایک عالم بے نوائی میں بابر کے قدموں میں اپنا سر رکھنے آ موجود ہوا تھا۔ راجپوت سنگرام سنگھ کی طرف سے بھی یہ تجاویز موصول ہوئیں کہ ابراہیم لودھی پر ایک متحدہ حملہ ہونا چاہئے۔

مگر بابر اس موقع پر راجپوتوں سے کوئی اتحاد نہیں کرنا چاہتا تھا کیونکہ وہ جانتا تھا کہ اگر دلی کے شاہی خاندان پر کوئی تباہی نازل ہوئی تو راجپوت ریاستوں کی تنظیم یکایک ایک ایسی فوقیت اور برتری لے کے ابھرے گی جو اس کو پہلے کبھی حاصل نہ ہو سکی تھی۔

دہلی کا حکمران، سلطان ابراہیم لودھی دہلی سے ایک لاکھ سپاہیوں پر مشتمل لشکر جرار لے کے نکلا۔ اس کے دو ہراول دستوں نے یکے بعد دیگرے بابر کی فوج کے دو مختصر دستوں پر حملے کی کوشش کی۔ ان میں ایک حمید خان کے تحت اور دوسرا دستہ داؤد خان کے تحت تھا۔

سہ پہر کے وقت حمید خان اپنا دستہ لئے آگے بڑھا۔ اس کے مقابل شہزادے ہمایوں کا دستہ تھا۔ ہمایوں نے کمال بہادری سے حمید خان اور اس کے دستے کو مار بھگایا اور 100 قیدی اور 10 ہاتھی ہاتھ آئے۔

دوسرے دستے کو بھی اسی طرح ہزیمت اٹھانی پڑی۔ اس کو ابراہیم کے پڑاؤ کی دیوار تک دھکیل دیا گیا کیونکہ اس وقت تک بابر جمنا کے کنارے تک پہنچ چکا تھا۔

سلطان ابراہیم کی فوجیں دہلی جانے والی سڑک پر اہم شہر پانی پت کے ٹھیک جنوب میں پڑاؤ انداز تھیں۔

شمال کی جانب ایک وسیع و عریض میدان تھا۔ درختوں سے خالی اور سوار فوج کی نقل و حرکت کے لئے بہت موزوں۔ بابر نے پانی پت کے میدان کو اپنی فوج کے لئے منتخب کیا تھا۔ اپنے کمزور محاذ کو مضبوط کرنے کے لئے بابر نے باربردار گاڑیوں کی ایک قطار کو کام میں لانے کا فیصلہ کیا۔ نواحی علاقوں میں تلاش بسیار کے بعد اور خود اپنے سامان کی گاڑیوں کو استعمال میں لا کر وہ تقریباً سات سو گاڑیاں جمع کرنے میں کامیاب ہو گیا تھا۔ ان گاڑیوں کو کچے چمڑے کے رسوں کے ذریعے ایک دوسرے سے باندھ دیا گیا۔

بندوقچیوں اور توپچیوں کی خصوصی حفاظت کے لئے آڑ جو ایک آدمی کی حفاظت کے لئے کافی ہوں، خاصی تعداد میں بنائی گئیں اور ہر دو گاڑیوں کے درمیان چھ سات کی تعداد میں محاذ کے سامنے لگا دی گئیں جہاں استاد علی اور مصطفیٰ، ماہرین توپ خانہ کو جگہ لینا تھی۔

جب یہ تیاریاں مکمل ہو چکیں تو بابر دو منزلوں تک اور آگے بڑھا اور ایسی جگہ مورچہ لگایا جہاں پانی پت کا شہر اس کے فوج کے میمنہ کی حفاظت کر رہا تھا۔ میسرہ کی طرف اپنا مورچہ مضبوط کرنے کے لئے اس نے ایک خندق کھدوائی اور کٹے ہوئے درختوں سے اس طرح آڑ بنوائی کہ دشمن کے لئے اس کی صف کو بائیں طرف سے عبور کرنا ممکن نہ ہو۔

دونوں بازوؤں کے محفوظ ہو جانے کے بعد اب اس نے اپنے قلب کو تیار شدہ آڑ سے مستحکم کیا۔ بابر کا یہ مورچہ بے حد مستحکم تھا اور اتنا زبردست کہ کچھ جنگجو خوش ہوئے یہ سوچ کر کہ اب سلطان ابراہیم ان کے سامنے بڑھنے کی جرأت نہ کرے گا۔

لیکن بابر جانتا تھا کہ سلطان ابراہیم جوان، ناتجربہ کار اور عاقبت نااندیش ہے۔ وہ کسی واضح لائحہ عمل اور تیاری کے بغیر ہی اس مہم پر نکل کھڑا ہوا تھا اور یہ بابر کے لئے اچھا تھا کیونکہ اس کے دشمن کے پاس بہادری کے علاوہ ایک سپہ سالار کے سارے ہی اوصاف مفقود تھے جبکہ فوج کی تعداد بہت زیادہ تھی۔ تقریباً ایک لاکھ سے زیادہ لشکری موجود تھے جبکہ بابر کے پاس آٹھ ہزار سے بھی کم لڑنے والے سپاہی تھے۔

سلطان ابراہیم کے پاس ایک ہزار تنومند ہاتھی بھی تھے جن سے ان کو جنگ میں بلاشبہ بڑا فائدہ حاصل ہونے کی امید تھی مگر ان کی امیدیں بر نہ آ سکیں کیونکہ بابر کے چنگھاڑتے توپ خانے نے ہاتھیوں کی چنگھاڑ ہی نہیں، سٹی بھی گم کر دی تھی، اس لئے اس جنگ میں ابراہیم کے یہ ہاتھی قطعاً کارآمد ثابت ہو سکے تھے۔

آٹھ دنوں تک دونوں فوجیں آمنے سامنے موجود رہیں۔ ابراہیم کی طرف سے حملے کے کوئی آثار نمودار نہ ہوئے۔

بابر کی بے چینی میں اضافہ ہو رہا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ حد سے زیادہ تاخیر اس کی پوری مہم کو ہی خطرے میں ڈال سکتی ہے۔ چنانچہ اس معاملے پر غور کرنے کے لئے جنگی شوریٰ بلائی گئی اور مشاورت کے بعد بابر نے ہمہ گیر جنگ چھیڑنے کا فیصلہ کر لیا۔

اسی رات ایک بڑے حملے کا منصوبہ تیار کیا گیا۔ پانچ ہزار آدمی جن میں زیادہ تر کمکی اور بے قاعدہ فوجی دستے تھے، مہدی خواجہ محمد سلطان مرزا اور جنید برلاس جیسے آزمودہ سرداروں کی ماتحتی میں ابراہیم کے لشکر کے خلاف میدان میں اتارے گئے۔

اس دوران بابر اور ہمایوں باقی ماندہ سپاہ کے ساتھ ہتھیار سنبھالے کھڑے رہے کہ اگر حملہ کامیاب ہو تو فتح کے لئے مزید زور لگایا جائے اور اگر ناکامی ہو تو حملہ کرنے والوں کی پسپائی میں ایک آڑ کا کام کریں۔

آخری تاریخوں کا چاند سرِشام ہی غائب ہو چکا تھا۔ آسمان صاف تھا۔ کہیں کہیں ایک آدھ تارا ٹمٹماتا دکھائی دے جاتا تھا۔ یعنی رات اپنی پوری ظلمت اور وحشت کے ساتھ قدم رنجا تھی۔

بابر کی طرف سے حملے کے لئے بھیجے گئے سپاہی لاپروائی یا تاریکی کی وجہ سے راستہ بھول گئے۔ سرداروں کی نقل و حرکت میں ہم آہنگی کی کمی کے باعث وہ شب بھر نامک ٹوئیاں مارتے رہے۔

صبح کا اجالا بکھرا تو مہم پر بھیجے گئے سپاہیوں نے کوئی کارروائی عمل میں لائے بغیر ہی اپنے آپ کو بہت ہی خطرناک حالت میں دشمن کے پڑاؤ کے نزدیک پایا۔

ادھر یہ اس صورت حال سے حیران و ہراساں تھے، تو دوسری طرف سلطان ابراہیم مغل فوج کو اپنے اتنے نزدیک پا کر یہ سوچ کر سراسیمہ ہو گیا کہ شاید یہ فوج حملہ آور ہونے کے لئے آئی ہے، چنانچہ وہ تیزی سے اپنے مستقر پر پلٹا اور اپنی فوج کی صف بندی شروع کر دی۔ اس افراتفری سے فائدہ اٹھا کر جب ابراہیم کے سپاہی آخری ترتیب و صف آرائی میں مشغول تھے، بابر کے آدمی نازک صورت حال سے بچ کر بھاگے اور آخرکار بابر کے پاس آ کر دم لیا۔

ان کی واپسی بابر کے لئے باعثِ مسرت و اطمینان تھی کیونکہ ایک بھی شکست اس کے منصوبوں کے لئے تباہ کن ثابت ہو سکتی تھی۔

وہ ہمایوں کے دستوں کو پسپا ہونے والوں کے لئے آڑ کا کام دینے کی غرض سے روانہ کر چکا تھا اور خاص فوج کو اپنی کمان میں لے کر خود آگے بڑھ رہا تھا۔ اسے احساس ہوا کہ اس کے سپاہی بغیر کسی پریشانی کے واپس آ رہے ہیں۔ لشکر اپنے پڑاؤ پر بخیر و عافیت واپس آ گیا اور ہر طرف اطمینان بھری خاموشی چھا گئی۔

اگلی رات یہ افواہ پھیل گئی کہ آج رات سلطان ابراہیم، بابر کے لشکر پر حملہ کرنے والا ہے۔ اس بے بنیاد افواہ سے مغل سپاہیوں کے اعصاب شدید دباؤ کا شکار ہو گئے۔ کچھ دیر کے لئے خاصا انتشار پھیل گیا۔ بالآخر نظم و ضبط بحال کر لیا گیا اور سپاہ نیند میں ڈوب گئی جس کی اسے بہت ضرورت تھی۔

اگلی صبح بابر کے پاس خبر آئی کہ سلطان کے سپاہی طویل غفلت کے بعد پوری طرح بیدار ہو چکے ہیں اور جنگی صف آرائی کے ساتھ آگے بڑھ رہے ہیں۔

بابر کے سپاہی پھرتی سے مسلح ہو کر گھوڑوں پر سوار ہو گئے۔ اس سے قبل کہ دن کے اجالے کے ساتھ ابراہیم کے سپاہی کچھ فاصلے پر دکھائی دیتے، بابر کے آدمی اپنا مورچہ سنبھال چکے تھے۔

بابر نے اپنے لشکر کو روایتی انداز سے آراستہ کیا تھا۔ میمنہ، قلب، میسرہ اور ہراول...... لشکر کی اسی ترتیب پر بڑی حد تک فوج کی کامیابی کا دار و مدار تھا۔ بڑے بڑے سردار اس ترتیب سے تعینات کئے گئے تھے۔ صف کے آخر میں قاسم بیگ اور ملک کشف، منگلوں کے ایک دستے کی قیادت کر رہے تھے۔ اس کے بعد اصل میمنہ تھا جس کی قیادت ہمایوں کے سپرد تھی۔ اس کی مدد کے لئے وفادار سرداروں کی ایک جماعت تھی۔ ہراول کی قیادت خسرو اور محمد علی جنگ کے سپرد تھی۔ پورے محاذ کے اگلے حصے میں گاڑیوں کی آڑ میں توپ خانہ اور بندوقچی رکھے گئے تھے۔

استاد علی بھاری توپوں کے ساتھ قلب کے دائیں جانب متعین تھا اور مصطفیٰ جس کی نگرانی میں دوسری ہلکی توپیں تھیں، محاذ کے بائیں حصے میں تھیں۔

بابر خود اپنی فوج کے قلب کے نزدیک ایسی جگہ موجود تھا جہاں سے وہ لڑائی کا پورا جائزہ لے سکے اور واقعات کے تقاضوں کے مطابق نقشۂ جنگ میں مناسب تغیر و تبدل کر سکے۔ اس نے اگلے دستوں کو حکم دے دیا تھا کہ دشمن جیسے ہی آگے بڑھے اور حدِ رسائی میں آئے، وہ اس پر فوراً ضرب لگانے کو تیار رہیں۔

سلطان ابراہیم کی فوج جوں ہی قریب پہنچی، بابر نے بھرپور حملے کا حکم دیا اور ساتھ ہی توپوں اور بندوقوں نے قلب سے غضبناک آگ برسانا شروع کر دی۔ اب بابر نے قلب کے دستے کو حکم دیا کہ دشمن کے سامنے کی صفوں پر حملہ کریں۔

ابراہیم کے سپاہی سب طرف سے نرغے میں آ گئے تھے۔ ان کے اختیار میں کچھ نہ تھا۔ ہتھیاروں کے استعمال کے لئے ان کے سپاہیوں کے پاس جگہ ہی نہ تھی اور ان کے حملے بے اثر تھے۔ بابر کا توپ خانہ دشمن کی صفوں اور غولِ بے ہنگام پر موت کی بارش کر رہا تھا اور بدقسمت ابراہیم کے سپاہی بابر کی فوج کے تیروں اور تلواروں سے ہزاروں کی تعداد میں ڈھیر ہو رہے تھے۔ کچھ گھنٹوں تک یہ قتل عام جاری رہا۔ معرکہ صبح شروع ہوا تھا اور دوپہر تک ابراہیم لودھی ہزیمت اٹھا چکا تھا۔

اس کے سپاہی جو بھاگ سکتے تھے، جان بچا کر بھاگ رہے تھے۔ باقی تیروں، بندوقوں اور توپوں کی زد میں آ کر موت کے گھاٹ اتر چکے تھے۔ سلطان ابراہیم کا لشکر عظیم بری طرح تباہ ہو چکا تھا۔ میدان جنگ لاشوں سے پٹا ہوا تھا۔ سلطان ابراہیم بھی مارا جا چکا تھا۔ اس کی لاش کے گرد پانچ چھ ہزار شجاع ترین سپاہی مردہ پڑے ہوئے تھے۔ کل جانی نقصان تقریباً بیس ہزار تھا۔

اس طرح بابر کی مختصر فوج نے اپنی تعداد سے تین گنا فوج کو موت کے گھاٹ اتار دیا تھا۔ یہ ایک شاندار ثبوت تھا، اس سپہ سالار کی ہنرمندی کا جس نے فوج اور توپ خانے کے باقاعدہ اتحادِ عمل کو یقینی بنا کر ہلاکت آفرینی کو یقینی بنا دیا تھا۔

پانی پت کی یہ جنگ فیصلہ کن ثابت ہوئی تھی۔

لودھی خاندان کا سلسلہ حکومت ختم ہو گیا اور ان کا اقتدار مغلوں کے ہاتھوں میں چلا گیا۔ مگر بابر اس فتح پر تکیہ کر کے نہیں بیٹھ گیا۔ اس نے شہزادہ ہمایوں اور خواجہ کلاں کی ماتحتی میں ایک فوج آگرہ پر قبضہ کرنے کے لئے روانہ کی جو سابق سلطان کی آماجگاہ تھی اور بقیہ فوج کو لے کر خود منزلوں کی مسافت طے کرتا دہلی کے مقابل جمنا کنارے جا پہنچا۔

پھر اپنے فطری جوشِ عقیدت کے ساتھ وہ سلاطین دہلی اور مشہور فاتحین کے مزاروں پر گیا۔ پھر شہر میں ایک عارضی حکومت قائم کر کے خزانوں اور قلعے پر تسلط قائم کیا اور دوست محمد کو دیوان بنا کر خود آگرہ کی طرف روانہ ہو گیا۔

ہمایوں آگرہ پر اپنا تسلط جما چکا تھا۔ بابر کی آمد کی خبر سن کر اس نے اپنے فاتح باپ کا بہت محبت آمیز انداز میں استقبال کیا اور تحفے کے طور پر وہ مشہور ہیرا جو کوہ نور کے نام سے جانا جاتا تھا، بابر کی خدمت میں پیش کیا۔ یہ ہیرا گوالیار کے راجہ کے رشتے داروں نے آگرہ کی فتح کے موقع پر اپنے ساتھ کئے گئے باعزت سلوک کے بدلے، اظہارِ ممنونیت کے طور پر پیش کیا تھا۔

(جاری ہے)

allurdupdfnovels.blogspot.com www.freepdfpost.blogspot.com

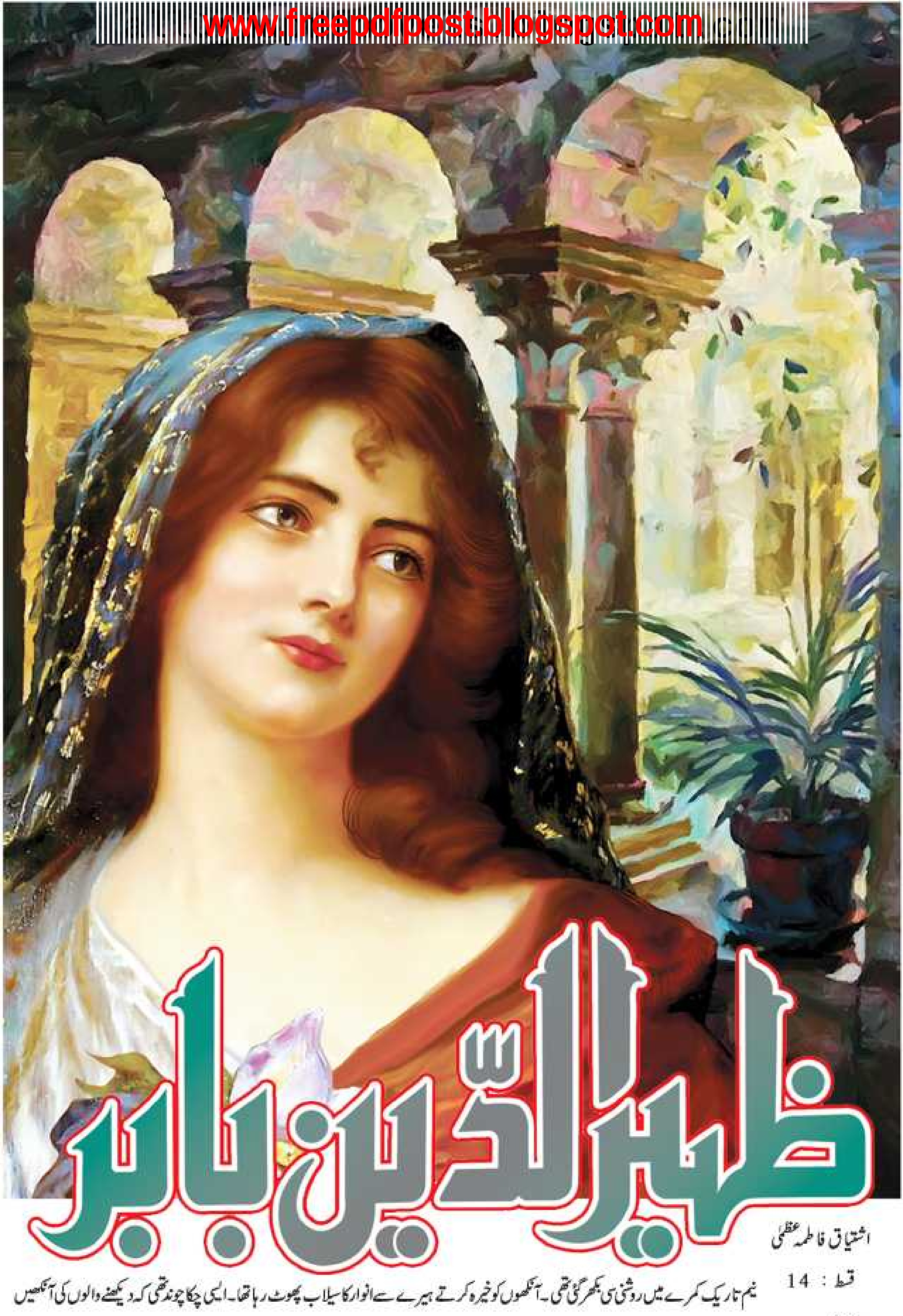

ظہیرالدّین بابر

اشتیاق فاطمہ عظمیٰ

قسط : 14

نیم تاریک کمرے میں روشنی سی بکھر گئی تھی۔ آنکھوں کو خیرہ کرتے ہیرے سے انوار کا سیلاب پھوٹ رہا تھا۔ ایسی چکاچوند تھی کہ دیکھنے والوں کی آنکھیں چندھیا گئی تھیں۔

''سبحان اللہ۔'' بابر نے کوہ نور کو تحسین آمیز نظروں سے دیکھا۔ کئی لمحوں تک وہ اس عجوبۂ روزگار ہیرے کو تکتا رہا۔ پھر اپنی فطری فیاضی سے کام لے کر اس نے وہ ہیرا فوراً ہمایوں کو واپس دے دیا۔

''میرے نورِ نظر، یہ کوہ نور تمہیں مبارک ہو، از راہ محبت وعقیدت تم مجھے جو یہ بیش بہا سوغات دے رہے ہو، میں اسے لوٹا رہا ہوں، میری طرف سے یہ نایاب و نادر تحفہ قبول کرلو۔''

''شکریہ والد محترم۔'' ہمایوں نے جھک کر باپ کے ہاتھ کا بوسہ لیا تھا۔

اور بابر کے حسین چہرے پر پدرانہ شفقت بھری مسکراہٹ بکھر گئی تھی۔

سنگرام سنگھ جیسے لوگ توقع کر رہے تھے کہ بابر سلطان لودھی کے خاندان کی طاقت چور کرنے کے بعد میدان راجپوتوں کے لئے خالی چھوڑ کر اپنے وطن لوٹ جائے گا جبکہ شاہ کابل کے اپنے لوگ بھی شاہ کی سوچ سے ناواقف تھے۔

''بادشاہ سلامت۔ جبکہ خداوند کریم نے ہمیں فتح عظیم عطا کردی ہے تو اب آپ کا کیا ارادہ ہے؟'' قاسم بیگ نے جھک کر مؤدبانہ پوچھا۔

''قاسم بیگ، اگر تم اس ملک اور اس کے باشندوں کے بارے میں میری رائے جاننا چاہتے ہو تو سنو۔'' بابر نے مخملی گاؤ تکیے سے کمر ٹکاتے ہوئے اطمینان بھرے لہجے میں کہنا شروع کیا۔ ''اگرچہ ہندوستان فطرت کی دلکشی و رعنائی سے معمور ہے لیکن اس کے باشندے دلکشی و رعنائی سے محروم ہیں اور ان کے رویے میں دوستانہ ارتباط ہے، محبت ہے نہ وفاکشی و استواری...... ان کو کوئی فطری کمال، کوئی فہم و فراست، کوئی حسن اخلاق، کوئی جذبۂ فیض رسانی اور کوئی صحت احساس حاصل نہیں۔ صنعت و حرفت میں ان کے طریقوں کی طرح ان کے تصورات میں بھی فنکاری کا اصول و نظریے کا فقدان ہے۔ یہاں نہ حمام ہیں، نہ موم بتیاں، نہ مشعلیں...... یہاں تک کہ شمع دان بھی نہیں۔''

''میں بادشاہ سلامت کی نظر کی باریک بینی کو داد دیتا ہوں۔'' قاسم بیگ نے قدرے متعجب اور تحسین بھرے لہجے میں کہا۔ ''مجھے یہاں کے لوگوں کی اس قدر خامیوں کا اندازہ نہیں تھا، میں اعتراف کرتا ہوں۔''

''نہیں، سب کچھ خامیوں سے پُر نہیں ہے۔'' بابر فراخدلانہ انداز میں مسکرایا۔ ''عیوب کی تلافی کرنے والے کچھ اوصاف بھی موجود ہیں۔''

بابر کے خاموش ہوتے ہی قاسم بیگ نے سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔

''علاقوں کی زبردست وسعت کے علاوہ ہندوستان کی ایک بڑی توصیف وہ ٹکسالی اور غیر ٹکسالی سونا ہے جو وافر مقدار میں یہاں موجود ہے۔ پھر برسات کے زمانے میں یہاں موسم بہت خوشگوار ہوتا ہے۔ ہندوستان کی دوسری بڑی خوبی یہ ہے کہ تمام صنعتوں اور پیشوں کے لاتعداد کاریگر موجود ہیں۔ اس میں کوئی حیرت کی بات نہیں کہ یہاں صنعتیں خاندان کا پیشہ ہوتی ہیں اور باپ سے بیٹے کو ورثے میں ملتی ہیں۔''

کچھ ہی دنوں میں بابر کا مشاہدہ اور مطالعہ حیرت انگیز تھا۔

بابر کے قبضے میں ہندوستان کے سونے کے ذخائر کا ایک بڑا حصہ آچکا تھا۔ اس نے اس سونے کو نہایت فیاضی سے بے دریغ خرچ کرنا شروع کردیا تھا۔

اس نے اپنے بیٹوں، رشتے داروں، خاص ساتھیوں اور عام سپاہیوں پر انعام و اکرام کی بارش کردی تھی اور کابل کے ہر ذی روح کو ایک چاندی کا سکہ دیا تھا۔

شدید تشویش اور بے یقینی کے اس دور میں مال غنیمت کی یہ تقسیم ایک خوشگوار وقفہ ثابت ہوا تھا۔ جب تک فتح یابی کی ابتدائی منزلیں طے نہ کرلی گئیں، بابر کو اس عظیم کامیابی کا اندازہ ہی نہیں ہوا تھا۔

ادھر بابر انعام و اکرام کی تقسیم میں منہمک تھا، ادھر ہر جگہ افغان قبائل کے رہنماؤں نے خود مختار سرداروں کی حیثیت سے قلعوں پر قبضے کرلئے تھے۔ قاسم سنبھلی نے سنبھل، نظام خان نے بیانہ، حسن خان میواتی نے میوات، تاتار خان نے گوالیار، حسن خان لوہانی نے راپری، قطب خان نے اٹاوہ اور عالم خان نے کالپی میں اپنے پاؤں جمالئے تھے۔

قنوج اور گنگا پار کا تمام علاقہ کلی طور پر ناصر خان لوہانی کے قبضے میں تھا۔ نواح کے افغانوں نے ایک افغان سلطان محمد کو بادشاہ بنادیا تھا۔ فوج کے لئے فراہمی رسد میں انتہائی دقت پیش آرہی تھی۔ گاؤں والوں نے لوٹ مار کا راستہ اختیار کرلیا تھا۔ سڑکیں خطرناک تھیں۔ غذا، چارہ حاصل کرنا ناممکن تھا۔

موسم گرما نزدیک تھا۔ بابر کے جنگی سرداروں کی ہمت نے جواب دینا شروع کردیا تھا اور وہ اب ''کابل واپس چلو'' کی رٹ لگانے پر مجبور ہوگئے تھے۔

اس دشوار صورت حال میں بابر نے حسب معمول اپنی تمام تر ہمت و استقلال کا مظاہرہ کیا۔ اس نے اپنے امراء اور سرداروں کی ایک مشاورتی مجلس طلب کی۔ گو کہ موسم گرما کا ابھی آغاز نہیں ہوا تھا مگر سورج کی تپش میں اضافہ ہوگیا تھا۔ دوپہریں خاصی گرم اور حدت سے پُر ہونے لگی تھیں۔ ایسے میں کابلی سردار منہ لپیٹے اپنے ٹھکانوں پر پڑے رہتے اور آپس میں واپس کابل لوٹ جانے کی باتیں کیا کرتے۔

اس دوپہر، دوپہر کے ڈھلتے ہی بابر نے مشاورتی مجلس طلب کرلی تھی۔ اونچی چھت، محرابی دروں اور کشادہ دریچوں والا ایوان خاصا ٹھنڈا اور پُرسکون تھا۔ فرش پر بچھے خوش رنگ قالین اور دریچوں پر لہراتے حریری پردے مزید تسکین کا باعث تھے۔

بابر اپنی شاہی کرسی پر براجمان تھا جبکہ سردار و امراء سامنے دورویہ مؤدب و مستعد کھڑے تھے۔ ان کے چہروں سے پریشانی ہویدا تھی۔ وہ یہاں کے حالات اور موسم کی بدلتی صورت حال سے خاصے متفکر تھے۔

بابر نے گہری نظروں سے ان سب کے چہروں کا جائزہ لیتے ہوئے کہا۔ ''سلطنت و فتح و نصرت کا وجود، سامان و وسائل کے بغیر باقی نہیں رہ سکتا۔ برسوں کی مشقت اور انتہائی صعوبت اٹھانے کے بعد بہت دشوار مسافتیں طے کرکے اپنی سپاہ اور خود کو انتہائی خطرناک حالات میں جنگ و جدل سے گزر کر فضل الٰہی سے ہم نے اپنے زبردست دشمن کو پسپا کر ڈالا اور متعدد صوبوں پر فتح حاصل کرلی ہے، تو پھر کون سی قوت ہمیں مجبور کررہی ہے، کون سی صعوبت ہمیں ستارہی ہے کہ کسی ظاہری سبب کے بغیر ہم اپنی فتوحات کو چھوڑ کر فرار ہوجائیں اور مایوسی و ناکامی کی علامت لئے کابل لوٹ جائیں۔''

بابر اپنی تقریر کے دوران لحظہ بھر کو تھما اور اس نے اپنی بات غور سے سنتے سرداروں اور امراء کی طرف گہری نظروں سے دیکھا۔ ہر چہرے پر کچھ دیر کو اس کی نظر ٹھہری، پھر اس نے ایک گہرا سانس لے کر دوٹوک لہجے میں کہا۔ ''آج کے بعد کوئی شخص جو خود کو میرا دوست کہتا ہے، کبھی ایسی تجویز پیش نہ کرے۔ لیکن اگر تم میں سے کوئی شخص ایسا ہے جو یہاں رہنے پر تیار نہیں تو اسے اجازت ہے کہ وہ یہاں سے چلا جائے۔''

ایک لمحے کو وہ پھر خاموش ہوگیا۔ پھر پہلے سے زیادہ بھاری اور مضبوط آواز میں گویا ہوا۔ ''لیکن جہاں تک میرا اور میرے وفاداروں کا تعلق ہے تو ہم نے یہاں سے کبھی نہ جانے کا فیصلہ کرلیا ہے۔''

بابر کی اس تقریر کا حسب توقع نتیجہ نکلا تھا۔ چند ایک کے علاوہ تمام سرداروں نے اپنے آقا کی فرمانبرداری کا فیصلہ کرلیا تھا۔

جب بابر کے متعلق ہندوستان میں مستقل قیام کا فیصلہ عام ہوا تو بہت سے امیدواروں کی امیدوں کے دیے بجھ کر رہ گئے۔ ان میں سے ایک سنگرام سنگھ بھی تھا۔

وہ تو کب سے آس لگائے بیٹھا تھا کہ بابر لوٹ مار کرکے جونہی واپسی کے لئے رخت سفر باندھے گا، تو وہ خود اس اجڑی بساط پر ہلّہ بول کر اپنی حکومت کے مہرے بٹھادے گا۔ بابر کے اس فیصلے نے نہ صرف اسے مایوس کیا تھا بلکہ چراغ پا بھی کردیا تھا۔

''ہم اس شاہ کابل کو درپردہ اپنا میت سمجھ رہے تھے مگر حقیقت میں وہ ہمارا دشمن نکلا۔ ہم سوچ بیٹھے تھے کہ راجپوتی ریاستی اتحاد و اقتدار قائم کرنے میں کامیاب ہوں گے۔ مگر اب ایسا لگتا ہے کہ اپنا راج پاٹھ جمانے کے لئے ہمیں ہتھیار اٹھانے پڑیں گے۔''

سنگرام عرف رانا سانگا بے حد غصے میں تھا۔ اس نے فوری طور پر تمام راجپوتی حکومتوں کو پیغام بھیجا اور انہیں بابر کے خلاف گٹھ جوڑ بنانے کے لئے راضی کرلیا۔ فوراً راجپوتوں کی طرف سے تیاریاں شروع ہوگئیں۔ وہ بابر سے ایک فیصلہ کن جنگ کے بعد اس سے ہندوستان کی حکومت چھین لینے کے خواب دیکھ رہے تھے۔

ایک طرف یہ ہو رہا تھا۔ دوسری طرف وہ سردار جو صرف اپنے لئے لڑنے کا ارادہ کر رہے تھے مگر جیسے ہی انہیں پتا چلا کہ بابر محض چھاپہ مار نہیں بلکہ صحیح معنی میں ایک فاتح ہے، تو انہوں نے اپنے لئے جنگ و جدل کا ارادہ ترک کردیا اور بابر کی اطاعت قبول کرنی شروع کردی۔

دوآبہ کا سردار شیخ گھوری اپنے تحفظ کی یقین دہانی پاکر بابر کے وفاداروں میں شامل ہوگیا۔ اس کے ساتھ آنے والے دو ہزار سپاہی بابر کے لشکر کا حصہ بن گئے تھے۔ محمود خان لوہانی اور دیگر کئی امراء بھی بابر کے زیر نگین آگئے تھے اور بابر نے انہیں گراں قدر جاگیریں عطا کرکے ان کی وفاداری خرید لی۔

رفتہ رفتہ ہوا کا رخ بابر کے حق میں پلٹتا جارہا تھا۔ تمام اطراف سے لوگ اس کی حمایت میں اُمڈ پڑے اور انجام کار وہ ملک کی باقاعدہ تسخیر کا کام شروع کرنے کے قابل ہوگیا۔

''آپ کیا سوچ رہے ہیں؟'' اس وقت بابر اپنے شاہی خیمے میں مخملی فرش پر کمر پر ہاتھ باندھے ٹہل رہا تھا اور اس کے چہرے پر فکر و سوچ کی گہری پرچھائیاں رقصاں تھیں۔ قاسم بیگ خیمے کے داخلی دروازے میں کھڑا کافی دیر سے بابر کو فکر و اضطراب میں ٹہلتا دیکھ رہا تھا۔ آخر وہ پوچھ ہی بیٹھا۔ ''کیا کوئی فکر و تردد کی بات ہے؟''

''اوہ!'' بابر کو شاید قاسم بیگ کی آمد کی خبر نہ ہوسکی تھی۔ اس کے یوں اچانک مخاطب کرنے پر لحظہ بھر کو چونک کر اس نے قاسم بیگ کی طرف دیکھا۔

''مخل ہونے کے لئے معافی چاہتا ہوں۔'' بابر کے اس طرح چونکنے پر قاسم بیگ نے قدرے شرمندہ ہوکر کہا۔

''نہیں، اس کی ضرورت نہیں۔'' بابر نے ٹہلنے کا سلسلہ موقوف کرتے ہوئے پلٹ کر قاسم بیگ کی طرف مہربان نظروں سے دیکھا، پھر سر کی ہلکی سی جنبش سے اسے اپنے قریب بلا کر دھیمی آواز میں گویا ہوا۔ ''جو علاقے ابھی فتح ہونے سے بچے ہوئے ہیں، انہیں فتح کرنے کے لئے میرے ذہن میں ایک خیال آیا ہے۔''

لحظہ بھر کو تھم کر اس نے مسکراتی نظروں سے قاسم بیگ کی طرف دیکھا پھر قدرے شوخ لہجے میں گویا ہوا۔ ''میں نے سوچا ہے کہ اپنے سرداروں کو حکم دوں کہ وہ بقیہ علاقوں کو اپنے ذاتی دستوں کی مدد سے تسخیر کریں، جو سردار جو علاقہ فتح کرے گا، وہ اسے سونپ دیا جائے گا۔''

''مطلب؟'' قاسم بیگ نے حیران لہجے میں پوچھا۔

''مطلب یہ ہے کہ اس طرح ایک تو ہر سردار پوری تندہی سے جنگ کرے گا کیونکہ وہ یہ جنگ اپنی ذاتی فائدے کے لئے لڑ رہا ہوگا، دوسرے انہیں وہ علاقے بطور جاگیر مل جانے کے بعد انہیں اطمینان و مسرت ہوگی۔''

اور اس طرح بیک وقت اس نے اپنے سرداروں کو بھی مطمئن کردیا اور زیادہ سے زیادہ علاقے پر تسلط بھی قائم کرلیا۔ اس طرح سنبھل ہمایوں کو ملا۔ محمد دولائی نے دھولپور فتح کیا اور مہدی خواجہ کو قنوج کا علاقہ حاصل ہوا۔

یہ چھوٹے چھوٹے دستے اپنے سپہ سالاروں کے زیر اختیار بے حد جوش و جذبے سے لڑے کیونکہ انہیں احساس تھا کہ وہ خود اپنی قسمت بنانے کے لئے لڑ رہے ہیں۔ لیکن یہ حاصل شدہ علاقے بابر کی مملکت میں توسیع کا باعث ثابت ہو رہے تھے۔ ان چھوٹی جنگوں کے دوران بابر نے یہ احتیاط برتی تھی کہ اپنے خاص جنگی لشکر کو غیر ضروری طور پر کمزور نہ ہونے دے۔ اس کے لشکر کا ایک بڑا حصہ اپنی تمام تر توانائیوں کے ساتھ موجود تھا۔

اس وقت بابر کے دو خاص حریف تھے جن سے وہ نمٹنے کا حوصلہ مجتمع کر رہا تھا۔ ایک افغان باغی جنہوں نے بہادر خان کو اپنا حکمران بنالیا تھا، دوسرا سنگرام سنگھ جس نے انتشار سے فائدہ اٹھا کر تھمبور کے نزدیک کندر (قندھار) کے مستحکم قلعے کا محاصرہ کرکے قبضہ کرلیا تھا۔ ان میں سے افغان باغی زیادہ طاقتور دکھائی دے رہے تھے۔

مگر اس وقت بابر نے خود کوئی فیصلہ کرنے کی بجائے مشیران جنگ کو طلب کیا تھا۔

آگرہ کے شاہی قصر کے ایوان خاص میں اس وقت یہ اجلاس جاری تھا۔ بابر شاہی کرسی پر براجمان تھا اور اس کے سامنے دورویہ مخملی توشکوں پر تمام جنگی سردار اور وزراء و امراء دوزانو بیٹھے تھے۔ بابر کے اشارے پر خواجہ کلاں نے اس مجلس مشاورت کے انعقاد کی وجہ بیان کیں اور تمام صورت حال ان کے سامنے رکھ دی۔

ان میں سے باغی افغان اس وقت زیادہ خطرناک معلوم ہو رہے تھے۔ بابر کی مشیران جنگ، راجپوتوں کی طاقت کو کوئی خاص اہمیت دینے کو تیار نہ تھے۔

ایک سردار نے کھڑے ہوکر نہایت ادب سے اپنی رائے کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔ ''بادشاہ سلامت، سنگرام بہت دور ہے اور یہ بھی ہم کچھ یقین سے نہیں کہہ سکتے کہ وہ ہمارے مقابل آنے کی جرأت بھی رکھتا ہے یا نہیں...... جبکہ ناصر خان لوہانی اور معروف خان چالیس ہزار سپاہیوں کے ساتھ افغانیوں سے برسرپیکار ہونے کے لئے قنوج کی طرف بڑھ رہے ہیں۔ چنانچہ ان کے خلاف فوری اقدام کرنا ضروری ہے۔''

''آپ ٹھیک فرماتے ہیں۔'' بابر نے عمر رسیدہ اور زیرک سردار کی بات کو بغور سننے کے بعد تائید بھرے انداز میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ پھر لحظہ بھر بعد اس نے تحکمانہ لہجے میں کہا۔ ''حکم دیا جاتا ہے کہ شہزادہ ہمایوں اپنے سپاہی لے کر فوری طور پر روانہ ہوجائیں۔''

ہمایوں اپنے دستے لے کر ثابت قدمی سے گنگا کے بہاؤ کے ساتھ آگے بڑھا اور ابھی وہ بیس میل کے فاصلے پر ہی تھا کہ باغی سرداروں کی فوجیں انہیں تنہا چھوڑ کر فرار ہوگئیں۔

اس دوران بابر آگرے میں موجود رہا۔ وہ ایک بڑے مقابلے کے لئے اپنی سپاہ کو مستحکم اور حاصل کردہ وسائل کو منظم کرنے اور بقیہ وقت باغات لگوانے میں صرف کرتا رہا۔ اس نے حمام بنوانے پر خاص توجہ دی کیونکہ اس کا خیال تھا کہ یہ حمام ہندوستان کی تین مصیبتوں گرمی، گرد اور لو سے پناہ دیتے ہیں۔

بابر جانتا تھا جلد یا بدیر اسے راجپوتوں سے ایک فیصلہ کن جنگ کرنی ہوگی۔ مگر اس آخری فیصلہ کن معرکے سے قبل وہ تمام چھوٹے خود مختار افغان سرداروں کو اطاعت پر مجبور کردینا چاہتا تھا۔ چنانچہ اس نے اپنے سامان حرب پر خصوصی توجہ دی اور ایک دیوپیکر توپ بنانے کا حکم دیا۔

اس توپ کے بنانے کے لئے دھات کو پگھلانے کے لئے آٹھ بھٹیاں استعمال کی گئیں۔ پھر بھی بڑے بڑے سانچے بھرنہ سکے۔ توپ خانے کا افسر اعلیٰ استاد علی خان اس صورت حال سے بے حد شرمندہ و رنجور تھا۔

''میں سوچ بھی نہ سکتا تھا، میری تمام عمر کا تجربہ اس موقع پر اتنا بے وقعت ثابت ہوگا۔'' وہ ملول لہجے میں کہہ رہا تھا۔ ''تم خود کو استاد کہلواتے ہو علی خان، افسوس تمہاری استادی بے حد بودی نکلی، اب تمہیں زندہ رہنے کا کوئی حق نہیں۔'' یہ کہہ کر وفور جذبات سے بے قابو ہوکر خود کو پگھلے ہوئے کاسے میں ڈالنے ہی والا تھا کہ بابر نے اچانک وہاں آکر نہایت مہر و محبت سے استاد علی خان کی دلجوئی کی۔

''استاد! یہ کیا کرتے ہو، ایک مسلمان ہوکر اس رب العزت پر یقین محکم رکھنے کی بجائے حرام موت مرنے کا خیال تمہارے دل میں کس طرح آیا؟''

بعد میں پتا چلا کہ توپ بالکل درست تھی البتہ اس کے کچھ حصوں کو الگ سے ڈھالا جاسکتا تھا۔ آخر کو وہ زبردست توپ تیار ہوگئی۔

جب بابر کو توپ کی تیاری اور اس کی کارکردگی کے بارے میں پتا چلا تو وہ بے حد خوش ہوا اور اس نے استاد علی خان پر انعام و اکرام کی بارش کردی۔

ابھی وہ بیانہ اور دیگر مستحکم علاقوں کے خلاف معرکہ آرائی کے بارے میں حتمی فیصلہ نہ کرپایا تھا کہ ایک رات ایک جاسوس یہ خبر لایا کہ راجپوت بابر سے دو دو ہاتھ کرنے کے لئے حرکت میں آچکے ہیں۔

''اب ضائع کرنے کو بالکل وقت نہیں ہے۔'' بابر نے مشیران جنگ سے مخاطب ہوکر کہا۔ ''ہمیں فوری طور پر جنگ کا اعلان کرنا ہوگا۔''

چنانچہ اس نے فوری طور پر شہزادہ ہمایوں کو بلانے کا حکم جاری کیا جو حال ہی میں غازی پور، جونپور اور کالپی پر قبضہ کرکے ایک شاندار مہم کو پایۂ تکمیل پہنچا کر واپسی کی تیاری کر رہا تھا۔

اب بابر آگرے میں رہتے ہوئے راجپوتوں سے زندگی اور موت کی جنگ کے لئے انتظامات مکمل کر رہا تھا اور اسے موت کی نیند سلانے کے لئے ایک زہریلی سازش اس کی طرف قدم بڑھا رہی تھی۔

مفتوح و مقتول سلطان ابراہیم لودھی کی ماں نے احمد چاشنی گر کو اٹاوہ سے بلایا اور ایک انتہائی مہلک زہر ایک پڑیا میں لپیٹ کر ایک کنیز کے حوالے کیا اور کہا۔ ''اسے احمد چاشنی گر کو دے دو۔''

''محترم خاتون، اس کا میں کیا کروں؟'' چاشنی گر کچھ ہی دیر میں پڑیا لئے لودھی کی ماں کے سامنے دست بستہ کھڑا تھا۔

''تمہیں انعام کے طور پر چار پرگنے عطا کئے جائیں گے۔'' ادھیڑ عمر گوری چٹی والدۂ سلطان دھیمی مگر مضبوط آواز میں گویا ہوئی۔ ''بس اتنا کرو کہ کسی طرح بابر کے مطبخ میں پہنچ کر یہ زہر اس کے کھانے میں شامل کردو۔''

احمد چاشنی گر ہفتے کے ہفتے بابر کے مطبخ خانے میں شیرینی بنانے کے لئے طلب کیا جاتا تھا۔ چنانچہ چار پرگنوں کی لالچ میں اس نے یہ کام کرنا منظور کرلیا۔

بابر کے باورچی خانے میں کھانا پکنے اور قابوں میں اتارے جانے تک سخت نگرانی کی جاتی تھی، خصوصاً ہندو باورچیوں پر خاص نظر رکھی جاتی تھی۔ احمد موقع کی تلاش میں رہا۔ کھانا دیگچیوں سے قابوں میں اتارنے سے پہلے چکھا گیا۔

سب کچھ ٹھیک ٹھاک تھا۔ جب گوشت قابوں میں نکالا جارہا تھا تو احمد چاشنی گر نے موقع پاکر زہر چپاتیوں پر ڈال دیا۔ آدھے سے زیادہ زہر چپاتیوں پر ڈالنے کے بعد بقیہ بچا شدہ زہر اس نے گھی میں تلے ہوئے گوشت کو ہلکی چپاتیوں پر رکھ کر ملادیا۔

جمعہ کا دن تھا۔ دسمبر کی سرد دوپہر، نماز جمعہ کے بعد کھانا لگایا گیا۔ بابر نے پُرشوق نظروں سے ہلکی چپاتیوں پر رکھے بھنے گوشت کی طرف دیکھا۔

یہ اس کی مرغوب غذا تھی۔ چند لقمے لیتے ہی اسے متلی محسوس ہوئی۔ پھر زوردار انداز میں ابکائیاں آنا شروع ہوگئیں۔ دسترخوان پر موجود تمام ہی لوگ پریشان ہو اٹھے۔ بابر فوری طور پر آب خانے کی طرف روانہ ہوگیا۔ قاسم بیگ اس کے پیچھے لپکا۔

بابر کا سر چکرا رہا تھا اور آنکھوں کے آگے اندھیرا چھاتا جارہا تھا۔

الٹی کے بعد اس کی طبیعت کچھ سنبھلی تھی۔

''آقا! آپ ٹھیک تو ہیں؟'' قاسم بیگ سراسیمہ ہوکر پوچھ رہا تھا۔

''میں ٹھیک ہوں۔'' بابر نے خود کو سنبھالتے ہوئے کہا۔ ''فوری طور پر باورچی کو گرفتار کرلیا جائے اور کھانے کو کسی کو کھلا کر دیکھا جائے، مجھے شبہ ہے کہ تلے گوشت میں زہر ملایا گیا تھا۔''

''کیا؟'' قاسم بیگ کا چہرہ فق ہوگیا۔ ''یہ کیسے ممکن ہے؟''

''اس بات پر بعد میں غور ہوگا۔'' بابر کرب بھرے انداز میں مسکرایا۔ ''فی الحال یہ معلوم کرو کہ میرا شبہ درست ہے یا نہیں؟''

بابر کا شبہ درست ثابت ہوا۔ فوری طور پر شاہی طبیب کو طلب کیا گیا۔ پتا چلا کہ بابر کو زہر دیا گیا تھا۔ قسمت اچھی تھی کہ بے حد قلیل مقدار بادشاہ کھاسکا ورنہ اپاہج ہوجاتا یا موت کے منہ میں چلا جاتا۔ چنانچہ بابر نے یہ زہریلی حرکت کرنے والے افراد کو سخت ترین سزائیں دینے کا فیصلہ کیا تاکہ آئندہ کوئی ایسی حرکت کرنے سے پہلے ان سزاؤں کو یاد کرکے عبرت حاصل کرے۔

چاشنی گر اور باورچی کو بابر کے سامنے لایا گیا۔ بابر نے چاشنی گر کے ٹکڑے ٹکڑے کردینے اور باورچی کی کھال کھینچ لینے کا حکم دیا۔ وہ کنیز جو زہر لے کر چاشنی گر تک پہنچی تھی، ہاتھی کے پاؤں تلے کچلوادی گئی۔

ان معاملات سے نبٹ کر بابر نے دوبارہ ملکی حالات پر توجہ دی۔ حالات سنگین ہوتے جارہے تھے۔ بیانہ کے قلعے میں جو فوج موجود تھی، اس کا محاصرہ سنگرام سنگھ اور حسن خان میواتی کی متحدہ فوجوں نے کرلیا تھا۔ حسن خان میواتی اور سنگرام سنگھ کی خواہش تھی کہ بابر کو ہندوستان سے باہر نکال دیا جائے۔

بابر نے فوری طور پر محمد سلطان مرزا کو فوج لے کر بیانہ کی طرف روانہ کیا مگر یہ فوج میانہ کے قلعے میں موجود محافظ فوج تک پہنچنے میں ناکام رہی بلکہ محصورین سے رابطہ ہی نہ کرسکی۔ آخر ناکام واپس لوٹ آئی اور اپنے ساتھ راجپوتوں کے لشکر جرار کی تعداد اور جوش و خروش کی ایسی کہانیاں لائی کہ بابر کی آگرے میں موجود فوج کے حوصلے پست ہونے لگے۔

سنگرام سنگھ جو عرف عام میں رانا سانگا کہلاتا تھا، میواڑ کا راجہ تھا۔ وہ راجپوتوں کا راجہ تھا مگر تمام ہندوؤں کی نمائندگی کرتا تھا اور پورے ہندوستان پر ہندوؤں کی حکومت قائم کرنے کا خواب دیکھ رہا تھا۔ سارے راجستھان پر اس کی دھاک تھی۔

وہ ایک بہادر سپاہی، تلوار کا دھنی تھا۔ اس کے چہرے اور جسم پر تلواروں اور نیزوں کے اَن گنت نشان، اس کے جنگ و جدال سے رغبت کی دلیل تھے۔

رانا سانگا نے بابر کو ہندوستان پر حملہ کرنے کی دعوت دی تھی۔ مگر اس نے یہ سوچا ہی نہیں تھا کہ بابر واپس لوٹ جانے کی بجائے ہندوستان پر حکومت کرنے کے لئے یہیں رک جائے گا۔

جب اسے بابر کے ارادوں کا اندازہ ہوا تو اس نے راجپوتوں کی فوج کا ایک مشترکہ اور متحدہ محاذ بنایا اور دہلی کی طرف پیش قدمی شروع کردی۔ اس کے مددگاروں میں حسن خان میواتی اور ابراہیم لودھی کا چھوٹا بھائی محمود لودھی بھی تھے۔

☆......☆......☆

ماہ فروری کا پہلا عشرہ اختتام پذیر ہوچکا تھا۔ موسم سرما اپنی آخری سانسیں لے رہا تھا۔ آگرے کے نیلے آسمان پر سیاہ بادل بکھرے ہوئے تھے۔ ان بادلوں کے باعث شام کے ذرا ڈھلتے ہی آگرہ کے کوچہ و بازار میں رات کی تاریکی پھیل گئی تھی۔ فضاؤں میں عجب سہمی ہوئی سی کیفیت رچی ہوئی تھی۔

محمد سلطان مرزا کی فوج نے واپس آکر رانا سانگا اور اس کے اتحادیوں کی فوج کی جو منظر کشی کی تھی، اس نے بابر کے سپاہیوں کے دل دہلا دیئے تھے۔ اس صورت حال نے بابر کو چوکنا ہونے پر مجبور کردیا تھا۔

وہ فوری طور پر اپنا لشکر سمیٹ کر آگرے سے نکلا اور فتح پور سیکری کے میدان میں آکر خیمہ زن ہوا۔ یہاں اس نے جنگ کی تیاریاں کیں، مگر اس کی فوج کے حوصلے پست تھے، دل بیٹھے ہوئے تھے، خوف و ہراس طاری تھا۔

ادھر رانا سانگا کا لشکر بھی مسلسل بڑھ رہا تھا۔ رانا کے پاس دو لاکھ کا لشکر تھا جبکہ بابر کے پاس محض سولہ ہزار سپاہی تھے۔ پست ہمت اور بددل...... مگر بابر کی ہمت جوان تھی۔ اس نے بہت میدان دیکھے تھے۔ نوعمری سے وہ جنگ و جدال کا عادی تھا۔ سو فوری جنگ کی توقع کرتے ہوئے بابر اور اس کے سپاہیوں نے زرہ بکتر چڑھالئے، اپنے توپ خانے کو یکجا کرکے آگے بڑھے اور جھیل سے کچھ فاصلے پر پڑاؤ ڈالنے کا فیصلہ کیا گیا۔

بابر نے حسب سابق اپنے مورچے کو مستحکم کرنا شروع کیا۔ فوج کے سامنے اِدھر اُدھر گاڑیوں کی ٹکڑیاں رکھی گئیں۔ ہر گاڑی دوسری گاڑی سے اٹھارہ فٹ لمبی لوہے کی زنجیر سے بندھی تھی، جو پانی پت کے میدان والے عارضی چمڑے کے رسوں کی جگہ استعمال کی گئی تھیں۔ پہلے کی طرح ان گاڑیوں کے پیچھے توپچی اور بندوقچی پناہ لینے والے تھے۔ ترکی ماہر مصطفیٰ نے نہایت مہارت سے مورچہ بندی کی تھی۔ بابر نے اسے میمنہ پر تعینات کرنے کا فیصلہ کیا جہاں ہمایوں اپنے دستوں کے ساتھ موجود تھا۔

مورچوں کو ایک خندق کے ذریعے مزید مضبوط کیا گیا۔ لیکن فوجی تیاریوں کی سب سے نمایاں خصوصیت وہ نئی قسم کی گاڑیاں تھیں جو پہیہ دار تپائیوں کی شکل میں بنائی گئی تھیں۔ جب ان کو ایک قطار میں رکھا جاتا تھا تو ان سے بیک وقت بندوقچیوں کا بچاؤ بھی ہوسکتا تھا اور بندوقچیوں کے لئے ٹیک بھی مل جاتی تھی۔ یہ تپائیاں بھی چمڑے کے رسوں کی مدد سے ایک دوسرے سے وابستہ تھیں۔

ابھی یہ تیاریاں جاری تھیں کہ پانچ سو سپاہیوں کی ایک چھوٹی سی امدادی فوج آپہنچی جو اپنے ساتھ بابر کی پسندیدہ غزنی کی شراب اور ایک نامور نجومی لائی تھی۔ اپنی پسندیدہ مے دیکھ کر بابر کی آنکھوں میں چمک جاگ گئی تھی۔

ابھی مے، خمار آلود صراحی سے پیمانوں تک پہنچی نہ تھی، مے کشوں نے ابھی جام تھامے بھی نہ تھے کہ بابر کو خبر ملی کہ نجومی اپنی تشویش ناک پیش گوئیوں سے سپاہیوں کے حوصلے مزید پست کر رہا ہے۔

بابر کو اپنے اوائل عمر میں توہمات نجوم پر کان دھرنے سے تباہی کا سامنا کرنا پڑا تھا۔ اب وہ اس تجربے کو دہرانے کی کوئی خواہش نہیں رکھتا تھا۔ سو اس نے اس بات پر غور کرنا شروع کیا کہ اپنے سپاہیوں کے عزم و استقلال کو کس طرح بیدار کیا جائے۔ اس نے مختلف اطراف میں تاخت و تاراج کرنے والے دستے بھیج کر اپنے سپاہیوں کے جنگی جذبے کو ابھارنے کی کوشش کی مگر اسے کوئی خاطر خواہ کامیابی حاصل نہ ہوسکی۔

کافی غور و خوض کے بعد اس نے بادہ نوشی سے توبہ کرنے کا فیصلہ کیا اور دوپہر کے ڈھلتے ہی وہ اپنے سپاہیوں کے روبرو آکھڑا ہوا۔ ہاتھ میں بلوری پیمانہ تھام کر اس نے اپنی سپاہ کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ ''یہ بادۂ گلرنگ اور اپنی بلانوشیاں مدت سے ترک کرنے کو سوچتا تھا۔ لیکن میری توبہ پر بجلیاں گرتی رہیں۔'' لحظہ بھر کو خاموش ہوکر اس نے اپنی جانب دیکھتے ہوئے سپاہیوں کی طرف دیکھا۔

سپاہیوں کے چہرے مایوسی سے لٹکے ہوئے تھے اور آنکھوں سے اداسی ہویدا تھی۔ پھر اس نے پیمانہ بردوش ہاتھ سے لشکر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ''یہ جو یاس و قنوط کے بادل چھا گئے ہیں، خدا کی فتح ہم سے دور ہوتی محسوس ہورہی ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ اللہ عزوجل ہم سے ناراض ہوگیا ہے۔'' پھر اس نے دونوں ہاتھ سامنے کی طرف پھیلائے اور سب کو بلانے والے انداز میں کہا۔ ''آؤ آج ہم اس کو راضی کرنے کی کوشش کریں، اس لئے کہ وہی اپنے بندوں کی بہتر پناہ ہے۔'' اس کے بعد اس نے شیشے کا پیمانہ زمین پر دے مارا اور پُریقین لہجے میں بولا۔ ''آج سے میں اس ام الخبائث سے دستبردار ہوتا ہوں۔ اسے نہ ہاتھ لگاؤں گا نہ منہ...... میں اس گناہ سے ابھی اسی وقت تائب ہوتا ہوں، اپنے رب عظیم کی خوشنودی کی خاطر میں ہمیشہ ہمیشہ کے لئے اس سے ناتا توڑتا ہوں۔''

غزنی سے آئی شراب کو زمین پر بہادیا گیا۔ بقیہ ذخائر میں نمک ڈال کر بے روح کردیا گیا۔ طلائی و نقرئی جام و سبو جو عیش و نشاط کے مظہر تھے، انہیں پگھلا کر ختم کردیا گیا۔ بلوری پیمانے دصراحیاں توڑ دی گئیں۔ نفس امارہ پر اس فتح کی یاد میں اس جگہ کنویں اور مسافر خانے کی تعمیر کا حکم دیا اور مسلمانوں پر محاصل کی تمام ادائیگی معاف کردی۔

تقریباً تین سو خاص سرداروں نے اپنے آقا کے عمل کی پیروی کرتے ہوئے شراب نوشی سے توبہ کرلی۔ اس روح پرور منظر نے فوج میں جوش کی ایک نئی لہر دوڑادی۔

اس موقع پر بابر اپنے امراء اور سپاہیوں سے مخاطب ہوا۔ ''میرے رفیقو! جو پیدا ہوا ہے، بالآخر اسے ناپید ہونا ہے، جو کوئی اس دنیا سرا میں آیا ہے، آخر کار ایک دن اسے لوٹ کر جانا ہے، ہر ذی نفس کو موت کا مزہ ضرور چکھنا ہے، تو پھر بے عزتی سے جینے سے عزت سے مرنا یقیناً بہتر ہے۔ کس منہ سے خدائے بزرگ و برتر کا شکر یہ ادا کیا جائے کہ اس نے ہم مسلمانوں کو یہ سعادت بخشی کہ جنگ میں کام آئیں تو شہید کا درجہ پائیں اور جنت کے دروازے ہمارے لئے وا کردیئے جائیں گے۔ اللہ کے فرشتے ہمارے استقبال کے لئے منتظر ہوں گے، اور اگر جیت گئے تو غازی کہلائیں گے، خدا کی زمین کے وارث ہوں گے، اس کی نعمتوں سے مالا مال ہوں گے...... تو پھر آؤ آج ہم اپنے رب سے عہد کریں کہ نہ ایسی موت سے منہ موڑیں گے، نہ قتال کی شدت سے گھبرائیں گے۔ یقین رکھو اللہ کی طرف سے فتح و نصرت ضرور ہمارے ساتھ ہوگی۔''

سپاہیوں میں ایک ولولہ جاگ اٹھا تھا۔ بابر کی سچائی میں گندھی پُرحوصلہ اور پُرعزم آواز اس کے سپاہیوں کے مردہ دلوں اور بے جان جسموں میں ایک نئی روح پھونکتی چلی گئی تھی۔

سب نے بیک زبان حلف اٹھایا اور جان کی بازی لگانے کی قسم کھائی۔ کل تک انہیں اپنی تعداد کی کمی کھائے جارہی تھی۔ وہ کل سولہ ہزار تھے جبکہ رانا سانگا کا لشکر دو لاکھ سپاہیوں پر مشتمل تھا۔ مگر آج رب کریم و عظیم کی ذات پر اور اس کی مدد کی امید پر انہیں اپنے کم ہونے کا احساس ختم ہوتا محسوس ہوتا تھا۔

سنگرام عرف رانا سانگا بڑے طمطراق سے میدان میں اترا۔ میدان پر جھکا نیلا آسمان لشکریوں کے قدموں سے اُڑتی دھول سے مٹیالا ہوگیا تھا۔ جھلملاتے سورج نے حیرت سے پلکیں جھپک کر دونوں اطراف کے جنگجوؤں کی طرف دیکھا۔ صبح ساڑھے نو بجے جنگ شروع ہوئی۔ سورج غروب ہونے سے قبل فیصلہ ہوگیا۔

ایک بار پھر تقدیر بابر کے جذبے کے سامنے جھک گئی تھی۔

قدرت کی مہربانی فتح و نصرت کی صورت سامنے آئی تھی۔

رانا سانگا اپنی دو لاکھ سپاہ کے ہونے کے باوجود شکست فاش سے دوچار ہوگیا تھا۔ وہ بصد مشکل اپنی جان بچا کر میدان جنگ سے فرار ہونے میں کامیاب ہوا۔

ہزاروں راجپوت سپاہی اور سردار جنگ میں کام آئے۔ راجپوتوں اور خصوصاً ہندوؤں کا ہندو حکومت قائم کرنے کا خواب ریزہ ریزہ ہوچکا تھا۔ اس طرح پانی پت کی جنگ میں فتح حاصل کرکے بابر نے سلطنت مغلیہ کی بنیاد رکھی تھی۔ اور یوں اس نے رانا سانگا کو شکست دے کر سلطنت کی جڑوں کو استحکام بخشا۔

فتح کی مبارکبادیوں کے غل میں بابر نے ''غازی'' کا لقب اختیار کیا۔ یعنی اب وہ ''ظہیرالدین محمد بابر بادشاہ غازی'' کہلانے لگا۔

جنگ کے بعد فی الحال کوئی بڑا دشمن میدان میں نہ رہا تھا، اس لئے بابر نے فیصلہ کیا تھا کہ وہ بنا کسی روک ٹوک اور پس و پیش کے اپنے علاقوں کی تسخیر کے کام کو آگے بڑھائے گا۔

وہ بیانہ کی طرف بڑھا۔ اپنی فتح و نصرت پر مہر تصدیق ثبت کرنے کی خاطر وہ راجپوتانہ پر باقاعدہ فوج کشی کا ارادہ کر رہا تھا مگر چونکہ موسم گرما نزدیک تھا، اس نے اپنے امیروں کے مشورے کو بادل نخواستہ قبول کیا اور منصوبے کو ترک کرکے میوات کو تسخیر کرتا، الور میں داخل ہوا اور اس کے بعد کوٹیلا و بیانہ کی راہ سے آگرہ واپس لوٹ آیا۔

جن دنوں وہ ان پیش قدمیوں میں مصروف تھا۔ اس نے ہمایوں اور مہدی خواجہ کو اپنے دستوں سمیت کابل چلے جانے کی اجازت دے دی تھی۔ کافی سپاہ کابل جانے کے لئے بے تاب تھی۔ بابر نے سب کو جانے دیا۔ کابل افواج سے خالی ہوچکا تھا، اس لئے وہاں کی حالت بابر کے لئے کسی قدر تشویش کا باعث تھی کیونکہ وہ بخوبی جانتا تھا کہ اگر تقدیر کی کوئی ناگہانی مخالفانہ گردش اس کو ہندوستان سے باہر دھکیل دے تو یہ چیز انتہائی اہم ہوگی کہ ایک مضبوط اور پائیدار مرکز کابل کی صورت اس کے قبضے میں موجود ہو جہاں سے مستقبل میں کارروائیاں کی جاسکیں۔

اب بابر اپنے ساتھیوں میں مختلف صوبوں اور اضلاع کو تقسیم کرکے ان کی خدمات اور وفاداری کا انعام دینا چاہتا تھا۔ سلطنت مغلیہ کے نظم و نسق کی بنیاد رکھنے کے سلسلے میں وہ پہلا قدم تھا جو بابر نے اٹھایا۔ بابر ایک ایسی سلطنت کا وجود یقینی بنانے کا متمنی تھا جو صرف فتوحات کی بنیاد پر قائم ہو۔

اس طرح بابر نے اپنے محکوم علاقوں کو اپنے بڑے بڑے امراء میں تقسیم کردیا۔ ساتھ ہی یہ شرط بھی عائد کردی کہ ان میں سے ہر شخص اپنے حلقۂ اختیار کے علاقے میں انتظام ٹھیک رکھنے اور امن و امان قائم رکھنے کا ذمہ دار ہوگا۔

اس طرف سے فارغ ہوکر بابر نے اپنے چاروں طرف نگاہ کی تو اس نے دیکھا کہ گرچہ راجپوت ریاستی اتحاد کا شیرازہ بکھیر دیا گیا ہے۔ تاہم ابھی تک انفرادی طور پر کچھ سردار ایسے ہیں جنہیں خاک چٹوانے کی ضرورت ہے۔ اس میں سب سے پہلے نمبر پر مالوہ کا میدنی راؤ تھا جو چندیری پر قابض تھا۔ بابر نے اس کے خلاف جنگ کا اعلان کردیا اور دسمبر کے آغاز کے ساتھ ہی سیکری سے مالوہ کی دشوار گزار مسافت پر روانہ ہوگیا۔

اس نے گنگا اور چمبل کے سنگم کے پاس کنار گھاٹ پر دریا کو پار کیا اور کالپی کی طرف روانہ ہوگیا۔

اس نے چندیری کے سامنے پڑاؤ ڈالا اور جنگ کے لئے حکمت عملی شروع کردی۔ قلعہ شکن توپوں کے لئے مناسب جگہوں کا انتخاب کیا گیا، اوپر چڑھنے کے لئے سیڑھیوں کی تیاریوں کا کام بھی شروع کردیا گیا۔ 27 جنوری کے طلوع آفتاب کے ساتھ ہی بابر نے چندیری پر حملہ کردیا۔ میدنی راؤ اور اس کے سپاہی بہت بہادری سے لڑے لیکن آخر کار انہیں شکست کا منہ دیکھنا پڑا اور چندیری پر بابر کے نام کا جھنڈا لہرانے لگا۔

چندیری کی فتح کے بعد بابر نے اپنی توجہ کا مرکز افغان سرداروں کو بنایا۔ افغان سردار جہاں موقع ملتا، بغاوتیں برپا کرنا شروع کردیتے تھے۔ بہار میں ابراہیم لودھی کے بھائی محمود لودھی نے بڑا خلفشار برپا کر رکھا تھا۔ بابر نے اپنے بیٹے عسکری کی قیادت میں ایک فوج ان سرداروں کو پسپا کرنے کے لئے روانہ کی اور پیچھے خود بھی روانہ ہوگیا۔

گھاگھرا کے مقام پر لڑائی ہوئی۔ بابر نے افغان سرداروں کو شکست فاش دی۔ افغان سرداروں کی طاقت ٹوٹ گئی۔ انہوں نے اطاعت و فرمانبرداری کا حلف اٹھایا اور بابر اس فتح و کامیابی کا تاج اپنے سر پر سجائے واپس آگرے کے لئے روانہ ہوگیا۔

☆......☆......☆

ابھی سورج پوری طرح طلوع نہیں ہوا تھا۔ صبح کاذب کا سنہری دھندلکا نیلگوں آکاش پر طلائی تاثر بکھیر رہا تھا۔ ایسے میں ایک خادم نے بابر کی خواب گاہ کے دروازے پر دستک دی۔

بابر نماز فجر کے لئے بیدار ہوچکا تھا۔ نماز تہجد کی ادائیگی کے بعد بہت کم ایسا ہوتا تھا کہ وہ دوبارہ بستر پر دراز ہوتا ہو ورنہ عام طور پر تہجد کے بعد وہ فجر تک ذکر و اذکار میں مصروف رہتا تھا۔

دستک پر اس نے گردن کو خم دے کر دروازے کی طرف دیکھا اور ہاتھ میں موجود تسبیح کو تپائی پر رکھ کر اس نے دروازے پر موجود شخص کو اندر آنے کی اجازت مرحمت فرمائی۔

''شہنشاہ اعظم!'' اندر داخل ہونے والا خادم اس کے سامنے جھکتے ہوئے مؤدب لہجے میں کہہ رہا تھا۔ ''بدخشاں سے ایک پیامبر آیا ہے، وہ شہزادے ہمایوں کی طرف سے آپ کے لئے ایک خاص خبر لایا ہے۔''

''اسے پیش کیا جائے۔'' بابر کے دھیمے اور گمبھیر لہجے میں ایک بے نام سی جلد بازی بھی پنہاں تھی۔ وہ اپنے چہیتے اور لاڈلے شہزادے کی طرف سے آنے والی خبر کو جلد از جلد سننے کا متمنی تھا۔

''شہنشاہ اعظم مبارک ہو۔'' خبر رساں خواب گاہ میں داخل ہوتے ہی بادشاہ کے سامنے جھک کر بولا۔ ''بادشاہ سلامت، یہ غلام شہزادے ہمایوں کی طرف سے آپ کے لئے ایک خوشخبری لے کر حاضر ہوا ہے۔''

''جلد سناؤ۔'' بابر نے بے تابانہ سوال کیا۔

''جی۔'' پیامبر لحظے بھر کو تھما۔ پھر مسرور سے لہجے میں بولا۔ ''شہزادہ ہمایوں پہلے بیٹے کے باپ بن چکے ہیں۔ آپ کو بھی مبارک ہو۔ آپ دادا بن گئے ہیں۔''

''اوہ۔'' بابر کی آنکھوں میں بے یقین حیرانی چمکی اور چہرے پر مسرت روشنی بن کر بکھر گئی۔ ''کیا واقعی؟''

''جی بادشاہ سلامت۔'' خبر لانے والا ایک بار پھر بادشاہ کے سامنے آدھا جھک گیا تھا۔ ''شہزادے محترم نے آپ سے نومولود شہزادے کا نام رکھنے کی بھی درخواست کی ہے۔''

''یہ تو واقعی بہت بڑی خوشخبری ہے۔'' بابر کے لہجے سے خوشی پھوٹی پڑ رہی تھی۔

اس نے اپنے گلے سے سچے موتیوں کی ایک بیش قیمت مالا اتار کر خوشخبری لانے والے کی طرف بڑھائی۔ ''یہ تمہارا انعام ہے۔'' اس نے مسرور لہجے میں کہا۔ ''اور رہا نام کا سوال تو وہ ہم ضرور رکھیں گے۔''

(جاری ہے)

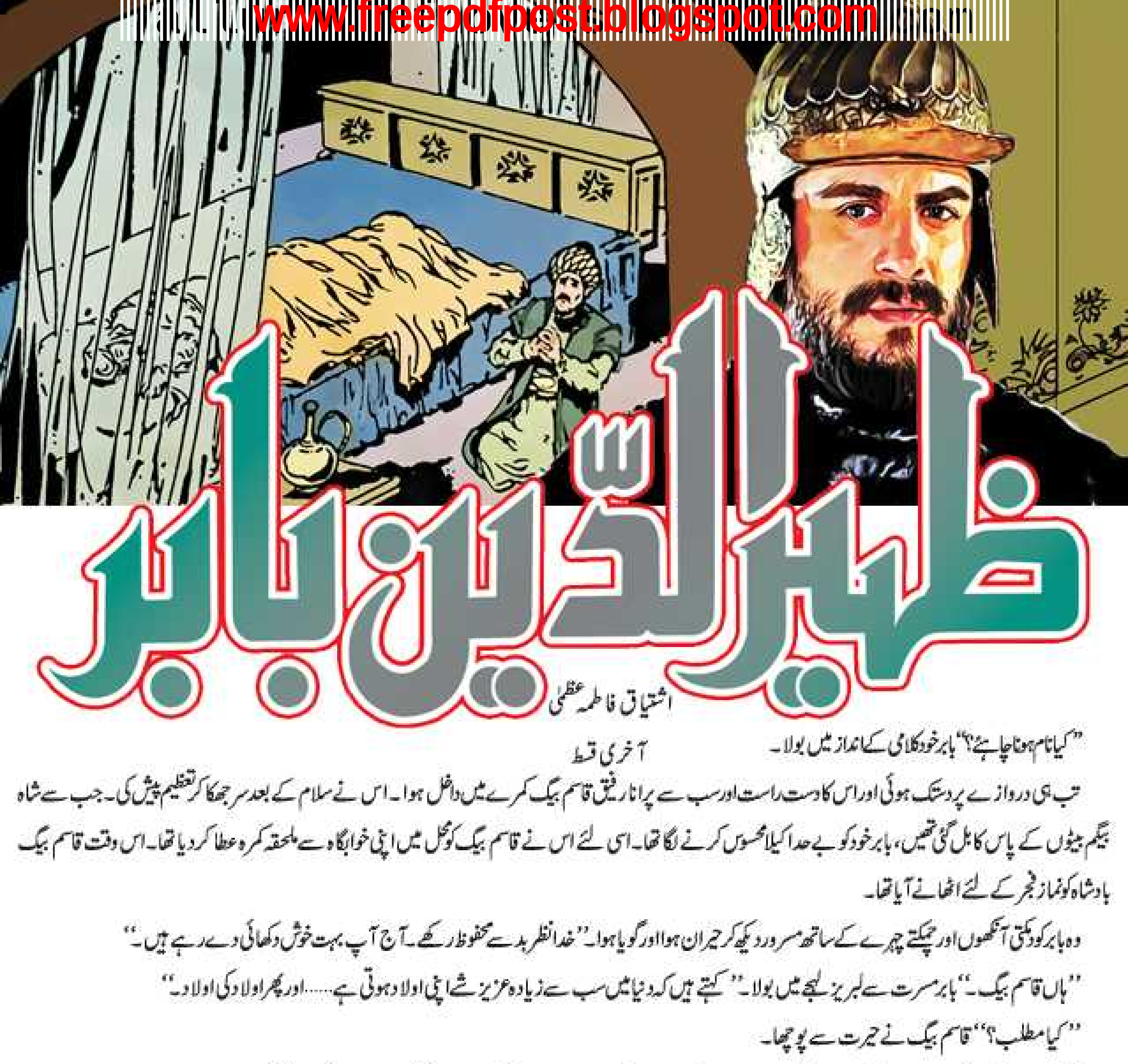

ظہیر الدین بابر

اشتیاق فاطمہ عظمی

آخری قسط

‘‘کیا نام ہونا چاہئے؟’’ بابر خود کلامی کے انداز میں بولا۔

تب ہی دروازے پر دستک ہوئی اور اس کا دست راست اور سب سے پرانا رفیق قاسم بیگ کمرے میں داخل ہوا۔ اس نے سلام کے بعد سر جھکا کر تعظیم پیش کی۔ جب سے شاہ بیگم بیٹوں کے پاس کابل گئی تھیں، بابر خود کو بے حد اکیلا محسوس کرنے لگا تھا۔ اسی لئے اس نے قاسم بیگ کو محل میں اپنی خوابگاہ سے ملحقہ کمرہ عطا کر دیا تھا۔ اس وقت قاسم بیگ بادشاہ کو نماز فجر کے لئے اٹھانے آیا تھا۔

وہ بابر کو دمکتی آنکھوں اور چمکتے چہرے کے ساتھ مسرور دیکھ کر حیران ہوا اور گویا ہوا ‘‘خدا نظر بد سے محفوظ رکھے۔ آج آپ بہت خوش دکھائی دے رہے ہیں۔’’

‘‘ہاں قاسم بیگ۔’’ بابر مسرت سے لبریز لہجے میں بولا۔ ‘‘کہتے ہیں کہ دنیا میں سب سے زیادہ عزیز شے اپنی اولاد ہوتی ہے...... اور پھر اولاد کی اولاد۔’’

‘‘کیا مطلب؟’’ قاسم بیگ نے حیرت سے پوچھا۔

‘‘سنو قاسم بیگ۔’’ بابر مسرور لہجے میں بولا۔ ‘‘ہمایوں باپ اور میں دادا بن گیا ہوں۔ ہمایوں کے یہاں بیٹے کی ولادت ہوئی ہے۔’’

‘‘ماشاءاللہ۔’’ قاسم بیگ نے حیرت بھری مسرت سے کہا۔ ‘‘یہ واقعی بے حد خوشی کی بات ہے...... کیا نام رکھا گیا بچے کا۔’’

‘‘مجھ سے گزارش کی ہے۔’’ بابر نے بتایا۔ ‘‘اور تب سے میں یہی سوچ رہا ہوں کہ کیا نام رکھا جائے۔’’ پھر کچھ سوچ کر وہ بولا۔ ‘‘ایک نام ذہن میں آیا تو ہے۔’’

‘‘ارشاد فرمایئے، بھلا کیا نام آپ کے ذہن میں آیا ہے؟’’ قاسم بیگ نے پُر اشتیاق لہجے میں سوال کیا۔

‘‘الامان۔’’ بابر نے خوشی سے لبریز لہجے میں جواب دیا۔

☆......☆......☆

بابر ہمایوں سے بے حد محبت کرتا تھا۔ پہلی اولاد اور ولی عہد ہونے کے ناتے بابر کو اس سے بے حد امیدیں وابستہ تھیں، مگر ہمایوں کی سستی کی عادت امور سلطنت سے لاپروائی اور دیگر چھوٹی چھوٹی خامیاں بابر کو بے حد ناپسند تھیں۔ وہ جانتا تھا کہ ہمایوں ہندوستان جیسی وسیع و عریض سلطنت کا ہونے والا حکمراں ہے...... اور بادشاہوں کی چھوٹی چھوٹی غلطیاں کبھی بڑے وبال کا روپ دھار لیتی ہیں۔ اس کا کہنا تھا۔ ‘‘سستی اور کاہلی بادشاہت کے ساتھ مطابقت نہیں رکھتی، وہ اپنے خطوط میں ہمایوں کو سمجھاتا رہتا تھا کہ وہ اپنی عزلت پسندی کو ایک طرف رکھ دے کیونکہ یہ بات اسے دوسروں سے محبت سے گریز پر مجبور کرتی ہیں۔ بابر ہمایوں کو اکثر اپنے بھائیوں سے محبت اور حسن سلوک کی تاکید کرتا رہتا تھا۔

اس کے چاروں بیٹے اس سے دور تھے۔ شاہ بیگم بھی کابل میں تھی۔ بابر کی بڑھتی عمر اور مضمحل ہوتے قویٰ اس بات کے متقاضی تھے کہ وہ اپنوں کے بیچ چین و سکون سے ایک آرام دہ زندگی گزارے۔ اسے اپنے سب سے چھوٹے بیٹے ہندال سے بھی بے اندازہ اُنسیت تھی، اسی لئے اس نے ہندال کو کابل سے آگرہ آنے کا حکم دیا تھا۔ اب وہ بوڑھا ہو رہا تھا اور کم از کم ایک بیٹے کو وہ اپنے ساتھ رکھنا چاہتا تھا۔

اس زمانے میں اس پر کبھی کبھی قنوطیت کے شدید دورے بھی پڑتے تھے۔ تب اس کا دل چاہتا تھا کہ دنیا تیاگ کر کسی جنگل میں چلا جائے اور زندگی کے بقیہ ماہ و سال تنہائی میں گزار دے۔

وہ بابر جو پہلے اتنا مضبوط اور پختہ عزائم کا مالک تھا، اب ضعیف الارادہ اور متلون مزاج ہو گیا تھا۔

‘‘میرا خیال ہے کہ اب آپ کو کچھ وقت آرام کرنا چاہئے۔’’ قاسم بیگ اس کی بدلتی کیفیات اور تبدیل ہوتی حالت سے خاصا فکر مند و متوحش تھا۔ قاسم بیگ کے مشوروں پر عمل کرتے ہوئے اس نے اپنا کچھ وقت اس عظیم اور جنگی اہمیت کی سڑک کا منصوبہ تیار کرنے میں گزارا جو آگرہ اور کابل کے درمیان مواصلات کا تحفظ کر سکتی۔ اس سڑک کی تعمیر کے وقت پہرے کے مینار (دیدبان) گھوڑے بدلنے کی چوکیاں اور راحت خانے تعمیر کرنے کے احکام صادر کرتا رہا۔ اس موقع سے فائدہ اٹھا کر اس نے ایک شاندار ضیافت کا بھی اہتمام کیا۔ جس میں ایران اور ازبکوں کے سفیر ہندو ریاستوں کے ایلچی اور ماوراء النہر کے قابل احترام خواجہ شریک تھے۔ اس نے سفیروں کو تحفوں اور خلعت فاخرہ سے نوازا تو اپنے ایام بدحالی کے دوستوں کو بھی اس خوشی کے موقع پر نہ بھولا اور اس نے بڑی فراخدلی سے اپنے ان ساتھیوں پر نوازشات کی بارش کر دی تھی۔

وہ دوشنبہ کے دن دربار لگاتا۔ امور سلطنت پر توجہ دیتا۔ وہ اپنا بہت سارا وقت تعمیراتی سرگرمیوں کی نگرانی میں صرف کرتا تھا۔ اپنے اور اپنی اولاد کے لئے محلات حمام بنوانے اور باغات لگوانے میں بھی بے حد دلچسپی لے رہا تھا۔ ان تمام مصروفیات کے باوجود اس کے اندر سونا پن بڑھتا ہی جا رہا تھا۔ اس کے سینے میں ایک عجب سا خلا بنتا جا رہا تھا۔ تنہائی کا غیر مرئی آہنی پنجہ دن بہ دن اسے جکڑتا جا رہا تھا۔

بابر بدخشاں و کابل میں مقیم ازبکوں سے خاصا بدظن تھا اور وہ ان تمام ازبکوں کو سزا دینا چاہتا تھا جو اس کے بیٹوں کے لئے مشکلات کھڑی کرتے رہتے تھے، اسی لئے اس نے ہمایوں کو ازبکوں کے خلاف ایک مہم پر روانہ ہونے کا حکم دیا مگر ہمایوں کی یہ مہم ناکام ہوئی تھی۔ بیٹے کی اس ناکامی نے بابر کو از حد مایوس کیا تھا۔

چنانچہ اس نے اگلے موسم بہار میں کابل جانے کا ارادہ ظاہر کیا تاکہ بلخ و بدخشاں میں اپنے مفادات کی نگرانی کر سکے اور سر اٹھاتے ازبکوں کا سر کچل سکے۔

اسی دوران اطلاع آئی کہ شاہ طہماسپ صفوی نے جو اپنے باپ شاہ اسماعیل کے بعد تخت نشین ہوا تھا، ازبکوں کو زبردست نقصان کے ساتھ شکست دے دی ہے۔ شاہ طہماسپ نے نا صرف ازبکوں کا سر کچل دیا تھا بلکہ اس نے کابل، بدخشاں اور ہندوستان کے والی بابر سے اچھے تعلقات رکھنے کی آرزو کا اظہار بھی کیا تھا۔ بابر کے ہونٹوں پر اطمینان بھری مسکراہٹ بکھر گئی تھی۔ اسی دوران شاہ ایران کی طرف سے دو سفیر بیش قیمت تحائف کے ساتھ بابر کے دربار میں حاضر ہوئے تھے۔ شاہ طہماسپ نے دو دوشیزائیں بھی بطور تحفہ بھجوائی تھیں۔

بابر نے اپنی پوری زندگی پاکیزگی سے گزاری تھی۔ گو کہ اس کے حرم میں کنیزیں موجود تھیں، مگر ان ایرانی دوشیزاؤں دیبا اور فرخندہ نے اس پر کچھ ایسا جادو کیا تھا کہ وہ اس عمر میں جبکہ وہ دنیا تیاگ کر جنگل میں جا بسرام کرنے کی باتیں کرتا تھا، ان لڑکیوں پر یوں فریفتہ ہوا کہ دن رات انہی کی صحبت میں گزارنا پسند کرنے لگا۔

قاسم بیگ، بابر کی اس حالت سے سخت پریشان تھا۔ اس نے کابل، شاہ بیگم کو پیغام بھیجا۔ ملکہ عالیہ آپ سے گزارش ہے کہ فوری طور پر آگرہ تشریف لے آئیں، عمر رسیدگی اور تنہائی بادشاہ سلامت کی ذہنی توانائی کو سنگین حد تک متاثر کر رہی ہے۔’’

پیغام ملتے ہی شاہ بیگم پریشان ہو گئی تھی۔

‘‘ہمایوں!’’ اس نے ولی عہد شہزادے کو مخاطب کیا۔ ‘‘میرا خیال ہے اس وقت مجھے تمہارے بابا کے پاس ہونا چاہئے، وہ بڑھاپے کی دہلیز پر پہنچ چکے ہیں، خود کو بہت اکیلا محسوس کر رہے ہیں، میرا خیال ہے کہ تم کو بھی اس وقت ان کے پاس ہونا چاہئے۔’’

‘‘والدہ محترمہ۔’’ ہمایوں نے سر کو قدرے خم کر کے ماں کو مخاطب کیا۔ ‘‘آپ درست فرما رہی ہیں۔ وہ آج کل بے حد ذہنی خلفشار کا شکار ہیں، اسی لئے انہوں نے ہندال کو آگرہ طلب کیا ہے۔ وہ چاہتے ہیں اس وقت ہندال ان کے پاس رہے۔’’

‘‘ہمایوں۔’’ شاہ بیگم نے دھیمے مگر قدرے روکھے لہجے میں کہا۔ ‘‘تم بادشاہ بابر کے سب سے بڑے بیٹے ہو، وہ تمہیں ولی عہد نامزد کر چکے ہیں، اس وقت صرف اور صرف تمہیں ان کی خدمت میں ہونا چاہئے، نا کہ کسی اور کو......’’

‘‘والدہ محترمہ۔’’ ہمایوں نے فطری لاپروائی کا سہارا لیتے ہوئے جواب دیا۔ ‘‘ہندال کوئی اور نہیں، نہ ہی وہ کوئی غیر ہے، میری طرح وہ بھی بابا کا بیٹا ہے اور میرا بھائی ہے۔ میں ان کے پاس رہوں، ہندال، کامران یا عسکری بات ایک ہی ہے نا......’’

‘‘کاش میں تمہیں یہ بات سمجھا سکتی۔’’ شاہ بیگم نے افسردگی سے سر ہلایا۔ ‘‘بادشاہ بابر کے اور بھی بیٹے ہیں مگر میرے صرف تم ایک ہی بیٹے ہو اور تم ولی عہد ہو۔ اس لئے اس وقت تم کو ہی وہاں ہونا چاہئے۔’’

ہمایوں اس وقت اپنے وطن سے دور نہیں جانا چاہتا تھا۔ اس لئے کسی نہ کسی طرح ماں کو ٹالنے میں کامیاب ہو گیا۔

شاہ بیگم نے رخت سفر باندھا اور ہندوستان کی طرف روانہ ہو گئی۔ انہی دنوں جب قاسم بیگ بادشاہ کے بدلتے رویوں سے خاصا متوحش تھا، ایک شام اسے سانپ نے کاٹ لیا۔ ہندوستان کی سرزمین سانپوں اور زہریلے بچھوؤں سے پٹی پڑی تھی اور اس طرح کے حادثات روز کا معمول تھے مگر مگر قاسم بیگ کو ڈسنے والا سانپ بے حد زہریلا تھا۔ دیکھتے ہی دیکھتے اس کا جسم نیلا پڑ گیا تھا اور منہ سے سفید جھاگ آنے لگا۔ خدام طبیب کو بلانے لپکے، ایک خادم بادشاہ کی خواب گاہ کی طرف دوڑا۔

بادشاہ اس وقت نوخیز حسینہ فرخندہ کی خلوت میں تھا۔ دروازے پر موجود دربانوں نے خادم کو وہیں روک لیا۔

‘‘خدارا! بادشاہ سلامت تک خبر پہنچایئے۔ ان کے یار عزیز موت و زندگی کی کشمکش میں مبتلا ہیں، بعد کو انہیں خبر ہوئی تو وہ خفا ہوں گے۔’’

‘‘اس وقت انہیں بے آرام کیا گیا تو وہ بے حد ناراض ہوں گے۔’’ دربان نے بے بس لہجے میں جواب دیا۔ ‘‘ویسے بھی سر شام ہی وہ بڑی مقدار میں افیون کھاتے ہیں اور تمام رات اس کے نشے میں دھت رہتے ہیں۔ اس وقت ان سے رابطہ کرنا عبث ہے۔’’

‘‘ٹھیک ہے جو اوپر والے کی مرضی۔’’ خادم نے مایوسی اور بے بسی سے کہا اور دوبارہ قاسم بیگ کے کمرے کی طرف چل دیا۔

طبیب آ چکے تھے۔ وہ اپنی کوششوں میں لگے تھے مگر کوئی کوشش کارگر نہ ہو سکی تھی، کوئی دوا اثر ثابت نہ ہوئی تھی اور کچھ ہی گھنٹوں میں قاسم بیگ ابدی نیند سو گیا تھا۔

صبح بادشاہ کو خبر ہوئی تو اس کا چہرہ فرط ملال سے زرد ہو گیا۔

‘‘مجھے بروقت خبر کیوں نہ دی گئی۔’’ اس نے غصے سے سوال کیا۔

‘‘کوشش کی تھی مگر کامیابی نہ ہو سکی۔’’ خبر لے جانے والے خادم نے سر جھکا کر افسردہ لہجے میں جواب دیا۔ ‘‘دروازے پر ایستادہ دربان نے بادشاہ سلامت کو ان کی خلوت میں بے آرام کرنے کی اجازت نہیں دی۔’’

قاسم بیگ کی موت بابر کے لئے کسی سانحے سے کم نہ تھی۔ وہ اس کے انتہائی مشکل دنوں کا ساتھی تھا۔ جب سب اس کا ساتھ چھوڑ گئے تھے، قاسم بیگ اس کے ساتھ رہا تھا...... اور اب ان حالات میں وہ یوں اچانک ہمیشہ ہمیشہ کے لئے اس کا ساتھ چھوڑ گیا تھا۔

قاسم بیگ کی تدفین شاہی خاندان کے فرد کی حیثیت سے کی گئی اور پورے ملک میں سوگ کا اعلان ہوا۔ کئی روز تک بادشاہ اپنی خواب گاہ سے باہر نہ آیا۔ اس شدید غم کو غلط کرنے کے لئے وہ حسیناؤں دیبا اور فرخندہ کے ساتھ وقت گزارتا رہا اور افیون کھاتا رہا۔

☆......☆......☆

اٹاوہ کے جاگیردار میر محمد مہدی خواجہ کی وسیع و عریض حویلی کے در و دیوار پر شام کے سانولے سائے بکھر رہے تھے۔ وہ بابر کے شاہی خاندان کا فرد تھا۔ وہ بابر کی حقیقی بہن خداوندزادہ بیگم کا شوہر تھا۔

اس وقت وہ اپنے چند قریبی مصاحبین کے ساتھ اپنے پائیں باغ میں ٹہل رہا تھا۔ اپنے آستانوں کو پرواز کرتے پرندوں کی چہچہاہٹ اور ہوا میں گھلی پھولوں کی مہک سے لطف اندوز ہو رہا تھا کہ ایک خادم نے آ کر خواجہ نظام الدین برلاس کی آمد کی اطلاع دی۔ جسے عرف عام میں خلیفہ کہا جاتا تھا۔ وہ بابر کا بہت ہی لائق قابل اعتبار اور زیرک وزیر تھا اور مشیر خاص بھی۔

‘‘اوہ!’’ مہدی خواجہ حیران ہوا۔ ‘‘مشیر خاص خلیفہ تشریف لائے ہیں اور اس وقت؟ خیر انہیں نشست گاہ میں عزت کے ساتھ بٹھایا جائے، میں ابھی حاضر ہوتا ہوں۔’’

شاندار اقامت گاہ کی پُر شکوہ نشست گاہ میں مشیر خلیفہ کو بٹھا دیا گیا تھا۔ کچھ ہی دیر میں مہدی خواجہ بھی کمرے میں آ موجود ہوا۔

‘‘خلیفہ! آپ کو یہاں اس وقت دیکھ کر مجھے حیرت بھری مسرت ہوئی ہے۔’’ مہدی خواجہ نے خلیفہ سے معانقہ کرتے ہوئے کہا۔

‘‘خواجہ! ایک بہت ہی ضروری مسئلہ درپیش ہے، اسی لئے میں اس وقت تمہارے پاس دوڑا چلا آیا ہوں۔’’ خلیفہ نے دھیمی آواز میں پُر سوچ آواز میں کہا۔

‘‘فرمایئے کیا بات ہے؟’’ مہدی خواجہ ہمہ تن گوش ہوتے ہوئے بولا۔

‘‘تم شاید نہیں جانتے، بادشاہ سلامت اس وقت شدید ذہنی ابتری اور خلفشار کا شکار ہیں۔ قاسم بیگ کی موت نے بھی ان کے ذہن پر بہت برا اثر ڈالا ہے۔’’ خلیفہ نے دھیمی اور پُر اثر آواز میں بات کا آغاز کیا۔

‘‘جی سب خبریں مجھ تک پہنچ رہی ہیں۔’’ مہدی خواجہ نے خلیفہ کے تھمتے ہی جلدی سے جواب دیا۔

‘‘وہ اس وقت اکیلے پن کا شکار ہیں، ایسے میں ان کے پاس کسی اپنے کا ہونا بے حد ضروری ہے۔’’ خلیفہ نے اپنی آواز مزید دھیمی کرتے ہوئے ڈرامائی انداز میں کہا۔ ‘‘کسی بھی وقت کچھ بھی ہو سکتا ہے۔ ایسے میں کسی کو تخت و تاج کو حاصل کرنے کے لئے وہاں ہونا چاہئے اور اس وقت ہندوستان میں آپ ہی ان کے قریبی عزیز ہیں اور شاہی خاندان کے فرد بھی۔’’

‘‘کیا مطلب ہے؟’’ مہدی خواجہ اچھل پڑا۔ ‘‘آپ مجھے تخت و تاج کا وارث تصور کر رہے ہیں۔’’

‘‘ہاں۔’’ خلیفہ نے بنا کسی پس و پیش کے صاف آواز میں جواب دیا۔ ‘‘بعض ایسے امور پیش آ چکے ہیں جن کے باعث میں ہمایوں یا کسی شہزادے کے بادشاہ بننے میں خوف محسوس کر رہا ہوں۔ خود بادشاہ سلامت بھی کچھ پس و پیش کا شکار ہیں۔’’

‘‘کیا واقعی؟’’ مہدی خواجہ کو خود اپنی آواز کہیں دور سے آتی محسوس ہوئی۔ ‘‘کیا ایسا ممکن ہے کہ بادشاہ سلامت اپنے چار شہزادوں کے ہوتے مجھے اپنے بہنوئی کو تخت و تاج سونپ دیں؟’’

‘‘ہاں، اسی لئے میں یہاں اس وقت موجود ہوں۔’’ خلیفہ نے پُر یقین لہجے میں کہا۔ ‘‘کسی کو کانوں کان خبر نہ ہو، تم فوراً اسی وقت میرے ساتھ آگرہ چلو۔’’

‘‘آج شب آپ یہیں قیام کیجئے۔ صبح دم ہم روانہ ہو جائیں گے۔’’

اگلے دن اس کے روانہ ہونے سے پہلے ہی یہ خبر پورے اٹاوہ میں گردش کر رہی تھی۔

شاہ بیگم کی سواری جب آگرہ جانے کے لئے اٹاوہ سے گزری تو یہ خبر اس کے کانوں تک بھی پہنچی۔

‘‘مجھے اپنے کانوں پر یقین نہیں آ رہا۔’’ وہ پریشان سے لہجے میں اپنے وفادار خادم عثمان سے بولی۔ ‘‘عثمان! تم ابھی اسی وقت تیز رفتار قاصد کے ذریعے ہمایوں کو یہ پیغام بھجواؤ کہ آندھی طوفان کی طرح سفر کرتا وہ میرے آگرہ پہنچنے تک آ جائے، ورنہ زندگی بھر آگرہ دیکھنے کو ترس جائے گا۔’’

یہ پیغام ہمایوں کو روانہ کر کے شاہ بیگم آگرہ کے لئے روانہ ہو گئی۔

ہمایوں درباری سیاست سے بہت دور بدخشاں میں تھا۔ اسے جب یہ خبر ملی تو وہ سخت تشویش کا شکار ہو گیا۔ یہ خبر اس کی ماں شاہ بیگم نے بھجوائی تھی۔ یہ خبر ہمایوں کو متوحش کرنے کے لئے کافی تھی۔ وہ تمام معاملات پس پشت ڈال کر فوری طور پر کابل روانہ ہو گیا۔

کابل میں اس کی ملاقات کامران اور ہندال سے ہوئی۔ ہندال ابھی چند ماہ پہلے ہی اپنے والد سے مل کر لوٹا تھا لیکن اس وقت اسے پھر آگرہ حاضر ہونے کا حکم ملا تھا اور وہ آگرہ جانے کی تیاری میں مصروف تھا کہ ہمایوں آ پہنچا۔

‘‘مجھے والدہ کے قاصد کے ذریعے ایک سازش کی خبر ملی ہے۔’’ ہمایوں نے بھائیوں کے سامنے تمام معاملہ رکھتے ہوئے کہا۔ ‘‘اب تم لوگ بتاؤ کیا کرنا چاہئے۔’’

تینوں بھائی سر جوڑ کر بیٹھ گئے اور آپس میں مشورہ کیا اور بظاہر اس بات پر متفق ہو گئے کہ معاملات سنگین شکل اختیار کر گئے ہیں۔ اب مستقبل میں تینوں کے مقام و منصب کا انحصار اس بات پر تھا کہ شاہ بیگم اور ہمایوں، خلیفہ کو اس کے منصوبوں کی بساط پر کس طرح مات دیتے ہیں۔ آخر کار تینوں نے یہ طے کیا کہ ہمایوں نہایت تیز رفتاری سے آگرہ جائے اور ہندال بدخشاں میں اس کی جگہ لے۔ اس عرصے میں کامران کابل میں اپنی گرفت مضبوط رکھے۔ اس منصوبے پر فوری طور پر عمل شروع ہو گیا۔

ہمایوں کی ماں شاہ بیگم اطمینان و سست رفتار سفر کے بعد جوں ہی آگرہ پہنچی، اس کا بیٹا سرعت سے سفر کرتا اس کے چند گھنٹوں بعد ہی آ پہنچا۔

یہ چند گھنٹے شاہ بیگم نے بادشاہ کے دل میں شہزادے کے لئے نرم گوشے بنانے میں صرف کئے۔ بابر ہمایوں کے ترک فرائض سے بہت خفا تھا۔ مگر اس کی زیرک ماں نے بابر کو شفقت و محبت سے بات چیت کرنے کے لئے آمادہ کر لیا تھا ورنہ بہت ممکن تھا کہ بابر ہمایوں کی شکل دیکھتے ہی اسے نکال باہر کرتا۔

ہمایوں بھی بے حد [illegible] سے بابر [illegible] اور [illegible] کر [illegible] بیٹے [illegible] شفقت [illegible] اٹھی اور اس نے بیٹے کو سینے سے لگا لیا۔

یہ صورت حال خلیفہ کے لئے بے حد پریشان کن تھی۔

ادھر شاہ بیگم نے بادشاہ کو مشورہ دیا کہ بدخشاں کو اپنے قبضے میں رکھنا بے حد ضروری ہے کیونکہ جوں ہی بابر کی صحت اور طاقت بحال ہو گی تو وہ اس سلطنت بدخشاں کو وسط ایشیا میں اپنے مورثِ اعلیٰ تیمور کے مقبوضات دوبارہ حاصل کرنے کی ایک اور کوشش کے لئے بطور مرکز استعمال کر سکتا تھا۔

‘‘تو اس کے لئے ضروری ہے کہ اس وقت وہاں نوجوان شہزادے ہندال کی بجائے کوئی سن رسیدہ زیرک امیر و مشیر تعینات کیا جائے۔’’

‘‘آپ ٹھیک کہہ رہی ہیں۔’’ بابر، بیگم کی بات سے متفق تھا۔ ‘‘تو آپ کے خیال میں کون سا وزیر و مشیر اس لائق ہے جسے بدخشاں بھیجا جا سکے۔’’

‘‘اگر آپ پسند کریں تو خلیفہ اس کام کے لئے بہترین ہیں۔’’ شاہ بیگم کی بات بادشاہ کے دل کو لگی اور اس نے فوری طور پر خلیفہ کو حکم دیا کہ وہ بدخشاں جا کر وہاں کے انتظامات سنبھال لے۔

بوڑھا اور کائیاں وزیر فوراً سمجھ گیا کہ ملکہ کو اس کی سازش کا اندازہ ہو گیا ہے اور بدخشاں میں اس کی تعیناتی کے پیچھے یقیناً ملکہ کا ہاتھ ہے۔ چنانچہ اس نے اس وقت دربار چھوڑ کے جانے سے انکار کر دیا۔ کیونکہ وہ جانتا تھا ایسے میں اس کی غیر موجودگی ہمایوں کی کامیابی کے مترادف ہو گی۔

اس نے اپنی کبر سنی کو بہانہ بنا کر روانگی میں تاخیر کی تو بابر نے ہمایوں کو واپس جانے کا حکم دے دیا۔ مگر ہمایوں نے واپس جانے میں ایسی کوئی خاص دلچسپی اور تیزی نہیں دکھائی، جس سے بابر بے حد مایوس ہوا تھا۔

اس شام جب بابر مے نوشی میں مشغول تھا تو اس نے ہمایوں کو طلب کیا اور جب وہ باپ کی خدمت میں حاضر ہوا تو دیکھا نشے سے مغلوب ہو کر بابر تکیے پر سر رکھ کر محو خواب ہو چکا تھا۔ شہزادہ دست بستہ بے حس و حرکت وہیں کھڑا رہا۔ جب نصف شب کو بادشاہ نیند سے بیدار ہوا تو اسے کھڑا پایا، پوچھا۔ ‘‘تم کب آئے؟’’

ہمایوں نے جواب دیا۔ ‘‘جب مجھے آپ کا حکم ملا، میں فوری طور پر آپ کی خدمت میں حاضر ہو گیا تھا۔’’

تب بابر کو یاد آیا کہ اس نے ہمایوں کو طلب کیا تھا۔ اس کے مایوس چہرے پر مسرت کے رنگ بکھر گئے۔ بیٹے کی فرمانبرداری اور خدمت گزاری کے جذبے نے اس کا دل جیت لیا۔ اس نے ہمایوں کو گلے سے لگاتے ہوئے کہا۔ ‘‘اگر خدا تمہیں تخت و تاج عطا کرے تو اپنے بھائیوں کے ساتھ رحم اور محبت کا سلوک کرنا، انہیں کبھی ہرگز موت کے گھاٹ نہ اتارنا بلکہ بڑے بھائی کی طرح شفقت سے ان کی نگہداشت کرنا۔’’

‘‘میں وعدہ کرتا ہوں، ایسا ہی کروں گا۔’’ ہمایوں نے سر جھکا کر وعدہ کر لیا۔ بابر نے ایک بار پھر ہمایوں کے ولی عہد ہونے کا اعلان کر دیا۔ اب کسی کو کوئی شبہ نہیں رہا کہ ہمایوں کے علاوہ تختِ ہندوستان کا کوئی وارث ہو سکتا ہے۔

اب ہمایوں کو بھی ذہنی سکون حاصل ہو گیا تھا۔ وہ اس طرف سے مطمئن ہو کر اپنی جاگیر کے معاملات درست کرنے کے لئے ایک بڑی فوج لے کر سنبھل چلا گیا۔

یہاں وہ نہایت توجہ و انہماک سے اپنی جاگیر کے معاملات سنوارنے میں مصروف رہا۔ اسی طرح چھ ماہ بیت گئے۔

موسم گرما کا آغاز ہو رہا تھا۔ سورج کی تپش اور ہواؤں کی حدت میں دن بہ دن اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ اس دوپہر وہ حویلی سے باہر نکلا تو اسے گرم ہوا کے تھپیڑوں نے چاروں اور سے گھیر لیا۔

‘‘اُف! کس قدر گرمی ہے۔’’ وہ وحشت زدہ سا بولا۔

‘‘سرکار حویلی واپس چلیے، لُو چل رہی ہے، یہ بے حد خطرناک ہوتی ہے۔’’ خادم بصد اصرار اسے واپس حویلی لے آیا تھا۔

مگر اس دوران لُو اپنا کام کر چکی تھی۔ اسے لُو لگ چکی تھی۔ اطباء کو طلب کیا گیا۔ لُو کا علاج تو ہو گیا مگر دوسرے امراض نے شہزادے کو گھیر لیا اور دیکھتے ہی دیکھتے وہ شدید بیمار ہو گیا۔

بابر کو ہمایوں کی بیماری کی اطلاع ملی تو وہ بے حد گھبرا گیا۔ اس نے فوری طور پر حکم دیا۔ ‘‘شہزادے کو دہلی لایا جائے اور پھر وہاں سے پانی کے راستے آگرہ پہنچا دیا جائے۔’’

لیکن جب ہمایوں دہلی پہنچا تو اس کی حالت اتنی نازک اور خستہ تھی کہ اس کے عزیز دوست اور قریبی مصاحب مولانا فرغری نے اس کی ماں شاہ بیگم کو جو اس وقت بابر کے ساتھ دھول پور میں تھی، پیغام بھیجا۔

‘‘ہمایوں مرزا سخت بیمار ہیں، بے حد لاغر اور کمزور ہو چکے ہیں، حالت بہت غیر ہے، پانی کے سفر سے آگرہ لانا دشوار ہے، ملکہ عالیہ کو فوراً دہلی آ جانا چاہیے۔’’

پیغام ملتے ہی شاہ بیگم بے تاب ہو گئی۔ وہ فوراً ہی اپنے بیٹے سے ملنے کے لئے روانہ ہو گئی۔ متھرا میں اس کی بیٹے سے ملاقات ہوئی۔ وہ بے حد ناتواں ہو چکا تھا۔ چہرہ زرد آنکھوں کے گرد سیاہ حلقے اور جسم سوکھ کر کانٹا ہو چکا تھا۔ شاہ بیگم کا دل دہل کر رہ گیا۔ آگرہ پہنچتے پہنچتے وہ بہکی بہکی باتیں کرنے لگا۔

محل میں پہنچتے ہی اسے ایک پُر سکون خواب گاہ میں پہنچا دیا گیا۔ شاہی اطباء کو طلب کر لیا گیا تھا۔ انہوں نے سرسام تشخیص کیا۔ شام کو اس کی بہنیں گلبدن اور گلرنگ اس سے ملنے آئیں تو اس کی حالت دیکھ کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگیں۔

‘‘روتی کیوں ہو، اللہ سے دعا کرو۔ ان شاءاللہ وہ شفا دے گا۔’’ شاہ بیگم نے آنچل سے اشک پونچھتے ہوئے اس کی بہنوں سے کہا اور چہرہ چھپا کر خود بھی زار و قطار رونے لگی۔

بابر نے جب اپنے چہیتے بیٹے کی یہ کیفیت دیکھی تو سخت اضطراب میں مبتلا ہو گیا۔ زیادہ عرصہ نہیں ہوا تھا جب اس نے اپنا ایک چھوٹا بیٹا کھو دیا تھا۔ ہمایوں کی حالت دیکھ کر اندیشوں نے اسے گھیر لیا۔ بابر کو ہراساں و پریشان دیکھ کر شاہ بیگم نے اسے سمجھانے کی کوشش کی تھی۔

‘‘میرے بیٹے کے لئے، حضور اس قدر غم نہ لیں۔ آپ بادشاہ ہیں، آپ کو یوں غم کرنا زیبا نہیں دیتا۔ آپ کے اور بھی بیٹے ہیں، غم کھانا میرا مقدر ہے...... کیونکہ میرا صرف یہی ایک بیٹا ہے۔’’

بابر نے تڑپ کر ملکہ کی طرف دیکھا اور ملول و رنجور لہجے میں بولا۔ ‘‘ملکہ اگرچہ میرے اور بھی بیٹے ہیں لیکن میں کسی سے اتنی محبت نہیں کرتا جتنی تمہارے ہمایوں سے۔ میری آرزو ہے کہ میرے اس لاڈلے بیٹے کو شفا ملے اور یہ لمبی عمر پائے، یہ میرا ولی عہد ہے۔ میں تخت و تاج اسے سونپنا چاہتا ہوں، کیونکہ قدر و امتیاز میں کوئی اس کا ثانی نہیں۔’’

ملکہ، بادشاہ کے قدموں میں بیٹھ کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

‘‘اعلیٰ حضرت، جہاں پناہ! اس بدنصیب ماں کو اجڑنے سے بچا لیجئے، میرے لعل کو مرنے سے بچا لیجئے، اسے کچھ ہو گیا تو میں بھی جی نہ سکوں گی۔’’

‘‘جی تو میں بھی نہ سکوں گا بیگم۔’’ بابر نے کرب بھرے لہجے میں کہا اور بیمار بیٹے کی خوابگاہ کی طرف چل دیا۔

ہمایوں بے جان سا بستر پر پڑا تھا۔

بابر کئی لمحوں تک ٹکٹکی باندھے اسے زرد ہڈیوں سے بھرے چہرے کی طرف تکتا رہا۔

‘‘سب کچھ اس اوپر والے کے ہاتھ میں ہے۔ کاش میں اپنے اس چہیتے بیٹے کو اپنی آنکھوں کے سامنے یوں گھٹ گھٹ کر مرتے نہ دیکھتا۔ کاش میں کچھ کر سکتا...... کاش کوئی، کچھ کر سکتا۔’’

ایک بار پھر پورے ہندوستان میں اعلان کروایا گیا۔ شہر شہر، گاؤں گاؤں سے طبیب اور وید آئے مگر مرض بڑھتا رہا جوں جوں دوا کی، کے مصداق افاقہ ہونے کی بجائے بیماری میں اضافہ ہوتا گیا۔

اِدھر بابر اور اس کے اہل خانہ اس مصیبت سے دوچار تھے، اُدھر میر خلیفہ مہدی خواجہ کے ساتھ مل کر حکومت پر قابض ہونے کے خواب بُن رہا تھا۔ مہدی خواجہ، میر خلیفہ کی حیثیت اور اہمیت سے واقف تھا۔ وہ جانتا تھا کہ دانا وزیر بادشاہ کو جو مشورہ دے گا، وہ ماننے پر مجبور ہو گا۔ اس لئے اب اس کے انداز و اطوار میں شاہوں والی خو بو آ گئی تھی۔ تکبر سے چلتا اور حقارت سے سب کو ذلیل کر دیتا۔ اس کے یہ رنگ ڈھنگ لوگ دیکھ رہے تھے اور خاموش تھے۔

جوں جوں حکومت کی منتقلی میں دیر ہو رہی تھی، وہ بوڑھے وزیر سے بھی خفا ہوتا جا رہا تھا۔

‘‘محترم وزیر! آخر آپ کوئی قدم اٹھاتے کیوں نہیں؟’’ وہ اکثر میر خلیفہ سے دریافت کرتا۔

‘‘کیسی بات کر رہے ہو مہدی خواجہ، شہزادہ زندگی اور موت کی کشمکش میں مبتلا ہے۔ بادشاہ بیٹے کی بیماری میں ادھ موا ہوا جاتا ہے۔ ایسے میں کوئی سازش، کوئی بغاوت کیونکر کامیاب ہو سکتی ہے۔ تمام رعیت کی ہمدردی اور وفاداری اس وقت شاہ اور شہزادے کے ساتھ ہے۔’’

مہدی خواجہ چپ ہو گیا۔ مگر وہ میر خلیفہ سے ناراض ہو گیا تھا۔ اس شام میر خلیفہ مہدی خواجہ سے ملنے گیا۔ وہ اپنے شہ نشین میں موجود تھا۔ اس وقت میر خلیفہ کے ساتھ طبقاتِ اکبری کے مصنف کے والد مقیم ہراوی بھی موجود تھے۔ ابھی میر خلیفہ کو آئے تھوڑی ہی دیر ہوئی تھی کہ ایک خادم نے آ کر پیغام دیا کہ شہنشاہ بابر اسے یاد کر رہے ہیں۔ وہ فوراً ہی اٹھ کھڑا ہوا۔

‘‘اجی حضرت کہاں جاتے ہیں؟’’ مہدی خواجہ نے کہا۔ ‘‘وہ تو ماضی کا قصہ ہے، حال و مستقبل کا بادشاہ آپ کے سامنے موجود ہے، اسے چھوڑ کر جانا بے ادبی ہے۔’’

میر خلیفہ نے زبان سے کچھ نہیں کہا مگر ایسی حقارت بھری نظروں سے مہدی خواجہ کی طرف دیکھا کہ اس کے تن بدن میں آگ لگ گئی۔ اس کے جاتے ہی سلگتے لہجے میں بولا۔

‘‘اے بڈھے! ان شاءاللہ میں تیری کھال کھنچوا کر رہوں گا۔’’

جب وہ مڑا تو اس کی نظر مقیم ہراوی پر پڑی، تو غصے سے بولا۔ ‘‘او بدبخت تاجک تو یہاں کھڑا ہو کر کیا سن گن لے رہا ہے۔ میں نے اکثر سرخ زبان اور سبز سر کو ہوا میں اڑا دیا ہے۔’’

مقیم ہراوی اسی وقت وہاں سے رخصت ہو گیا اور فوری طور پر میر خلیفہ کے پاس پہنچا اور کہا۔ ‘‘محمد ہمایوں مرزا اور اس کے بھائیوں جیسے ذہین شہزادوں کی موجودگی میں، تم نے وفاداری کی طرف سے آنکھیں بند کر لی ہیں اور بادشاہت دوسرے خاندان میں منتقل کرنے کی خواہش رکھتے ہو، اور جانتے ہو وہ بدبخت تمہارے بارے میں کیا کہتا اور کیا سوچتا ہے۔’’

اور جو کچھ سنا تھا بتا دیا۔ میر خلیفہ کا چہرہ غصے سے سرخ ہو گیا اور اس نے اسی وقت شہنشاہ کے حوالے سے ایک افسر کو حکم دے کر مہدی خواجہ کے پاس بھیجا کہ وہ خانہ نشین رہے۔

اس طرح ہمایوں کو تخت سے محروم رکھنے کی کوشش اختتام کو پہنچی۔

مگر ہمایوں زندگی و موت کی کشمکش میں مبتلا تھا۔

دوا سے مایوس ہو کر دعا کی طرف توجہ کی گئی۔ دانش مندوں سے مشورہ کرنے کے بعد یہ طے کیا گیا کہ بیمار کی ملکیت سے سب سے قیمتی چیز کی قربانی دے کر اس کی جان کا صدقہ ادا کیا جائے۔

کچھ نے تجویز پیش کی۔ ‘‘کوہ نور کو خیرات کر دیا جائے۔’’

کچھ نے اشرفیاں، کچھ نے زمین، جائداد خیرات کرنے کا مشورہ دیا۔

بابر خاموشی سے اٹھ کر دریچے میں جا کھڑا ہوا۔

‘‘آپ کیا سوچ رہے ہیں؟’’ شاہ بیگم نے دریافت کیا۔

‘‘میں ہمایوں کی ملکیت میں موجود سب سے قیمتی چیز کی قربانی کے بارے میں سوچ رہا ہوں۔’’ بابر نے پُر سوچ لہجے میں جواب دیا۔

‘‘وہ کون سی چیز ہے؟’’ شاہ بیگم نے پوچھا۔

‘‘میں جانتا ہوں، وہ کیا ہے۔’’ بابر نے پُر یقین لہجے میں جواب دیا۔ ‘‘اور میں نے اسی چیز کا صدقہ دینے کا فیصلہ کر لیا ہے۔’’

‘‘کچھ مجھے بھی تو بتایئے۔’’ شاہ بیگم نے اصرار کیا۔

دراصل بابر نے خود کو ہمایوں کی سب سے قیمتی ملکیت تصور کر کے اپنی زندگی کی قربانی دینے کا فیصلہ کر لیا تھا۔

☆......☆......☆

آسمان سیاہ بادلوں سے ڈھکا ہوا تھا۔ ہواؤں کے تیز جھکڑوں میں آہیں اور سسکیاں بسی تھیں۔ فضا میں ایسی اداسی اور کرب کی کیفیت تھی کہ ہر دل پریشان اور ہر آنکھ اشکبار تھی۔

شہزادے ہمایوں کے بچنے کی ہر امید دم توڑ چکی تھی۔ ایسے میں بابر نے اپنی بوڑھی زندگی کا نذرانہ پیش کر کے اپنے جواں سال بیٹے کی زندگی بچانے کا فیصلہ کر لیا تھا۔

وہ کچھ علماء کے ساتھ ہمایوں کی خوابگاہ میں داخل ہوا۔ اس نے ہمایوں کے بستر کا تین مرتبہ طواف کیا اور پھر پکار کر کہا۔ ‘‘میں نے ہمایوں کی بیماری اپنے اوپر لے لی ہے۔ اے زندگی دینے والے تو میری زندگی میرے بیٹے کو دے دے اور اس کی موت کا رخ میری طرف موڑ دے۔’’

روایت کے مطابق اسی وقت سے ہمایوں کی حالت میں بہتری کے آثار دکھائی دینے لگے تھے۔ بابر کو یقین تھا کہ اس نے اپنی جان کے بدلے اپنے بیٹے کو موت سے چھڑا لیا ہے۔

ہمایوں رفتہ رفتہ اچھا ہوتا جا رہا تھا اور بابر جو خود کافی عرصے سے بیمار چلا آ رہا تھا، یہ سمجھنے لگا کہ اب اس کی زندگی کا حق ضبط ہو چکا ہے۔

اس واقعے کے راویوں میں سے کچھ ایسا ظاہر کرتے ہیں، گویا بابر فوراً ہی مر گیا۔ ایسا نہیں ہوا، ہمایوں صحت یاب ہونے کے بعد آگرہ چھوڑ کر اپنی جاگیر پر واپس چلا گیا تھا۔ اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ اس نے اپنے والد کی صحت کی طرف سے کوئی تشویش محسوس نہیں کی تھی۔ اس طرح آگرہ میں ٹھہرنے کی کوئی وجہ نہ پا کر وہ اپنی جاگیر پر چلا گیا۔

شہنشاہ بابر دو تین مہینے بیمار رہا لیکن اس کی فوری موت کا کوئی خطرہ نظر نہ آتا تھا۔

لیکن پھر یک لخت ہی اس کی حالت بگڑ گئی اور ہمایوں کو عجلت میں آگرہ طلب کیا گیا۔ ان چند مہینوں میں بابر میں جو تبدیلی ہوئی، اس کو دیکھ کر وہ ششدر رہ گیا۔

اس نے اطباء سے کہا۔ ‘‘میں انہیں اچھا بھلا چھوڑ کر گیا تھا، یہ اچانک کیا ہو گیا؟’’

‘‘بس بیٹا کیا کہیں۔’’ شاہ بیگم نے آبدیدہ ہو کر جواب دیا۔ اس کی بہنیں باپ کے سرہانے کھڑی آنسو بہا رہی تھیں۔ کمرے سے باہر دالان میں کنیزیں دامن پھیلائے دعا مانگ رہی تھیں۔ پورے محل میں اداسی و ملال کی کیفیت طاری تھی۔

بابر کی حالت بگڑی تو بگڑتی ہی چلی گئی۔

آنتوں کی سوزش میں اضافہ ہو گیا۔ طبیبوں کا خیال تھا کہ سلطان ابراہیم لودھی کی ماں بوا بیگم نے گوشت اور چپاتی میں شامل کر کے پہلے جس زہر سے بابر کی جان لینے کی کوشش کی تھی، اب کبر سنی اور ناتوانی کے باعث اس زہر کے اثرات ظاہر ہو رہے ہیں۔

بابر اپنے چھوٹے بیٹے ہندال سے بھی خصوصی لگاؤ رکھتا تھا۔ چنانچہ فوری طور پر ہندال کو بلوانے کے لئے قاصد روانہ کئے گئے۔ بابر کی حالت بگڑتی جا رہی تھی مگر اس کی نگاہیں دروازے پر لگی تھیں۔ وہ ہندال کا منتظر تھا۔

ہمایوں اس کے پاس موجود تھا۔ ہمایوں کے پہنچنے کے دوسرے دن بابر نے محسوس کیا کہ موت نزدیک آ گئی ہے۔ موت کے قدموں کی آہٹیں اس جری سپاہی، زیرک سپہ سالار، منصف حکمران اور ایک شفیق باپ کی سماعت سے ٹکرانے لگیں تو اس نے امراء و وزراء کو طلب کیا اور ان الفاظ میں ان سے خطاب کیا۔

‘‘برسوں سے میرے دل میں تھا کہ اپنا تخت ہمایوں کے سپرد کر کے خود زرافشاں باغ میں گوشہ نشین ہو جاؤں۔ خدا کی عنایات سے بہ حالت صحت بجز اس خواہش کی تکمیل کے اور سب کچھ پایا۔

اب جبکہ بستر علالت پر دراز ہوں۔ میں تاکید کرتا ہوں کہ ہمایوں کو میرا جانشین تسلیم کرو اور اس کے وفادار رہو، یک دلی و یکسوئی سے اس کا ساتھ دو۔ مجھے خدا سے اُمید ہے کہ ہمایوں بھی لوگوں سے اچھا سلوک کرے گا۔’’

اس کے بعد وہ ہمایوں کی طرف مڑا، اسے اشارے سے قریب بلایا۔ ہمایوں سرعت سے باپ کے قریب آیا تو اس نے انتہائی رازدارانہ انداز میں اسے مخاطب کر کے کہا۔

‘‘ہمایوں میں تمہیں اور تمہارے بھائیوں اور اپنے تمام اہل خاندان اور اپنی رعایا اور تمہاری رعایا کو خدا کے سپرد کرتا ہوں اور سب کو تمہاری امانت میں دیتا ہوں۔ میری وصیت کا لب لباب یہ ہے کہ اپنے بھائیوں کے خلاف کوئی کام نہ کرنا، خواہ وہ اس کے مستحق کیوں نہ ہوں۔’’

تین دن بعد بروز دوشنبہ 26 دسمبر 1530ء کو بابر جہانِ فانی سے کوچ کر گیا۔

اس کی موت کو راز میں رکھا گیا کیونکہ یہ اندیشہ تھا کہ تخت خالی رہنے کے درمیانی عرصے میں کہیں فسادات نہ پھوٹ پڑیں لیکن پھر ایک ہندوستانی امیر آرائش خان کے کہنے پر، موت کو پوشیدہ رکھنا مناسب نہیں ہے، بہتر یہ ہے کہ کسی کو سرخ لباس پہنا کر ہاتھی پر بٹھایا جائے اور یہ اعلان کروا دیا جائے کہ شہنشاہ بابر درویش ہو گیا ہے اور اس نے شہنشاہ ہمایوں کو تخت دے دیا ہے۔

بابر آٹھ اوصاف کا مالک تھا۔ اعلیٰ قوت فیصلہ، شریفانہ اولوالعزمی، فن فتح یابی، فن حکمرانی، اپنی رعایا کو خوشحالی عطا کرنے کا سلیقہ، خلق خدا پر نرمی سے حکومت کرنے کی صلاحیت، سپاہیوں کا دل جیت لینے کی اہلیت اور انصاف سے محبت۔

اس طرح ایک خوبصورت، خوش گفتار، خوش اخلاق، پُر اخلاص، زندہ دل، بہادر، سخی، عاقل، صاف گو، سخت جان، نرم دل، انصاف پسند بادشاہ ابدی نیند سو گیا۔

خود اس کی خواہش کے مطابق اسے کابل کی پہاڑی کے پہلو میں دفن کیا گیا۔ جس کے نیچے وہ مرغزار اور چشمہ تھا جن سے اس کو بڑی والہانہ محبت تھی۔ اس نے جو کام انجام دیا وہ طویل مدت تک قائم رہا۔ اس نے باغات لگوائے، تالاب اور کنویں کھدوائے، محلات اور مسجدیں تعمیر کروائیں۔ اس نے ‘‘تزک بابری’’ تحریر کی، جو بابر کا شاہکار ہے۔

بابر کی وفات کے بعد اس کی خواہش اور نصیحت کے مطابق اس کا سب سے بڑا بیٹا نصیر الدین محمد ہمایوں تخت نشین ہوا اور یوں بابر کی شکست و فتوحات کی روداد اختتام کو پہنچی۔

(ختم شد)